اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ

مقالہ نگار

عرفان توحید

سیشن: ۲۰۱۴-۱۷ء

یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی (اردو) کی جزوی تکمیل اور حصول سند
کے لیے شعبۂ ادبیات اردو میں جمع کرایا گیا۔

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

۲۰۱۷ء

اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق وتجزیہ

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی (اُردو)

سیشن: ۱۷-۲۰۱۴ء

مقالہ نگار

عرفان توحید

رول نمبر: ۲۱۱۰

رجسٹریشن نمبر: 2014-GCUF-010346

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر پروین اختر کلّو

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم
شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تصدیق نامہ

ہم تصدیق کرتے ہیں کہ عرفان توحید نے مقالہ بعنوان ''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق وتجزیہ'' برائے حصول سند پی ایچ۔ڈی (اردو) ہماری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے اور ہماری معلومات کے مطابق سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ ہم اس کے نتائج اور انداز تحریر و تحقیق سے مطمئن ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مقالہ برائے جانچ اور زبانی امتحان، جناب ناظم امتحانات گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کو بھیجا جاسکتا ہے تاکہ وہ اس پر مزید ضروری کارروائی کرسکیں۔

سپروائزری کمیٹی

1۔ نگران مقالہ ________ نام و دستخط مع تاریخ

2۔ ممبر (۱) ________ نام و دستخط مع تاریخ

3۔ ممبر (۲) ________ نام و دستخط مع تاریخ

صدر شعبۂ اُردو

____

____

ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ

____

____

حلف نامہ

میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے یہ مقالہ بعنوان ''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ'' برائے حصولِ سندِ پی ایچ۔ڈی (اُردو) خود لکھا ہے میں نے سرقہ سے کام نہیں لیا اور تحقیق و اخلاق کے اصولوں کو مدنظر رکھا ہے نیز اس سے پہلے یہ مقالہ کسی یونیورسٹی میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا۔ میں اس مقالے کے تمام نتائج تحقیق اور جملہ عواقب کا ذمہ دار ہوں غلط بیانی کی صورت میں یونیورسٹی تادیبی کارروائی کر سکتی ہے۔

عرفان توحید

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتی ہوں کہ عرفان توحید نے مقالہ بعنوان ''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق وتجزیہ'' برائے حصول سند پی ایچ۔ڈی (اردو) میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے اور میری معلومات کے مطابق سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ میں اس کے نتائج اور انداز تحریر وتحقیق سے مطمئن ہوں۔ میرے خیال میں یہ مقالہ برائے جانچ اور زبانی امتحان، جناب ناظم امتحانات گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کو بھیجا جاسکتا ہے تاکہ وہ اس پر مزید ضروری کارروائی کر سکیں۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر پروین اختر کلّو

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

صدر شعبۂ اُردو

____

____

ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ

____

____

مقدمہ

۱۔حمد و ثنا

تمام تعریفوں کے لائق پروردگارِ عالم کی ذات ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک اور وحدہٗ لاشریک ہے۔اسی رب العالمین نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ہمیں ہادیٔ برحق، رحمتِ عالم، فخرِ موجودات اور باعثِ تخلیقِ عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمت میں پیدا فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی افضل ترین تخلیق ہیں، جن پر خود خداوند قدوس اور اس کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں۔ اس مقدس عمل میں ہم بھی شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور آقا کریم ﷺ کی بارگاہ میں درود وسلام کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی مقدس آلِ پاکؑ اور صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ شکر ہے اس رحمٰن ورحیم رب کا جس کی عطا کردہ توفیق سے یہ صفحات آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

۲۔موضوع کا تعارف و اہمیت

''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ'' ایک غیر معروف اور مشکل موضوع محسوس ہوتا ہے۔ بطور متعلم پی ایچ۔ڈی اردو جب موضوعات تحقیق کے انتخاب اور خاکہ نویسی کا مرحلہ آیا تو راقم نے اُردو آپ بیتیوں سے خاص رغبت کی وجہ سے ان پر کارِ تحقیق کا فیصلہ کیا۔ دراصل عالمی ادب پر نظر ڈالی جائے تو دو اہم مشہور اصناف ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان میں پہلی ''ناول'' اور دوسری ''آپ بیتی'' ہیں۔ حقیقی زندگی کے عوامل کو بغور دیکھا جائے تو آپ بیتی میں کسی مصنف کے بارے میں تفصیلی معلومات بآسانی حاصل کی جا سکتی ہیں کیونکہ اس میں مصنف کے حالات زندگی سے جڑے واقعات ومشاہدات بیان کیے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ بیتی نگار کے دور کی معاشی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور سماجی صورت حال بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔

موضوع کے انتخاب سے پہلے راقم نے استاذی ڈاکٹر سعید احمد سے مشاورت کی جنھوں نے آپ بیتیوں کے حوالے سے میرے شوق کو دیکھ کر میری رہنمائی فرمائی۔شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے چیئرمین ڈاکٹر آصف اعوان، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر ارشد اویسی، ڈاکٹر طارق ہاشمی اور ڈاکٹر پروین کلّو نے راقم کی اس تجویز کی تائید فرمائی اور دعاؤں سے نوازا۔ مذکورہ بالا موضوع پر تحقیق کے دوران چند مصائب سے بھی گزرنا پڑا لیکن فقط عنایت پروردگار اور اساتذہ کرام کی بروقت رہنمائی اور مشاورت سے یہ مشکلات آسانیوں میں تبدیل ہوتی گئیں اور اب دو برس کی تحقیقی کاوشوں کے بعد مقالہ بہ عنوان ''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ'' آپ کے سامنے حاضر ہے۔اس کے محاسن و معائب کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے لیکن راقم کو یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ متذکرہ بالا مقالہ میں تحقیقی کاوشوں کو بروئے کار لانے میں اور تحقیقی ژرف نگاہی میں مخلص اساتذہ کرام کا کسبِ فیض شامل ہے۔

(ب)

۳۔تحدید موضوع

تقسیم ہند کے بعد آپ بیتیوں میں پائی جانے والی سیاسی و سماجی تاریخ کے نشیب و فراز کو اپنی تمام تر تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی عیسوی کی اُردو آپ بیتیوں کا تحقیقی جائزہ عہد حاضر کے نامور ادیبوں، سیاسی و سماجی شخصیات کے حالاتِ زندگی کو واضح کرنے کے ساتھ سیاسی اور سماجی منظر نامے کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ یہ مقالہ اپنے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہمہ جہت مقاصد کا حامل ہے۔

۴۔پس منظری مطالعہ

راقم کے مقالہ کا عنوان ''اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ'' ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا لیکن اُردو آپ بیتیوں کے پس منظری مطالعہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو مقالات کے عنوانات کچھ یوں ہیں: ڈاکٹر اطہر قسیم کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''اردو ادب کی آپ بیتیاں، تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، قربان علی کا ایم۔فل اُردو کا مقالہ ''اکیسویں صدی کی آپ بیتیوں میں تاریخی و معاشرتی عناصر: تحقیق و تجزیہ''، ملیحہ وزیر حسین کا ایم فل کا مقالہ ''آپ بیتی کا فن اور جہانِ دانش''، احمد زمان کا مقالہ ''ملتان کے تین سیاست دانوں کی خودنوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (یوسف رضا گیلانی، صاحبزادہ فاروق علی، جاوید ہاشمی)''، انور علی کا مقالہ ''اُردو آپ بیتیوں میں سوانحی مواد کا تحقیقی و توضیحی جائزہ''، حمیرا ماجد کا مقالہ ''پاکستان میں اہم آپ بیتیوں کی تاریخ کا تنقیدی جائزہ''، رام دتا چرک کا مقالہ ''اُردو کی آپ بیتیوں اور شخصی یادداشتوں کا جائزہ''، سلمان علی کا مقالہ ''اُردو آپ بیتیوں میں خرقِ عادات واقعات''، شیریں جمال کا مقالہ ''اُردو کی خودنوشت سوانح عمریاں''، صبیحہ انور کا مقالہ ''اُردو میں خودنوشت سوانح حیات''، صدف فاطمہ کا مقالہ ''اُردو میں خودنوشت سوانح نگاری: ۱۹۴۷ء کے بعد''، فرزانہ خاتون کا مقالہ ''پاکستان میں خواتین کی آپ بیتیاں (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۲ء)''، لبنیٰ نصیر کا مقالہ ''اُردو کے تین فکشن نگاروں (سلیم اختر، رشید امجد، نثار عزیز بٹ) کی آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' مجیب احمد قاضی کا مقالہ ''اُردو میں آپ بیتی نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، مجید یوسف زئی کا مقالہ ''خودنوشت سوانح عمری''، محمد جمیل احمد قادری کا مقالہ ''اُردو کی خودنوشت سوانح عمریاں''، محمد صفدر آدا کا مقالہ ''اُردو آپ بیتی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، وہاج الدین علوی کا مقالہ ''اُردو میں خودنوشت نگاری'' اور محمد صفدر آدا کا مقالہ ''اُردو آپ بیتی کی تاریخ: آغاز سے ۱۹۴۷ء تک'' پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ راقم نہایت انکساری سے گزارش کرتا ہے کہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے شعبۂ اُردو کا یہ اسکالر آغاز سے لے کر ایک سو پینتیس سالہ اُردو آپ بیتیوں کی روایت اور ان آپ بیتیوں میں موجود سیاسی و سماجی صورت حال پر بھرپور انداز میں تحقیقی و تجزیاتی نقطہ نظر سے قلم اُٹھانے کی سعی کر رہا ہے اور یہ سب مخلص اساتذہ کرام کی شفقت اور محبت کا ثمر ہے۔

۵۔ابواب بندی

راقم کا مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں ''اردو آپ بیتی اور اس کی روایت'' پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ اس باب میں آپ بیتی کے مختلف عناصر سفر نامہ، مکتوبات، انٹرویو، تذکرہ، مثنوی، افسانہ، رپورتاژ کے بعد آپ بیتی کی مغربی ادب اور اردو ادب کی روایت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب دوم بعنوان ''اُردو کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ (۲۰۰۰ء تک)'' میں آغاز سے لے کر ۲۰۰۰ء تک کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب (کالا پانی)''، جگن ناتھ آزاد کی ''میرے گزشتہ روز و شب''، ذوالفقار علی بخاری کی ''سرگزشت''، کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد''، جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ''یادوں کی برات''، گوپال متل کی ''لاہور کا جو ذکر کیا''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی، ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، کلیم الدین احمد کی آپ بیتی ''اپنی تلاش میں''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، قدرت اللہ شہاب کی داستان حیات ''شہاب نامہ''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' اور اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

باب سوم میں اکیسویں صدی کی اہم اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ کے اس باب میں اکیسویں صدی کی جن چند اہم آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں میاں منظور احمد وٹو کی ''جرمِ سیاست''، ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب''، جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک''، مہدی علی صدیقی کی ''بلا کم و کاست''، ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ''، سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی ''چاہِ یوسف سے صدا''، حبیب جالب کی داستانِ حیات ''جالب بیتی''، جاوید ہاشمی کی آپ بیتی ''ہاں! میں باغی ہوں''، شکیل بدایونی کی ''میری زندگی'' اور ڈاکٹر رشید امجد کی ''عاشقی صبر طلب'' شامل ہیں۔

باب چہارم میں اردو ادب میں خواتین کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال پر تحقیق کی گئی ہے۔ خواتین کی اہم آپ بیتیوں میں امرتا پریتم کی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ''، قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی ''کارِ جہاں دراز ہے''، بیگم انیس قدوائی کی آپ بیتی ''آزادی کی چھاؤں میں''، حمیدہ اختر حسین کی ''ہم سفر''، عصمت چغتائی کی آپ بیتی ''کاغذی ہے پیرہن''، عذرا عباس کی آپ بیتی ''میرا بچپن''، کشور ناہید کی آپ بیتیاں ''بری عورت کی کتھا'' ادا جعفری کی داستانِ حیات ''جو رہی سو بے خبری رہی''، کشور ناہید کی آپ بیتی ''شناسائیاں رسوائیاں'' اور فرخندہ بخاری کی ''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' شامل ہیں۔

۶۔ منہج تحقیق

۱۔ زیر تحقیق مقالہ بیانیہ منہج تحقیق پر مبنی ہے۔

۲۔ مقالہ تحریر کرتے وقت گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے منظور کردہ اسلوبِ تحقیق کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۳۔ ہر باب کے آخر میں حوالہ جات دیئے گئے ہیں اور ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ اصل مصادر و مراجع سے رجوع کیا جائے تاہم ضرورت کے تحت مختلف کتب یعنی ثانوی ماٰخذ بھی بروئے کار لائے گئے ہیں۔

۷۔ بنیادی مصادر و مراجع

اس تحقیقی مقالہ میں اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۱۷ء تک زیر بحث لا کر اصل مصادر و مراجع سے رجوع کیا گیا ہے۔ تاہم بوقت ضرورت مختلف کتب، رسائل و جرائد، اخبارات، انٹرنیٹ اور مختلف دائرۂ معارفِ علمیہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۸۔ مشکلات و مصائب اور ان کا حل

مذکورہ تحقیقی مقالہ قلم بند کرتے ہوئے مواد کی فراہمی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ مختلف لائبریریوں میں کتب کی تلاش اور ورق گردانی صبر آزما کام تھا مگر ہمت، لگن، مسلسل محنت شاقہ اور رحمت خداوندی نے یہ مرحلہ آسان بنایا۔ اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں مختلف شخصیات سے بھی رہنمائی حاصل کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم، اساتذہ کی رہنمائی خاص طور پر ڈاکٹر پروین اختر کلو کی رہنمائی اور مشاورت سے یہ مرحلہ بھی طے پا گیا۔

۹۔ تحقیق کے نئے اُفق

اردو آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کی کھوج کے دوران چند موضوعات راقم کی نظر سے ایسے گزرے جن پر تحقیقی نقطہ نگاہ سے قلم اُٹھایا جا سکتا ہے، چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ اُردو آپ بیتیوں میں ادبی عناصر

۲۔ اُردو آپ بیتیوں میں اسلوب نگاری

۳۔ اُردو آپ بیتیوں میں موجود اغلاط کے تصحیح نامے مرتب کرنا

۴۔ اُردو آپ بیتیوں میں خاکہ نگاری کی روایت

۵۔ اُردو آپ بیتیوں میں شخصی خاکہ نگاری

۶۔ عالمی ادبی شخصیات کی آپ بیتیوں کے اُردو تراجم: تحقیق و تجزیہ

۷۔ عالمی فلمی فنکاروں کی آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال

۸۔ مشاہیر زمانہ کی آپ بیتیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ

اظہارِ تشکر

راقم کا یہ تحقیقی مقالہ، نگران مقالہ ڈاکٹر پروین اختر کلّو کی رہنمائی اور بھرپور مشاورت کے سبب پایہ تکمیل کو پہنچ سکا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری ہر قدم پر رہنمائی فرمائی ہے۔ شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے ذی وقار اور پرخلوص اساتذہ کرام ڈاکٹر شبیر قادری، ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر سعید احمد اور بالخصوص چیئرمین شعبۂ اُردو ڈاکٹر آصف اعوان کا شکر گزار ہوں۔

پی ایچ۔ڈی اردو کے ہم جماعت اور دوست محمد اجمل دانش کا شکریہ جنہوں نے راقم کے لیے بہت سی آسانیوں کے ساتھ پرخلوص مشاورت بہم پہنچائی۔ برادرانِ عزیز ڈاکٹر اقبال حسین وٹو، ڈاکٹر محمد محسن وٹو اور میرے پیارے بچوں ملیحہ عرفان، محمد فائق عرفان اور گھر کے دیگر افراد کی پرخلوص دعائیں یقیناً اللہ کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی رہیں۔ مقالے کی تکمیل میں حائل مشکلات کو دور کرنے میں سابق ہم جماعت دوست محمد شہباز کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ کمپوزنگ کے سلسلے میں مہر گرافکس کے راشد حسین کا تعاون بھی سراہنے کے قابل ہے۔

مواد کی فراہمی کے لیے راقم اہم اداروں اور کتب خانوں کا تذکرہ نہایت احسان مندی سے کرنا مناسب سمجھتا ہے کیونکہ کتب، رسائل و جرائد اور دیگر حوالہ جاتی مواد کے بغیر کسی تحقیقی مقالہ کی تکمیل کے بارے میں سوچنا عبث ہے۔ ان میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد لائبریری، اورینٹل کالج لاہور لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری لاہور اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی لائبریری شامل ہیں۔

عرفان توحید

فہرست ابواب

تفصیلِ ابواب

باب اوّل

اُردو آپ بیتی اور اس کی روایت

باب اوّل

اُردو آپ بیتی اور اس کی روایت

آپ بیتی لفظ کے معنی ''ذاتی سرگزشت'' یا ''جگ بیتی'' کے ہیں۔ انگریزی میں اسے Auto Biography یا Self Biography کہا جاتا ہے۔ دراصل آپ بیتی کی اصطلاح دو یونانی الفاظ سے مل کر بنی ہے جس میں ''Auto'' کے معنی ''خود'' اور ''Biography'' کا مطلب ''سوانح'' یعنی ''خودنوشت سوانح'' کے ہیں۔

آپ بیتی اصل میں کسی شخصیت کی زندگی کے گزرے لمحات کی داستان کا نام ہے۔ گویا اپنی ذات کے حوالے سے اظہارِ حقیقت کو ''آپ بیتی'' کہتے ہیں۔ آپ بیتی کی ترکیب اپنی ساخت کے اعتبار سے دو الفاظ ''آپ'' اور ''بیتی'' کے ملاپ سے بنتی ہے۔ معنوی لحاظ سے آپ بیتی وہ صنفِ نثر ہے جس میں مصنف اپنی ذات پر بیتنے والے حالات کو بیان کرتا ہے۔ شاداب سید آپ بیتی کی تعریف کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "The description (graphia) of an individual human life (bio) by the individual himself (auto)."(1)

فرد کی زندگی کے حالات کا بیان آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اسے خودنوشت بھی کہا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی صرف حالات و واقعات ہی نہیں بلکہ عموماً تحریر کرنے والے کی دلی کیفیات، احساسات، مشاہدات اور جذبات کے متعلق اس کی سوچ کی ترجمانی کرتی ہے۔(۲)

آپ بیتی کیونکہ مصنف کی اپنی داستان حیات ہوتی ہے اس لیے ہر مصنف کا انداز بیاں الگ الگ ہوتا ہے اور مصنف اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے میں پوری طرح آزادی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو سہل انداز میں قارئین کرام تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک معیاری آپ بیتی میں زندگی کا احوال اس طریقے سے بیان کیا جاتا ہے، جس طرح وہ حالات کسی کی زندگی میں گزرتے ہیں۔ زندگی کے خوش گوار اور ناخوش گوار واقعات کو بیان کرنے کے لیے مہارت کی ضرورت درکار ہے۔(۳)

کسی بھی انسان کی زندگی میں گزرے ہوئے حالات و واقعات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ دنیاوی رقص گاہ حیات میں ایک طرف تو اچھی یادیں دل کو سکون فراہم کرتی ہیں تو دوسری طرف مصائب و آلام کو بھی بھلائے نہیں بھولا جا سکتا۔ کیونکہ فرد کی زندگی میں دکھ اور سکھ لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کو تحریری صورت میں لکھنا اور دوسرے

انسانوں تک پہنچانا ایک تاریخی امر ہے۔ دراصل انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے حالات وواقعات سننے اور اپنے ذاتی مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانے کا عادی رہا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ سلسلہ ازل سے لے کر ابد تک جاری وساری رہے گا۔

آپ بیتی کا مصنف اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کو من وعن لکھتا ہے۔ کسی اہل فن شخصیت کا اپنے آپ کو تحریری انداز میں منظر عام پر لانا اور اپنے محاسن اور معائب کو عوام کے سامنے بے دھڑک پیش کر دینا آپ بیتی کے زمرے میں آتا ہے۔ آپ بیتی ادب کی وہ صنف ہے جو کسی شخصیت کی زندگی کے مختلف حصوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اسی کے قلم سے تحریر ہوتی ہے۔[۴] آپ بیتی حالات و واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ لکھنے والے کی شخصیت اور ذہن سازی میں کارفرما عوامل کی بھی بھرپور انداز میں ترجمانی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ خودنوشت کسی فرد کی زندگی کے عملی تجربوں، سوچ اور فکر کی ایسی کہانی ہوتی ہے جو سچائی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ جس کو پڑھ کر اس انسان کی زندگی کے حالات کا پتہ چل سکے، اس کی زندگی کے راز اور مختلف کیفیات کو بآسانی جان لیا جائے۔[۵]

آپ بیتی خالص شخصی اور ذاتی نوعیت کی تخلیق ہے۔ اس میں مصنف اپنی ذات کے اہم تجربات ومشاہدات کا تذکرہ اپنے عہد کے رویوں، رواجوں، عقائد اور طرز معاشرت کے عین مطابق کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ بیتی ایسی تحریر ہے جس میں کسی انسان کی زندگی کے مختلف حصوں کو بغیر کسی مبالغہ آرائی کے قارئین کرام کے سامنے بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کن حالات میں بچپن سے جوانی اور تعلیم کے مدارج کو طے کیا ہے۔[۶] آپ بیتی تحریر کرنے والا اپنی داستان حیات چونکہ خود بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی تحریر صداقت پر مبنی ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے مصنف اپنی آپ بیتی پوری ایمان داری سے پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی عموماً زندگی کے اس دور میں لکھی جاتی ہے جب کوئی فرد اپنی زندگی کا اچھا خاصا وقت گزار چکا ہوتا ہے۔ ایسی سرگزشت پختہ سوچ اور زندگی کے تجوڑ کا حاصل ہوتی ہے۔[۷]

ادب کی چاہے کوئی بھی صنف ہو ایک ادیب اپنے محسوسات اور مشاہدات کو اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرتا ہے۔ انسان اپنی ذات کا تجزیہ دوسرے لوگوں کی نسبت بہترین طور پر کر سکتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو بخوبی جانتا ہے۔ دنیا ظاہری طور پر ایک ایسے عالم کا نام ہے جس کی دو جدا جدا صورتیں ہیں۔ ایک اپنی ذات جسے ہم داخلی دنیا کہتے ہیں اور دوسری باہر کی دنیا جس کو خارجی دنیا کہا جاتا ہے۔ خارجی دنیا کا مشاہدہ اور مطالعہ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے اور مختلف قسم کے نتائج اخذ کر کے دوسرے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کی روح کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کی روح کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنا مشکل بلکہ ناممکن امر ہے۔ داخلی دنیا دیکھنے میں محدود ہے لیکن اس کا احاطہ کرنا کسی دوسرے کا کام نہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی خالصتاً ایک داخلی فن ہے۔ اس میں خارجی زندگی کے

امکانات داخلی دنیا سے پھوٹتے ہیں۔ یہ زندگی کی طرح طویل بھی ہو سکتے ہیں اور مختصر بھی۔ اس کا مرکز و محور داخل ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ خارجی واقعات کا بیان ضمنی ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا کسی مسئلے کو بیان کرتا ہے۔ تو خود ہی اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ آپ بیتی میں داخلی اور خارجی زندگی یکجا صورت میں نظر آتی ہے۔

آپ بیتی کی قدیم صورت کو اگر دیکھا جائے تو ان میں موجود واقعات عموماً خارجی نوعیت کے حامل ہوتے تھے۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنی کہانی کا آغاز کر کے خارجی زندگی میں گم ہو جاتا ہے۔ ان میں مصنف کی ذات ہیرو کے انداز میں موجود ہوتی ہے اور وہ اپنی داخلی زندگی کے واقعات کو پیش کرتا جاتا ہے الغرض اپنی کہانی خود اپنی زبانی بیان کرنے کا نام آپ بیتی ہے۔ ایک داستانِ حیات کسی شخصیت کی ذہنی، جسمانی، مالی بحرانوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے محرکات کا ایسا نمونہ ہوتی ہے جو اس کی ذات کے بارے میں مزید جاننے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔(۸)

آپ بیتی کا مصنف اس وقت اپنی تحریر پیش کرتا ہے جب وہ اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ گزار چکا ہوتا ہے۔ تب وہ آپ بیتی تحریر کرتا ہے کیونکہ آپ بیتی میں پختگی سے مصنف اپنی زندگی کے تمام تجربات کو بیان کرتا ہے اور اسی وجہ سے آپ بیتی مصنف کی خارجی و داخلی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔ یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی اعترافات بقائے نسل کی خواہش کے علاوہ خود اپنی ذات کا اظہار ہے۔
> ہماری جبلت میں داخل ہے۔ ہمارے تمام فنون لطیفہ فنکار کے اظہار ذات کے سوا
> کچھ نہیں ہے۔''(۹)

آپ بیتی شخصیت کے عہد کی مکمل تاریخ ہوتی ہے کیونکہ دنیا میں واقعات کا سلسلہ اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب دوسروں کے حالات بھی درج کیے جائیں۔ معاشرے اور عہد سے ہٹ کر انسان اپنے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی میں داخلیت اور خارجیت کا خوب صورت ملاپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ عبدالمجید قریشی لکھتے ہیں:

> ''ایک آپ بیتی محض ''در مدح می گویم'' قسم کی چیز نہ ہو بلکہ وہ ''کتاب المناقب''
> ہونے کے ساتھ ساتھ ''کتاب المثالب'' بھی ہو۔''(۱۰)

آپ بیتی کے معنی، مفہوم اور تعریفات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ معیاری آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی کارنامے بھی موجود ہوں، یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی کا فن اظہارِ ذات کا بہترین ذریعہ ہے جس سے ادب میں مصنف کی پہچان ہوتی ہے۔

اُردو آپ بیتی کے عناصر

تخلیق بشر سے انسان میں اپنے وجود کے احساس کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ مقاصد حیات کو جان لینے کی خواہش نے ہمیشہ انسان کو تجسس میں رکھا ہے۔ اس لیے انسان اپنے نفسیاتی تجربات اور مشاہدات سے نئی نئی چیزیں سیکھتا رہتا ہے۔ زندگی کے خوش گوار اور تلخ تجربات سے اہل معاشرہ کو آگاہ کرنا اس کے لیے تزکیۂ نفس کا باعث رہا ہے۔ اس فطرتی امر کے تحت ہر دور میں انسان اپنی ذات کے اظہار کو مختلف روپ میں دوسروں کو دکھاتا ہے۔ بہت سی اہل فن شخصیات نے اپنے کارہائے نمایاں کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ادبی اصناف کا استعمال کیا ہے جن میں اہم اصناف ادب سفرنامے، تذکرے، افسانے، خطوط، مثنویاں، انٹرویوز، روزنامچے اور رپورتاژ آپ بیتی کی ذیل میں آتی ہیں۔ ان اصناف ادب میں مصنف اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو بیان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان اصنافِ ادب میں ہم آپ بیتیوں کے ابتدائی نقوش کو بہتر انداز میں جان سکتے ہیں۔

آپ بیتی بطور سفرنامہ

ہر دور میں سفرنامے تاریخ کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان میں مصنف کی شخصیت کی جھلک ہمیں دکھائی دیتی ہے اور سفرنامہ لکھنے والے کی ذات کو سفرنامہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے لہٰذا آپ بیتی کے اسے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کو دنیا کا پہلا سفرنامہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ہر عہد میں مؤرخین نے فن سفرنامہ نگاری میں اپنے اپنے جوہر دکھائے ہیں ان سفرناموں کے مختلف ادوار کے ارتقاء سے اسے ایک فن کا درجہ دیتے ہوئے ایک الگ صنف ادب کا مقام دے دیا گیا ہے۔ یہ صنف اب معلومات کو بہم پہنچانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ سفر کے تجربات و مشاہدات کو رقم کرنے کا نام ہے۔

آغاز کے سفرناموں کو پرکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سفرناموں کا تاریخ کے ساتھ ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ اپنے اپنے دور کی تاریخ کو اپنے اندر سمونے والے اہم سفرناموں میں ہمیں ابن بطوطہ کا ''سفرنامہ ابن بطوطہ''، سرسید احمد خاں کا ''مسافران لندن''، مولانا شبلی نعمانی کا مشہور سفرنامہ ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' اپنی مثال آپ ہیں۔ سفرنامے زندگی کے قلیل دور پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن آپ بیتی زندگی کے مختلف ادوار پر مشتمل ہوتی ہے۔[11] سفرنامہ ایک ایسی بیانیہ نثری صنف ادب ہے جس میں ایک ہی وقت میں کئی عوامل پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف اس میں کہانی اور قصہ کا انداز دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف اس میں دنیا کی مختلف اقوام اور ممالک کے سیاسی، سماجی، تاریخی، جغرافیائی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی طرزِ فکر کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اردو ادب میں سفرنامے کی ابتداء یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے ''عجائبات فرنگ'' سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں لندن کے سفر کے واقعات، انوکھے مشاہدات اور اپنے تجربات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۴۷ء میں شائع

ہوا تھا۔ ان کے بعد سر سید احمد خاں نے دو سفرنامے تحریر کیے ان میں ''مسافرانِ لندن'' اور ''سفرنامہ پنجاب'' بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح محمد حسین آزاد کے بھی دو مشہور سفرنامے جن میں ایک ''سیرِ ایران'' اور دوسرا ''وسط ایشیاء کی سیر'' شامل ہیں۔

آپ بیتی بطور مکتوبات

مکتوبات کو اپنے ذاتی احوال کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ مکتوبات میں ہم اپنے جذبات اور احساسات کو لکھ کر بیان کر رہے ہوتے ہیں اس لیے خطوط میں ایسی باتیں بھی بآسانی کہی جا سکتی ہیں جن کو ہم بالمشافہ انداز میں بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ خطوط کی کوئی حدود و قیود مقرر نہیں ہیں اس لیے ہم ایک خط میں کئی موضوعات پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ مکتوب نگاری میں بھی آپ بیتی کی طرح اپنی تمام باتوں کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوبات میں آپ بیتی کے عناصر کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اُردو مکتوبات کی روایت میں غالبؔ کے خطوط منفرد اسلوب بیان کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ غالبؔ کے خطوط کے دو اہم مجموعے ''عودِ ہندی'' اور ''اردوئے معلی'' کے عنوانات کے تحت شائع ہوئے۔ ان خطوط کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ نے اپنی زندگی کے بہت سے حالات و واقعات کا تذکرہ خطوط کے ذریعے ہی کیا ہے۔ خطوط کسی انسان کی شخصیت کو جاننے کا ایسا دروازہ ہوتے ہیں جن میں داخل ہوئے بغیر کسی انسان کی اصلیت اور اس کی شخصیت کے بارے میں ہم آگاہ نہیں ہو سکتے۔[۱۲] اہم مکتوبات میں مولانا شبلی نعمانی کے مکتوبات کے مجموعات ''مکاتیبِ شبلی'' اور ''خطوطِ شبلی'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ خطوط علامہ محمد اقبال بھی خاصے کی چیز ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کے مجموعوں میں ''مکاتیب ابوالکلام''، ''نقشِ آزاد''، ''برکات آزاد''، ''کاروانِ خیال'' اور ''غبارِ خاطر'' شامل ہیں۔

آپ بیتی بطور انٹرویو

مشاہیر زمانہ کے ذاتی حالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے انٹرویوز کی مدد سے جمع کر کے اخبارات، رسائل، جرائد، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور سوشل میڈیا کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان معلومات سے قابلِ قدر شخصیات کے افکار و نظریات، ذاتی پسند و ناپسند اور باہمی دل چسپی کے امور کے متعلق آگاہی ہوتی ہے۔ انٹرویو لینے والے کو چاہیے کہ وہ انٹرویو دینے والے کے لیے ایک جامع سوال نامہ تیار کرے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اس شخصیت کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، نظریات اور حقائق کو اکٹھا کر سکے۔ اہل فن کے انٹرویوز کو اگر مربوط انداز میں جمع کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے تو ان کے احوال کے پنہاں گوشوں تک قارئین کی رسائی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ تمام انٹرویو ادبی لحاظ سے ایک موثر آپ بیتی کو ترتیب دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی کے فن میں انٹرویوز کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

آپ بیتی بطور تذکرہ

اردو ادب میں تذکرہ نگاری کی صنف بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز میر تقی میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے ہوتا ہے۔ تذکرہ نگاری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کے تذکرہ جات بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تذکرہ جات میں مختلف شاعر اور ادیب حضرات کی زندگی کے حالات کی بھرپور جھلک دکھائی دیتی ہے اور یہی چیز تذکروں کو آپ بیتی کی صنف کے بہت قریب لے آتی ہے۔ اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرہ جات میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں۔ بلاشبہ سوانحی ادب میں ان تذکرہ جات کی بدولت بہت فائدہ ہوا ہے۔[۱۳] مولانا الطاف حسین حالی کو اردو ادب میں اولین سوانح نگار کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے سوانح نگاری کو تذکرہ نگاری کی ریت سے بالکل آزاد کر دیا۔ مولانا کی پہلی سوانح نگاری کی تصنیف ''حیاتِ سعدی'' تھی، جس میں انہوں نے شیخ سعدی کی زندگی کے حالات کو اختصار سے پیش کیا اور سعدی کے کلام کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ مولانا کی دوسری تصنیف ''یادگارِ غالب'' جس میں انہوں نے مرزا اسداللہ غالب کی زندگی کے حالات اور ان کے کلام کا تجزیہ کیا ہے۔ حالی کی تیسری سوانح عمری ''حیاتِ جاوید'' ہے۔ جس میں سرسید احمد خاں کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور میں مولانا حالی اور مولانا شبلی کے علاوہ ذکاء اللہ، نذیر احمد، چراغ علی اور عبدالحلیم شرر نے مختلف شخصیات کی سوانح عمریاں تحریر کیں۔ ان سوانح عمریوں اور تذکرہ جات میں وہ تمام باتیں تفصیلاً درج نہیں جنہیں آپ بیتی کا حصہ ہونا چاہیے۔ مگر ان میں مختلف شخصیات کے سوانحی حالات اس مخصوص عہد کے بہت سے رجحانات اور میلانات سے ہمیں بخوبی واقف کرواتے ہیں۔

آپ بیتی بطور روزنامچہ

روزنامچہ میں روزانہ کے گزرے ہوئے واقعات، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ روزنامچہ کے توسط سے ہمارے سامنے زمانی اعتبار سے مکمل آپ بیتیاں ملتی ہیں کیونکہ اس میں مصنف کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کا اظہار بڑی ترتیب سے دستیاب ہوتا ہے۔ آپ بیتیوں کو تحریر کرنے میں روزنامچوں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ روزنامچوں میں مصنف کے معمولات کا تذکرہ اس کے اپنے قلم سے ہوتا ہے۔[۱۴] انکشافِ ذات کے حوالے سے دیکھا جائے تو روزنامچہ آپ بیتی کے بہت قریب ہے۔ آپ بیتی میں یادداشت اور حافظے کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ روزنامچہ چونکہ روزانہ کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے اس لیے اس میں تمام امور کا تذکرہ ترتیب وار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے آپ بیتی لکھنے والے روزنامچہ کی مدد سے آپ بیتی کو منظم کرتے ہیں۔

آپ بیتی بطور مثنوی

اردو ادب میں مثنوی کی صنف بہت قدیم ہے۔ اردو میں اس کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ دکن کے بہت سے شعراء نے مثنویات تحریر کیں ان میں اہم نام نصرتی، رستمی، غواصی، ابن نشاطی، فیروز، اشرف اور وجہی ہیں۔ ان کے علاوہ میر اثر، میر تقی میر، میر حسن، دیا شنکر نسیم اور شوق جیسے قابل قدر شعراء کرام شامل ہیں۔ مثنوی میں اکثر شعراء اپنا احوال بھی قلم بند کرتے ہیں۔ مثنوی کی روایت میں یہ چیز داخل ہے کہ اس میں کسی قصے کے آغاز سے پہلے شاعر اپنے حالات اختصار سے بیان کرتا ہے۔ یہ ایک پرانی روایت چلی آتی ہے کہ کہانی بیان کرنے سے پہلے شاعر اپنے دور اور اپنے ذاتی کوائف بیان کرتا تھا۔ اپنے احوال کے اس مختصر بیان کو آپ بیتی کہا جانا نامناسب نہیں ہوگا۔[۱۵] مثنوی کے جس حصے میں شاعر اپنی کہانی بیان کرتے ہیں وہ جزوی طور پر اس شاعر کی آپ بیتی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے مثنوی کو آپ بیتی کا ایک نہایت اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔

آپ بیتی بطور افسانہ

اُردو ادب میں افسانہ نگاری کی صنف اہم ہے۔ انگریزی ادب سے یہ صنف اُردو ادب میں شامل ہوئی۔ اس میں عموماً دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ مصنف فرضی ناموں سے اپنے مشاہدات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے اور بعض اوقات کسی دوسرے کی زندگی کے واقعات کو رقم کرتا ہے۔ ان مشاہدات یا واقعات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قاری کی دل چسپی آغاز سے لے کر اختتام تک باقی رہتی ہے۔ اس انداز تحریر کو افسانوی رنگ کہا جاتا ہے۔ افسانوں کو سوانح عمری یا خودنوشت سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔[۱۶] اردو میں بہت سی سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں میں ایک افسانوی رنگ ملتا ہے جو کہ آپ بیتی کو شہرت دوام تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

آپ بیتی بطور رپورتاژ

فرنچ زبان کے لفظ ''رپورتاژ'' کے معنی ہیں ''اطلاع'' یا ''خبر دینا''۔ کسی واقعے کو جوں کا توں بیان کر دینا رپورتاژ کے زمرے میں آتا ہے۔ موجودہ دور میں اسے صحافت کا حصہ قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کا جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ سچائی کے ساتھ واقعے کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس میں مبالغہ آرائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اُردو ادب میں سجاد ظہیر کی رپورتاژ ''یادیں'' کو پہلی رپورتاژ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کی ''پودے'' اور محمد کرم صدیقی کی ''قید یاغستان'' اہم ہیں۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو رپورتاژ آپ بیتی سے ملتی جلتی صنف ادب ہے کیونکہ اس میں صداقت اور راست گوئی کی صفات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی اور رپورتاژ میں گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔ متذکرہ بالا عوامل سے واضح ہوتا ہے کہ رپورتاژ میں بھی آپ بیتی کے عناصر کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی کی روایت

مغربی ادب میں آپ بیتی کی روایت کا تعلق قدیم عیسائی مذہبی تعلیمات سے ملتا ہے کیونکہ مذہب کی بہت سی کتب میں اہم شخصیات کے احوال کا بیان موجود ہے۔ مغربی ادب میں عموماً آپ بیتیاں اہم شخصیات کے اعترافات کی شکل میں موجود ہیں۔ مغربی ادب میں سولہویں صدی عیسوی کو آپ بیتی کے آغاز کی صدی قرار دیا جاتا ہے۔ اٹلی کی دو کتب جو کہ سولہویں صدی عیسوی میں چھپنے والی فنی اعتبار سے خودنوشت نگاری کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ اس دور کی ذاتی نوعیت کے تجزیات سے بھرپور کتب میں پہلی جیردم کارڈن فریشن اور دوسری بیوینٹیو کی تصنیف ہے۔[۱۷]

قدیم مذہبی کتابوں میں لکھے گئے مختلف ادوار کے حالات و واقعات کو آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے لیکن انگریزی ادب میں آپ بیتی کی اصطلاح یونانی اور جرمن ادب کے توسط سے داخل ہوئی۔ انگریزی ادب میں اس اصطلاح کا استعمال اٹھارہویں صدی کے اواخر سے شروع ہوا۔ اس کی ابتدا قدیم یونانی زبان کے طرز پر ہوئی۔ اٹھارہویں صدی میں لفظ ''خودنوشت'' کو سب سے پہلے کس نے استعمال کیا اس میں بہت اختلاف ہے۔ اس کا پہلا ذکر جرمن شاعر J.G. Hunder کے تجویز کردہ عنوان سے ملتا ہے۔ یہ مجموعہ جرمن زبان میں ہے اور اس کے عنوان کا انگریزی ترجمہ اس طرح ہو گا ''Self biographies of famous men.'' اسے اٹھارہویں صدی کے آخر میں ترتیب دیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں Pierre Larousse نے اپنی ڈکشنری Grand Universal Dictionaire مرتب کی اس میں انہوں نے ''Auto biographic'' کے بارے میں لکھا ہے کہ دراصل یہ لفظ یونانی زبان سے نکلا ہے لیکن اس کی ساخت انگریزی ہے۔[۱۸]

انگریزی ادب میں خودنوشت سوانح حیات کا پہلا نمونہ سینٹ اگسٹائن کی تصنیف ''Confession'' کو سمجھا جاتا ہے۔ اگسٹائن کی تصنیف کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس طرح انگریزی ادب میں آپ بیتی کی صنف کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مذہب سے متعلقہ جذبات واحساسات سے اخذ کردہ آپ بیتیوں سے خودنوشت نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ بیتی کی تاریخ میں سینٹ اگسٹائن کے انکشافات کے بعد بہت عرصہ تک کسی اہم کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔[۱۹]

مغربی ادب میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب ناول وجود میں آیا تو اس وقت آپ بیتی کو بھی ادب میں بطور صنف شامل کیا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی سے باضابطہ طور پر آپ بیتی ادب میں مقبول عام ہو گئی۔ اس دور میں انگریز مصنفین میں تھامس کوپر کی آپ بیتی جس کا عنوان ''The life of Thomas Cooper written by himself'' کو بعض ناقدین فن نے انیسویں صدی کی بہترین آپ بیتی قرار دیا تھا۔

انیسویں صدی کی اہم آپ بیتیوں میں روسو کی آپ بیتی ''Confession'' ہے جس کا اردو ترجمہ ''اعترافات'' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی مغرب کے ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی آپ بیتی ہے جس کا دعویٰ خود روسو اپنی

زبان میں کرتا ہے۔ روسو اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"میں نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا اور اس کام کی تکمیل کے بعد اس کی تقلید کرنا ممکن نہ ہوگا۔"[۴۰]

ژاں ژاک روسو کی آپ بیتی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق آپ بیتیوں کی تاریخ پر اگر ہم نظر دوڑائیں تو ہمیں اُردو میں روسو کی آپ بیتی کی طرح کی شاید ایک کتاب بھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔[۴۱]

مغرب کے آپ بیتی لکھنے والوں میں سے ہیری جے گرین وال جن کا تعلق فن صحافت سے تھا۔ اس نے ملکہ وکٹوریہ کے آخری دور میں ایک آپ بیتی لکھی جس کا عنوان "I hate tomorrow" تھا۔ اس میں مصنف نے اپنے دور کے اہم واقعات جیسے جون ۱۸۵۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات، دنیا کی سیاحت کے قصوں کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی تعلیم کے زیر اثر ہندوستان میں آپ بیتی لکھنے کا ایک سازگار ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ جب انگریزی ادب کا ذوق وشوق سے مطالعہ کیا جانے لگا تو ان میں بھی آپ بیتیاں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی کی پہلی آپ بیتی لطف اللہ کی ہے جو کہ ۱۸۵۴ء میں لکھی گئی۔ ہندوستان میں انگریزی میں لکھی جانے والی دوسری آپ بیتی رکھال داس کی تھی جس کا عنوان تھا "The English Diary of an Indian Student" یہ آپ بیتی ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان شائع ہوئی۔ ان کے بعد نشی کانت چتو پادھیائے نے جرمن یونیورسٹی میں اپنی زندگی کی یادیں درج ذیل عنوان کے تحت لکھی تھیں: "Reminiscences of German University."

بیسویں صدی عیسوی میں آپ بیتی کے ضمن میں بہت اچھے اضافے ہوئے۔ بیسویں صدی کی ایک اہم آپ بیتی جسے ہم صدی کی اولین آپ بیتی کہہ سکتے ہیں وہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی جو "A reminiscences of a retired Hindu Officer" کے عنوان سے تحریر کی گئی۔ یہ آپ بیتی مسٹر بال کرشن مدلیر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے نئے رجحانات اور ہندو فلسفے کا ذکر ملتا ہے۔ لالہ لاجپت رائے کی آپ بیتی "The Indian Revolutionaries in the United States and Japan" کے عنوان سے شائع کروائی۔ اس آپ بیتی میں ان کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی جلاوطنی کے بارے میں بھی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے بعد پی۔سی۔رائے کی آپ بیتی "Life and experiences of a Bangali Chemist" کے عنوان کے تحت ۱۹۳۲ء میں دو جلدوں پر مشتمل شائع کروائی گئی۔ سبھاش چندر بوس کی آپ بیتی "An Indian Pilgrim" کے عنوان سے ۱۹۳۷ء میں ان کی زندگی کے ۲۳ برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے نشیب وفراز

کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نامور ادیب ملک راج آنند کی آپ بیتی ۱۹۴۶ء میں " Apology for heroism-A brief autobiography of ideas" کے عنوان سے لکھی گئی تھی۔

فارسی ادب میں آپ بیتی کی روایت بہت قدیم ہے۔ بہت سے مصنفین نے تاریخ اور آپ بیتی کو ایک ہی صنف کے طور پر دیکھا ہے۔ فارسی ادب میں آپ بیتی کی صنف کو خاصہ عروج حاصل رہا ہے۔ مغل دور حکومت میں فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے آپ بیتی بھی فارسی زبان میں لکھی جاتی رہی۔ فارسی میں خودنوشت کی روایت قدیم ہے۔ اس میں امیر تیمور کے ملفوظات تزک بابری اور تزک جہانگیری تک آپ بیتیوں کے آثار بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔[۲۲] فارسی ادب میں علماء، صوفیاء اور شعراء کرام کے تذکرے موجود ہیں اور تمام تاریخی کتب کے آخر میں مصنفین اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھتے رہے۔ فارسی میں بہت سی معروف آپ بیتیاں موجود ہیں جس میں ''تزکِ بابری'' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کا مصنف بہت اچھا قوتِ مشاہدہ رکھنے والا اور حالات و واقعات کو مؤثر انداز میں لکھنے والا ہے۔ فارسی زبان میں ایک اور اہم روزنامچہ نما آپ بیتی ''تزکِ جہانگیری'' ہے۔ تزک جہانگیری میں مفصل انداز میں مغل بادشاہ جہانگیر کے حالات و واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کی تحریر کردہ ''ذکرِ میر'' کے عنوان سے فارسی آپ بیتی ہے جو کہ آپ بیتیوں میں بلند مقام کی حامل ہے۔ اس میں میرؔ کی ذاتی زندگی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ فارسی زبان میں امیر تیمور اور حضرت داتا گنج بخشؒ کی آپ بیتیاں بہت مشہور ہوئیں۔

اُردو ادب میں آپ بیتی کی روایت

اردو ادب میں آپ بیتی کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں باقاعدہ شروع ہوا۔ اگرچہ آپ بیتی کے کچھ آثار تذکرہ جات، تاریخ کی کتب، اولیاء و صوفیا کرام کے ملفوظات، روزنامچوں اور مکتوبات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اُردو ادب میں آپ بیتیاں تحریر کی جانے لگیں لیکن ان آپ بیتیوں کو ہم ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ اردو آپ بیتیوں کے ابتدائی نقوش مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں جنگ آزادی کے بعد باقاعدہ آپ بیتیاں لکھنے کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف کا آغاز بیسویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔[۲۳]

اُردو آپ بیتی اردو ادب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی لیکن اس کو صنف کا درجہ بیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ اس دور میں چند اہل فن نے جنگ آزادی کے حالات و واقعات، اہم خدمات اور اپنے مشاہدات کو احاطۂ قلم میں لانا شروع کر دیا تھا۔ آپ بیتیاں لکھنے کا رواج ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا تھا۔ جس طرح ملک ترقی کرتا رہا اسی طرح آپ بیتیاں بھی لکھی جانے لگیں۔[۲۴]

آپ بیتی کا اُردو ادب میں آغاز روزناچوں کے انداز میں ہوا۔ جنگ آزادی کے حالات کو لکھنے والوں نے روزنامچے کے انداز میں تحریر کرنا شروع کیا۔ بعد میں یہی روزنامچے آپ بیتی کہلانے لگے۔ اردو میں باقاعدہ سب سے پہلی آپ بیتی جس میں مصنف کی زندگی کے حالات لکھے گئے ہیں وہ مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف ''تواریخ عجیب'' ہے۔ اُردو کی پہلی خودنوشت جعفر تھانیسری کی تحریر کردہ کالا پانی ہے۔(۲۵)

تواریخ عجیب (کالا پانی)

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی داستانِ حیات ''تواریخ عجیب'' ہے جو کہ بعد میں ''کالا پانی'' کے عنوان سے بہت مشہور ہوئی۔ یہ آپ بیتی ۱۸۸۵ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس سرگزشت میں انگریز حکومت کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدینِ آزادی کا احوال، جزائر انڈیمان کے حالات اور ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی صورت حال کو واضح کیا گیا ہے۔ آپ بیتی ''تواریخ عجیب'' کی ایک نہایت اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ اسے اُردو ادب کی اوّلین آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں چھپنے والی اس آپ بیتی میں مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کے علاوہ جزائر انڈیمان کے باشندوں کی تاریخ، ان کے رسم و رواج، مذہبی عقائد، روزمرہ کی زبان، طورطریقے اور ماحول کو بیان کیا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں ایک اور اُردو آپ بیتی جسے نواب صدیق حسنین خان نے ''البقالمنن بالقالمحن'' کے عنوان سے شائع کروایا تھا، منظر عام پر آئی۔ اردو میں خاتون آپ بیتی نگار شہربانو بیگم نے ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں آپ بیتی تحریر کی تھی۔ اس آپ بیتی کو خواتین کی اوّلین آپ بیتی سمجھا جاتا ہے۔

حیات نسّاخ

۱۸۸۶ء میں شائع ہونے والی بنگال کے نامور شاعر عبدالغفور نسّاخ کی آپ بیتی ''حیات نساخ'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اس میں مصنف نے اپنے عہد کے سماجی اور معاشرتی حالات، رسم و رواج اور خوراک کا احوال قلم بند کیا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست احباب، اساتذہ اور شاگردوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

قید یاغستان

محمد اکرم صدیقی کی آپ بیتی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۷ء، تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع کیا گیا۔ آپ بیتی میں مصنف کی زندگی کے ان پینتالیس دنوں کا احوال قلم بند کیا گیا ہے جو کہ انہوں نے پولیٹیکل محکمہ کی ملازمت کے دوران سرحدی فراریوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد گزارے۔ آپ بیتی میں صوبہ سرحد کے حالات، انگریز حکومت کے اثرات، افغانستان کی سیاسی صورت حال اور اس وقت کے سماجی اور معاشرتی صورت حال کو بیان کیا گیا

ہے۔ اس آپ بیتی کا دور محدود ہے لیکن یہ روداد نگاری پر لکھی جانے والی انگریزی کی اچھی کتب کا مقابلہ بآسانی کر سکتی ہے۔[۲۶] آپ بیتی میں سرحدی علاقوں اور لوگوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً سرحدی فراریوں کی تہذیب وتمدن کو پیش کیا گیا ہے۔

داستان غدر

سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی تحریر کردہ آپ بیتی جو کہ مطبع کریمی لاہور سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ ''داستانِ غدر'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے ابواب میں مصنف کی ابتدائی زندگی اور آخری مغل بادشاہ کے حالات، تیسرے اور چوتھے ابواب میں جنگ آزادی کی صورت حال کو بیان کیا ہے۔ پانچویں سے دسویں ابواب تک مصنف نے جنگ آزادی کے بعد کا احوال بیان کیا ہے۔ اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے ذاتی احوال کے ساتھ ملکی سیاسی صورت حال کو بھی تحریر کیا ہے۔[۲۷] آپ بیتی میں آزادی کی جنگ کے علاوہ مصنف نے اپنے ذاتی حالات و واقعات کو بھی بطور خاص شامل کیا ہے۔ یہ آپ بیتی بلاشبہ اردو آپ بیتیوں کی روایت میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

آپ بیتی

خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی کا سن اشاعت ۱۹۱۹ء ہے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع کیا گیا۔ آپ بیتی میں مصنف کے ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت، عالم شباب کا دور غرض زندگی کے مختلف عوامل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مصنف کی تحریر سے اس عہد کے سماجی، علمی اور معاشرتی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔

تذکرہ

اردو آپ بیتی کی روایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کی داستان ۱۹۱۹ء میں کلکتہ سے فضل الدین احمد مرزا نے البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس سے شائع کروائی۔ یہ آپ بیتی فضل الدین احمد مرزا کے اصرار پر مولانا نے لکھنا شروع کی۔ مسودہ کی ضخامت کی وجہ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مسودہ کا پہلا حصہ ''تذکرہ'' ہے جبکہ دوسرا ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ آپ بیتی کے پہلے باب میں مصنف نے اپنے دادا شاہ محمد افضل اور ان کے بزرگ حضرت شیخ جمال الدین دہلوی کے بارے میں لکھا ہے۔ دوسرے باب میں شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات بیان کیے ہیں۔ تیسرے باب میں اپنے والد، دادا اور نانا کے بارے میں لکھا ہے۔

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی

مولانا ابوالکلام آزاد کی دوسری آپ بیتی ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جو کہ مولانا کے دوست عبدالرزاق ملیح آبادی کے

اصرار پر ۱۹۲۱ء میں تحریر کی گئی۔ آپ بیتی کے آخری ۱۹۲ صفحات مولانا کی ذاتی زندگی کے احوال پر تحریر کیے گئے ہیں۔ اپنے والد کے حالات کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے سو صفحات لکھے ہیں۔ اس آپ بیتی میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو بطور خاص جگہ دی ہے۔

کارنامہ سروری

نواب آغا مرزا بیگ خان بہادر سرور جنگ کی آپ بیتی ''کارنامہ سروری'' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۳ء میں شائع کی گئی۔ آپ بیتی کے آغاز میں مغلیہ خاندان کے زوال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دہلی کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی احوال کو قلم بند کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے دوسرے حصے میں مصنف کی تعلیم و تربیت اور علمی مشاغل کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ تیسرے اور آخری حصے میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان بیان کی ہے۔

میری کہانی میری زبانی

سید ہمایوں مرزا کی آپ بیتی ''میری کہانی میری زبانی'' ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آئی۔ مصنف نے آپ بیتی کے آغاز میں اپنے بچپن سے جوانی تک کے اہم واقعات کو تحریر کیا ہے۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان میں قیام اور وہاں کی طرزِ معاشرت کا مکمل جائزہ بھی آپ بیتی کا اہم حصہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی ملازمت اور ازدواجی زندگی کے حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ غرض یہ آپ بیتی سماجی عوامل کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ایک معلم کی زندگی

عبدالغفار مدھولی کی آپ بیتی ''ایک معلم کی زندگی'' مکتبہ جامعہ دہلی سے دو جلدوں پر مشتمل ۱۹۴۲ء میں شائع کی گئی۔ یہ آپ بیتی مصنف کے اکیس سالوں کے حالات اور تعلیمی تجربات کا نچوڑ ہے۔ پہلی جلد میں اپنی زندگی کے چودہ برسوں کا احوال اور دوسری جلد میں سات برسوں کے اہم واقعات کو پیش کیا ہے۔ بطور معلم عبدالغفار مدھولی نے اپنے مشاہدات اور احساسات کو بخوبی اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔

''نیرنگی بخت'' یعنی ''میری اپنی کہانی''

وزیر سلطان بیگم جالندھری کی آپ بیتی ''نیرنگی بخت'' یعنی ''میری اپنی کہانی'' ۱۹۴۲ء میں جالندھری سے شائع ہوئی۔ چونکہ مصنفہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھیں اس لیے انہوں نے بہت سوچ و بچار کے بعد اپنی آپ بیتی تحریر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس دور میں خصوصاً خواتین میں آپ بیتیاں لکھنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ آپ بیتی میں اظہارِ ذات کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے

ہندوستان کے صاحبِ حیثیت گھرانوں کی سماجی حالت کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ بیتی اس دور کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی زندگی کے مشاہدات، حالات و واقعات کو بڑے دل کش اسلوب میں تحریر کیا ہے۔

اعمال نامہ

سر سیّد رضا علی کی داستان حیات ''اعمال نامہ'' ہندوستانی پبلشرز دلّی کے زیر اہتمام ۱۹۴۳ء میں شائع کی گئی۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی زندگی کے اہم موقعوں اور مختلف شخصیات کی ۱۴ عدد تصاویر کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ آپ بیتی کو مصنف نے چودہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز کے ابواب میں پیدائش، بچپن، مکتب، سکول، کالج کے زمانہ طالب علمی کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اہم امور کے ساتھ ساتھ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے حالات بتائے گئے ہیں۔ پانچویں اور چھٹے ابواب میں علی گڑھ کالج کی تعلیمی سرگرمیوں، اساتذہ اور احباب کا تذکرہ ملتا ہے۔ نویں باب تک ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دسویں سے لے کر بارہویں باب تک مذہب، حسن، محبت اور اُردو کی ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر کے دو ابواب میں مصنف نے اپنے والدین، اولاد اور خصائل کو بیان کیا ہے۔ ''اعمال نامہ'' میں ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، سیاست اور سماج کی مکمل تصویر بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آپ بیتی کو اُردو ادب کی پہلی مکمل آپ بیتی سمجھا جاتا ہے۔

خوں بہا

حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی ''خوں بہا'' اردو آپ بیتیوں کی روایت میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ ۱۹۴۳ء میں اسے مرکنٹائل پریس لاہور سے شائع کیا گیا۔ آپ بیتی میں علی گڑھ کالج کے ادبی ماحول، تعلیمی روایات، اپنے دوست احباب، اساتذہ اور اپنے ملازمین کے بارے میں تفصیلی تذکرے ملتے ہیں۔ یہ آپ بیتی اپنے دور کے سماجی اور معاشرتی عوامل کی منہ بولتی تصویر ہے۔

میرا افسانہ

چودھری افضل کی آپ بیتی ''میرا افسانہ'' کی پہلی اشاعت تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ یہ آپ بیتی دو سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کا پہلا حصہ دوسرے حصے کی نسبت زیادہ دلکش ہے۔ مصنف نے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بہترین انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ ''میرا افسانہ'' اردو آپ بیتی کی روایت میں اچھا اضافہ ثابت ہوئی ہے۔

مابدولت

شوکت تھانوی کی تحریر کردہ آپ بیتی ''مابدولت'' کو پہلی دفعہ ۱۹۴۵ء میں، دوسری دفعہ پی۔آر۔ایس پریس لاہور سے ۱۹۴۶ء میں اور تیسری دفعہ ادارہ فروغ اُردو لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا گیا۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیمی سرگرمیاں، لکھنے لکھانے کا شوق اور ریڈیو کے حوالے سے اپنے شب و روز کا احوال بڑے منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔

نقش حیات

مولانا سید حسین احمد مدنی کی خودنوشت ۱۹۵۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی تحریر کرنے کی بنیادی وجہ کا بھی تذکرہ آغاز میں کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں مصنف نینی جیل میں قید کی زندگی گزار رہے تھے، تب چند احباب کے اصرار پر مولانا نے اپنی داستانِ حیات تحریر کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے حالات، واقعات اور مشاہدات کو تحریر کرنے کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے اقتدار کے عروج و زوال، انگریزوں کی مکر و فریب پر مشتمل پالیسیوں، تحریک حریت کے اسباب و اثرات، ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات، انقلابی تحریکوں کا جامع تذکرہ اور مسلمانانِ ہند کے مذہبی حالات کو مفصل انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔

قید فرنگ

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی آپ بیتی کو نیاز فتح پوری نے ۱۹۵۲ء میں شائع کروایا۔ آپ بیتی میں حسرت کی قید کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کا زندانی کلام بھی شامل ہے۔ حسرت موہانی کی آپ بیتی میں ان کی سیاسی جدوجہد، بے باکانہ صحافت اور اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ مصنف کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے اس دور کے مسلم رہنماؤں اور کارکنان نے کن کن مشکلات کا سامنا کیا۔

مشاہدات

ہوش بلگرامی کی تحریر کردہ آپ بیتی جو کہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے آپ بیتی میں حیدر آبادی تہذیب و ثقافت کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان، بچپن کے حالات و واقعات، ابتدائی تعلیم، مذہبی تعلیم، زندگی کے خوش گوار لمحات کا تذکرہ حقائق کی روشنی میں کیا ہے۔ مصنف نے ریاست حیدر آباد کی خصوصاً اور ہندوستان کی عمومی سیاسی و سماجی صورت حال کو مفصل انداز میں اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ نواب ہوش یار جنگ کی آپ بیتی کا پیش لفظ شری کے۔ ایم۔ منشی وزیر زراعت و اغذیہ حکومت ہند نے تحریر کیا تھا۔ آپ بیتی میں عنوانات کی فہرست میں جن امور کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے، ان میں اہم

''پیاراوطن''، میرا اسلامی مسلک''، ''میرا سیاسی مسلک''، ''میری زندگی کی اہم غلطیاں''، ''حیدرآباد دکن''، ''اثنائے راہ''، ''رام پور''، ''حیدرآباد دس سال کے بعد''، ''اور بار عثمانی''، ''انقلاب کا پس منظر''، ''بہ ہوش باش کہ ہنگام انقلاب آمد''، ''دکن کی ہستیاں''، ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے''، ''اِدھر اُدھر''، ''کچھ اہل قرابت''، ''دلدوز حقیقت''، ''میرا لائق علی فقرد ہو گئے''، ''دعوت نامہ''، ''نوید ناگہاں'' اور ''جون ۱۹۵۰ تک'' شامل ہیں۔

سرگزشت

عبدالمجید سالک کی آپ بیتی جسے مولانا چراغ حسن حسرتؔ کے کہنے پر لکھا گیا کو ۱۹۵۵ء میں قومی کتب خانہ لاہور سے شائع کروایا گیا۔ سالکؔ کی آپ بیتی میں اس دور کا سیاسی اور ادبی ہندوستان پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن میں علمی و ادبی ماحول سے فائدہ اُٹھایا۔ بچپن اور عالم شباب کے ذہنی رجحانات اور سماجی میلانات کا بھی تفصیلاً تذکرہ کیا گیا ہے۔ عبدالمجید سالکؔ کی زندگی کا زیادہ حصہ صحافت اور سیاست سے بھرپور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بدولت ایک سال تک جیل میں رہے۔ سالک کی آپ بیتی کا اگر مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ آپ بیتی برعظیم پاک و ہند اور خاص طور پر پنجاب کی سیاسی، ادبی اور مجلسی زندگی کی ایک اہم یادداشت ہے۔

ناقابلِ فراموش

اُردو آپ بیتیوں میں ایک اہم آپ بیتی دیوان سنگھ مفتون کی تحریر کردہ ہے۔ یہ آپ بیتی ۱۹۵۷ء میں دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ مصنف نے ۶۳۱ صفحات پر مشتمل اپنی داستانِ حیات کو تحریر کیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں مختلف شخصیات کی طرف سے آپ بیتی پر آراء شامل کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی کو بہترین خودنوشت قرار دیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی زندگی کے شب و روز میں پیش آنے والے مشاہدات اور واقعات کو بہترین انداز میں تحریر کیا ہے۔ مصنف نے جن موضوعات کو آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے، ان میں انگریزوں کی مکاری، ماں کی مامتا، صحافیانہ عوامل، ہندوستان کی سیاست، والیانِ ریاست کا طرزِ عمل، صحافتی مراسم اور ہندوستان کی سماجی حالت اہم ہیں۔

شاد کی کہانی، شاد کی زبانی

سید علی محمد شاد عظیم آبادی کی آپ بیتی جسے انہوں نے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے حوالے کر کے وصیت کر دی کہ اسے میرے مرنے کے بعد چھپوایا جائے۔ آپ نے اپنی آپ بیتی کا نام پہلے ''کمال عمر'' رکھا تھا لیکن بعد میں شادؔ کے شاگرد نے اسے موجودہ عنوان کے تحت ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے شائع کروایا۔ یہ آپ بیتی ۲۸۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے ایک سو سے کم صفحات میں بچپن اور جوانی کے حالات اور مخالفتوں کی یلغار کا ذکر کیا ہے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو

صفحات میں اپنی نثر و نظم کی خوبیوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ شاد نے اپنی آپ بیتی اپنی وفات سے پانچ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں مرتب کر لی تھی لیکن اس کی اشاعت ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

حدیث خودی

جگر بریلوی کی آپ بیتی ''حدیث خودی'' ۱۹۵۹ء میں شائع کی گئی۔ آپ بیتی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں مصنف کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات جبکہ دوسرے حصے میں مصنف کی شاعری کے حوالے سے اہم معلومات ملتی ہیں۔ آپ بیتی کے آغاز میں مصنف نے اپنے خاندان، گھریلو زندگی، ابتدائی تعلیم، جوانی کے خیالات اور احباب کا احوال قلم بند کیا ہے۔ مصنف نے اپنی شاعری کے محرکات، زندگی ک مصائب اور مشکلات کا تذکرہ آپ بیتی کے آخر میں کیا ہے۔

جہادِ زندگانی

مولوی فیروز الدین کی آپ بیتی جو کہ پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۹ء میں فیروز سنز نے شائع کی۔ یہ آپ بیتی بیسویں صدی کے برطانوی ہند کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مولوی صاحب نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں درسی کتب بھی شامل ہیں جو کہ بعد میں رفتہ رفتہ محکمہ تعلیم میں شامل تدریس ہونے لگیں۔ آپ کے ادارے نے ترجمہ قرآن، کشف المحجوب اور فیروز اللغات کو بھی شائع کروایا۔

علی پور کا ایلی

ممتاز مفتی کی آپ بیتی جو کہ ۱۹۶۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ ''علی پور کا ایلی'' میں مرکزی کردار الیاس عرف ایلی کا ہے جو کہ اصل میں مصنف کا اپنا کردار ہے۔ اس میں مصنف کی زندگی کے ابتدائی بیالیس سالوں کا احوال موجود ہے۔ آپ بیتی میں ممتاز مفتی نے اپنے دور کے سماجی، معاشی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور نفسیاتی عوامل کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سحر ہونے تک

آغا جانی کشمیری کی تحریر کردہ آپ بیتی جو کہ ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر آئی۔ مصنف نے اپنے دور کی سماجی زندگی کا شاندار نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے اپنی گھریلو زندگی، مشاعروں کا احوال، ادبی محافل کی منظر کشی کے ساتھ اس عہد کی مخصوص مذہبی ہم آہنگی اور وضع داری کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ بیتی میں انہوں نے فلمی شخصیات کے علاوہ لکھنؤ، بمبئی، کلکتہ اور رنگون میں گزرے ایام اور مختلف احباب سے ملاقاتوں کی داستان بھی رقم کی ہے۔ آپ بیتی کا آخری حصہ سفرنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مختلف ممالک میں پیش آنے والے واقعات کو دل نشین انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

میرے گزشتہ روز وشب

جگن ناتھ آزاد کی مختصر خودنوشت ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنف کی دیگر اہم تصانیف میں ''بیکراں''، ''ستاروں سے ذرّوں تک''، ''گجراتی رسم الخط''، ''اُردو (طویل نظم)''، ''جنوبی ہند میں دو ہفتے''، ''وطن میں اجنبی''، ''انتخاب آزاد''، ''ابوالکلام آزاد (مرثیہ)''، ''تلوک چند محروم (تالیف)''، ''ہندی رسم الخط میں''، ''نوائے پریشاں''، ''کہکشاں''، ''اقبال اور اس کا عہد'' اور ''ماتم نہرو'' شامل ہیں۔ مصنف اپنی خودنوشت کے آخری حصہ میں لاہور کی خوش گوار یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ آپ نے آپ بیتی میں بطور خاص یہ بات تحریر کی ہے کہ ان کی ماں بولی زبان پنجابی ہے لیکن ان کے لیے اُردو زبان بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ مصنف کے نزدیک اُردو زبان کی ترقی میں ہی قوم کی ترقی پوشیدہ تھی اور ہے۔ مصنف اُردو کی ادبی روایات کو قوم کے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں اور اُردو ادیب اور شاعر ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

میری دنیا

ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی ''میری دنیا'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے اپنی ذات سے زیادہ احباب و اساتذہ کی جانب توجہ کی ہے۔ ۴۹۶ صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی میں چھ ابواب ہیں۔ پہلے اور دوسرے باب میں مصنف نے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات، خاندان، احباب کا تذکرہ اور ملازمت سے لے کر ریٹائرمنٹ تک کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کے تیسرے اور چوتھے ابواب میں الہٰ آباد یونیورسٹی کے اساتذہ، مخصوص علمی ماحول اور شعبۂ اردو کے اہم اساتذہ کے خاکوں کو شامل کیا گیا ہے۔ پانچویں اور چھٹے ابواب میں یونیورسٹی کے شاگردوں کے تذکرے بیان کیے ہیں۔ الغرض یہ آپ بیتی اپنے دور کے سماجی حالات کی عکاس ہے۔

سرگزشت

معروف براڈکاسٹر سیّد ذوالفقار علی بخاری جنھوں نے ریڈیو کی دنیا میں زیڈ۔ اے بخاری کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کی تحریر کردہ آپ بیتی ''سرگزشت'' معارف لمیٹڈ کراچی سے ۱۹۶۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ آپ بیتی ۵۵/ابواب میں منقسم اور ۳۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندوستان کی سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی اور تاریخی و تہذیبی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ آپ بیتی برصغیر کی ریڈیو نشریات کی مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس میں براڈکاسٹنگ کی دنیا کے حالات و واقعات کو تفصیلی اور دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے واقعات کو درج کرنے کے لیے زمانی ترتیب کا بالکل خیال نہیں رکھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی زندگی مختلف قسم کے واقعات اور مشاہدات سے عبارت

ہے جو معاشرے میں موجود کسی شخص کو بالواسطہ یا بلاواسطہ پیش آتے رہتے ہیں۔ اب اس بات کا فیصلہ کون اور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ کون کون سے امور پہلے تحریر کرنے کے قابل ہیں اور کن حالات کو بعد میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا بہت حد تک بجا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک وہ کوئی تاریخ دان نہیں ہیں کہ وہ زمانی ترتیب کے اصول کی پیروی کریں۔ چونکہ مصنف کی زندگی میں ریڈیو سے تعلق ایک منجدھار کی سی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے انہوں نے آپ بیتی میں ریڈیو کی ملازمت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذوالفقار علی بخاری کی آپ بیتی ''سرگزشت'' بلاشبہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ جو عمدہ اسلوب بیان کے باعث قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں برصغیر اور انگلستان کے سیاسی و سماجی تناظرات کی منہ بولتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ آپ بیتی ہندوستان میں ریڈیو کی تاریخ پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بیتی ''سرگزشت'' کا مقابلہ اردو کی کسی بھی اعلیٰ پائے کی سیاسی و سماجی آپ بیتی سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، لیکن صد افسوس اسے پھر بھی ادبی حلقوں میں نظرانداز ہی کیا جاتا رہا ہے۔

بجنگ آمد

۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والی مقبول عام آپ بیتی جس میں کرنل محمد خان نے اپنی فوجی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ آپ بیتی میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے اہم سیاسی واقعات، انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک، دوسری جنگ عظیم کے حالات اور اپنے دوست احباب کے خاکوں کو بھرپور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کرنل محمد خاں ۵/اگست ۱۹۱۲ء میں ضلع چکوال کے ایک قصبہ میں چودھری امیر خان کے گھر میں پیدا ہوئے۔ چکوال اور کوہستان کے مضافاتی علاقوں میں مصنف کے مغل قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ عموماً یہ لوگ کھیتی باڑی کے پیشہ سے منسلک ہیں لیکن یہاں کے باشندوں کا شوق فوج میں خدمات سرانجام دینے کا ہے۔ مصنف کا تعلق مغلوں کے خاندان کی ایک شاخ ''مغل کسر'' سے ہے۔ محمد خان کی عمر چار سال تھی، جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا لیکن ان کی والدہ نے غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ کرنل محمد خان نے آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کے لیے پرلطف واقعات، الفاظ کے رد و بدل، کرداروں کی حرکات، واقعات کے تضاد و تقابل اور کہیں پہ مکمل تحریف نگاری سے کام لے کر اپنی فوجی زندگی کی داستان کو مزاح کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

یادوں کی دنیا

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی ۱۹۶۷ء میں ۲۷۴ صفحات اور کل آٹھ ابواب پر مشتمل شائع کی گئی۔ پہلے دو ابواب میں مصنف نے اپنے خاندان کے بارے میں اور گھریلو حالات کو بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کے تیسرے اور چوتھے ابواب میں مصنف کے ابتدائی حالات اور اپنے بڑے بھائی کا خاکہ بیان کیا ہے۔ پانچویں اور چھٹے ابواب میں بیرون ملک اعلیٰ تعلیم، فرانس، دوسرے یورپی ممالک کے ادبی، سیاسی اور معاشرتی حالات کو رقم کیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں ابواب میں حیدر آباد میں

جامعہ عثمانیہ میں بطور پروفیسر خدمات کا احوال، اہم شخصیات کے خاکے،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت وائس چانسلر کے خدمات کا تذکرہ اور دوست احباب کے بارے میں لکھا ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے تصورات، رجحانات اور تاثرات کی ایک مکمل دنیا پیش کی ہے۔

یادوں کی برات

جوشؔ ملیح آبادی کی آپ بیتی ۱۹۷۰ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع کیا گیا۔ جوشؔ ملیح آبادی ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو اتر پردیش ہندوستان کے مردم خیز علاقے ملیح آباد کے ایک علمی اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔آپ کا پورا نام شبیر حسین خان تھا۔تقسیم ہند کے چند برسوں بعد ہجرت کر کے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جوشؔ ملیح آبادی اردو ادب کے نامور اور قادر الکلام شاعر تھے۔آپ نہ صرف اپنی مادری زبان اردو میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ آپ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔اپنی انہی خداداد لسانی صلاحیتوں کے وصف آپ نے قومی اردو لغت کی ترتیب و تالیف میں بھرپور علمی معاونت کی۔نیز آپ نے انجمن ترقی اردو (کراچی) اور دارالترجمہ (حیدرآباد دکن) میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔آپ بیتی میں رجائیت پسندانہ سوچ ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں مایوسیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی جگہ کیف ونشاط کے ساتھ ساتھ محفل کی رونقیں، اودھ کی رنگینیاں اور دلفریبیاں پائی جاتی ہیں۔آپ بیتی میں ایک طرف دلچسپ حقائق کا بیان ہے تو دوسری طرف حقائق کے بیان اور صداقت کے تعین میں دشواری بھی پیش آتی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے چار بنیادی عناصر کو بیان کیا ہے۔شعر گوئی، عشق بازی، حصول علم اور انسان دوستی۔مصنف کی اس تحریر میں جابجا تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

لاہور کا جو ذکر کیا

گوپال متل کی سرگزشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' اپنے عنوان ہی سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں لاہور کی خوش گوار یادوں کو مصنف نے انتہائی نفاست اور دل کش اسلوب بیان میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔مصنف فکر سخن کے ساتھ ایک منجھے ہوئے ترجمہ نگار بھی تھے۔آپ کی تحریر کردہ آپ بیتی کی پہلی اشاعت ۱۹۷۱ء میں ہوئی، یہ مختصر خودنوشت ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔گوپال متل نے اپنی داستانِ حیات میں اپنی تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد ملازمت کے آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے حالات و واقعات، ادبی حلقوں کا احوال، ادیب حضرات سے میل ملاقات، مختلف ادبی رسالوں سے وابستگی کی تفصیلات اور ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کو مفصل انداز میں قلم بند کیا ہے۔آپ بیتی میں مصنف جن ادیب حضرات کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں ان میں کرشن چندر، منٹو، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، کنہیا لال کپور، ایم حسن

لطیفی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ، میراجی اور ڈاکٹر سید عبداللہ اہم ہیں۔

آشفتہ بیانی میری

رشید احمد صدیقی کی معروف آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے اپنے بچپن کے حالات، ابتدائی تعلیم، علی گڑھ یونیورسٹی میں گزرے ماہ و سال اور ادبی مذاکروں کا تذکرہ خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ آپ بیتی میں اس دور کی ادبی اور تہذیبی فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ علی گڑھ سے ان کی وابستگی والہانہ ہے چونکہ انہوں نے علی گڑھ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا اور اس کے ذرے ذرے سے ان کو محبت تھی۔ آپ بیتی کے آخر میں مثنویات سرسید، حالی، نذیر احمد اور شبلی نعمانی کی ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی رشید احمد صدیقی کی شخصیت، ذہنی وفکری میلانات ان کے عہد ماحول اور معاشرے کی آئینہ دار ہے۔ مصنف نے ہندو مسلم فسادات، مہاتما گاندھی سے ملاقات، تحریک آزادی کے محرکات، فرنگی سے نفرت کا اظہار، قومی تحریک سے وابستگی کے اثرات اور سیاسی مشاہدات کو بڑے اختصار سے بیان کیا ہے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا حسرت موہانی ہندوستان کی اقوام کے لیے مکمل آزادی کی قرارداد پاس کروانے کے لیے سرتوڑ مساعی کر رہے تھے جبکہ دوسری جانب گاندھی تشریف فرما تھے جو کہ انگریز حکومت کے زیر سایہ آزادی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

شورش کاشمیری کی آپ بیتی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک مکمل آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے آپ بیتی کے عناصر کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں ابتدائی حالات اور خاندان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں بعض مقامات پر واقعات کی تکرار بھی نظر آتی ہے لیکن یہ ایک آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے پرآشوب سیاسی حالات کی ایک مکمل تاریخ بھی ہے۔

جہانِ دانش

احسان دانش کی شہرہ آفاق آپ بیتی ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی ''جہانِ دانش'' کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے لیکن درحقیقت یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، ان میں پہلا حصہ جس میں انہوں نے اپنے آبائی وطن، ماحول، تعلیم، لڑکپن کے رجحانات، مختلف مشاغل، دوست احباب کا طرزِ عمل، اساتذہ کرام اور اپنی زندگی کی پہلی محبت شمّی کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ''عملی زندگی'' کا عنوان دے کر اپنی زندگی کے مصائب اور ملازمتوں کا احوال، والد کی علالت،

شعر و شاعری کا شوق، کاندھلے کا ادبی ماحول، شمعی سے ملاقاتوں کا احوال، شادی اور مخلص دوستوں کا تذکرہ شامل ہے۔ آپ بیتی کے تیسرے اور آخری حصہ جس کا عنوان مصنف نے ''ترکِ وطن'' تحریر کیا ہے۔ یہ حصہ ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جن اہم امور کا بیان ملتا ہے، ان میں ترکِ وطن، شورش کاشمیری، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں مزدوری، تلاشِ معاش، اردو پنجابی کا تقابلی احساس، شمعی کا آخری خط، منافقین کا رویہ، مشاعروں کے احوال، معاصرانہ چشمک، والد کا انتقال، تقسیم ملک کا ہنگامہ، قائداعظم کی رحلت اور قائد ملت کی شہادت کو بطور خاص آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔ یہ قیام پاکستان کے بعد چھپنے والی اہم آپ بیتی ہے۔ چونکہ مصنف ماہر تعلیم تھے اس لیے ان کی آپ بیتی میں تعلیم کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ مصنف نے اس آپ بیتی کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا تھا لیکن وہ اپنی زندگی میں صرف تین ابواب ہی لکھ سکے۔ اس آپ بیتی کا دوسرا حصہ ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے ''ذکر جمیل'' کے عنوان سے مکمل کیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اپنے دور کی سماجی صورت حال کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ اس زمانے کی مکمل تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس آپ بیتی کے بارے میں ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک نامکمل آپ بیتی ہے کیونکہ اگر مصنف کی زندگی وفا کرتی اور وہ خود اس کو مکمل کر پاتے تو یہ سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں کی ایک ناقابل فراموش آپ بیتی ہوتی۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس آپ بیتی کو بہترین اور معیاری آپ بیتی کہا جا سکتا ہے۔

آزادی کی چھاؤں میں

۱۹۷۴ء میں شائع کردہ انیس قدوائی کی آپ بیتی جسے خواتین کی آپ بیتیوں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ مکمل طور پر سیاسی و سماجی صورت حال پر مشتمل ہے۔ ''آزادی کی چھاؤں میں'' اس آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنے دور کے تعصبات اور سیاسی و سماجی منظرنامے پیش کیے ہیں۔ اس میں مصنفہ کے غم کی مکمل داستان ملتی ہے کہ کن حالات میں ان کے شوہر شہید ہوئے اور پھر آپ صبر و تحمل سے کام لے کر قوم کی امداد کرتی رہیں۔ اس میں تاریخ سیاست کے گرد چکر لگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں قیام پاکستان کی ابتدائی مشکلات کے تناظر میں ہمیں پر درد داستان ملتی ہے۔ جس کو پڑھنے سے دل میں نہ صرف نفرت کی آگ بھڑکتی ہے بلکہ ہم دردی کے جذبات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

مہ و سال آشنائی

۱۹۷۵ء میں فیض احمد فیض کی خودنوشت ''ماہ و سال آشنائی'' کے عنوان سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس آپ بیتی میں مصنف کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں روس کے قیام کے دوران مصنف نے اپنے مشاہدات اور تاثرات کو دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنے روز و شب کی داستان تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات کے احوال کو بھی خصوصی طور پر شامل کیا ہے۔

اپنی تلاش میں

کلیم الدین احمد کی پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء میں عظیم آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد پٹنہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور اُردو و فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ کلیم الدین احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی جبکہ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ ایم۔اے انگریزی کی تعلیم کے حصول کے لیے کیمبرج یونیورسٹی انگلستان روانہ ہو گئے۔ کیمبرج سے تعلیم مکمل کر کے مصنف پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے لگے تھے۔ مصنف آپ بیتی میں اُردو ادب سے فطری لگاؤ اور بچپن سے شعر و سخن کی طرف مائل ہونے کے بارے میں تفصیلی انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ مصنف اپنی داستانِ حیات میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کی سرگزشت میں ان کے عہد کے سیاسی و سماجی عوامل کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

دردِ دل کشا

شیخ منظور الٰہی کی تحریر کردہ آٹھ ابواب پر مشتمل آپ بیتی ''دردِ دل کشا'' ۱۹۷۵ء میں شائع کی گئی۔ پہلے باب کے عنوان ''اے گلستان اندلس'' میں مصنف نے اندلس کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ ''برگِ خزاں'' کے عنوان کے تحت باب میں یورپی ممالک کے سفر کے حالات کو درج کیا گیا ہے۔ ''قوسِ قزح سے فرار'' کے عنوان کے زیرِ اہتمام سویڈن، امریکہ، جاپان اور ہانگ کانگ کا احوال بیان کیا ہے۔ بنگال کے تاریخی، سیاسی و معاشی حالات کو آپ بیتی کے باب ''سونار ویش'' میں تحریر کیا گیا ہے۔ الغرض یہ آپ بیتی معلومات کا خزانہ ہے جس میں مختلف ممالک کے دلچسپ واقعات قلم بند ہیں۔

زرگزشت

مشتاق احمد یوسفی کی داستانِ حیات ۱۹۷۶ء میں شائع کی گئی۔ اس آپ بیتی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں قاری کو طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب بیان بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ منفرد انداز بیان کے ساتھ آپ بیتی میں ادبی چاشنی پیدا کرنے کے لیے مختلف حقیقی اور غیر حقیقی کرداروں کو اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ قاری کی دل چسپی کہیں بھی کم نہیں ہوتی بلکہ مزید بڑھتی جاتی ہے۔

رسیدی ٹکٹ

امرتا پریتم کی آپ بیتی "رسیدی ٹکٹ" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا حصہ ۱۹۷۶ء میں "رسیدی ٹکٹ" اور دوسرا حصہ "لال دھاگے کا رشتہ" کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ بعد میں "جنم جنم کی داستان" میں آپ بیتی کے دونوں حصوں کو شامل کر دیا گیا۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی پیدائش، خاندان کے حالات، اس دور کی تہذیب و تمدن، طرزِ فکر، طرزِ معاشرت، قدیم روایات کی پاسداری، اپنے جذبات کا برملا اظہار، اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کارِ جہاں دراز ہے

قرۃ العین کی آپ بیتی "کارِ جہاں دراز ہے" دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اوّل ۱۹۷۷ء اور جلد دوم ۱۹۷۹ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنفہ نے اپنی گھریلو زندگی، عادات و اطوار، خاندانی حالات و واقعات اور ادبی منظر نامے کو مفصل انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ مصنفہ نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی تاریخ، ان کی نقل مکانی اور ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے مراحل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کی جلد اوّل میں آپ نے اپنے خاندان کے پس منظر، والدین کے احباب اور جنگ آزادی کی مکمل داستان کو قلم بند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ آپ بیتی کی جلد دوم میں مصنفہ نے ہندوستان کی تقسیم، پاکستان ہجرت کے معاملات اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۶ء تک کے حالات سے قاری کو روشناس کروانے کی مساعی کی ہے۔ مصنفہ نے اپنی سرگزشت میں تحریر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز استاد کی ملازمت سے کیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد آپ پاکستان تشریف لائیں۔ آپ بیتی میں جہاں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی صورت حال کو تحریر کیا ہے اسی طرح آپ بیتی کی جلد دوم میں لندن کے قیام، ملازمت، موسیقی سیکھنے کے لیے میوزک سکول میں داخلہ اور لندن کی سماجی زندگی کے روز و شب کا احوال بھی آپ بیتی میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی عوامل کو اپنی سرگزشت میں الفاظ کی صورت میں سمو دیا ہے۔ آپ بیتی میں بیسویں صدی کی توہم پرستی اور قدامت پسندی کو بھی بطور خاص موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

آپ بیتی

عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت "آپ بیتی" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے آپ بیتی میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اور بعد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال، قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کے مسائل، حکومتوں کے جبر کی داستانیں، اردو زبان سے سوتیلوں جیسا سلوک اور تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے انحطاط کے مختلف اسباب و اثرات

شامل ہیں۔مصنف نے اپنی ذات سے جڑے ایسے حالات و واقعات کا بھی برملا اظہار آپ بیتی میں کیا ہے جنہیں عموماً آپ بیتیوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔آپ نے آپ بیتی تحریر کرتے ہوئے حقائق کو جوں کا توں بیان کرنے کی عملی سعی کی ہے۔مولانا کی آپ بیتی ۵۰/ابواب پر مشتمل ہے۔آخر میں حکیم عبدالقوی کی جانب سے مصنف کی وفات پر سات صفحات کو"حادثۂ وفات" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کے کلمات وصیت کو چار صفحات پر اختصار سے تحریر کر دیا گیا ہے۔مولانا نے آپ بیتی کا آغاز آباؤاجداد کے احوال، پیدائش، خانگی تعلیم سکول و کالج کی زندگی کے بعد ازدواجی زندگی، صحافت،تصنیف وتالیف، احباب اور مخالفین کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

مٹی کا دیا

اردو کی اہم آپ بیتیوں میں شمار کی جانے والی میرزا ادیب کی داستانِ حیات ۱۹۸۱ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس آپ بیتی کے کچھ حصے مختلف رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ان رسائل و جرائد میں "اُردو ڈائجسٹ"، "قومی ڈائجسٹ" اور "ماہ نو" اہم ہیں۔مصنف ۴/اپریل ۱۹۱۴ء کے دن محلہ ستھا، بھاٹی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔مصنف اپنے آباؤاجداد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ان کے دادا میرزا غلام حسین بڑے اثر و رسوخ کے مالک اور عالم فاضل تھے۔آپ کے دادا افغانستان کے شہر قندھار سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔آپ کے والد اندرونِ شہر درزی کا کام کرتے تھے۔آپ بیتی "مٹی کا دیا" اپنے دل کش اسلوب اور لسانی صفات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جیتی جاگتی تہذیب و ثقافت کی مکمل تصویر معلوم ہوتی ہے۔انھی خصوصیات کی بدولت میرزا ادیب کی یہ داستانِ حیات اردو آپ بیتیوں کی روایت میں ایک اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔مصنف آپ بیتی میں تاریخ اور سماج سے جڑے واقعات کو اپنے اندر سمو کر خود کو اظہار کا ایک نیا وسیلہ بناتا ہے۔

یادوں کا جشن

کنور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" ۱۹۸۳ء میں پاک اورینٹل پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام رئیس امروہی نے اسے شائع کیا۔آپ بیتی میں خاندان، آباؤاجداد کا تعارف، ابتدائی تعلیم، سرکاری ملازمت، مشاعروں کا احوال اور دوست احباب کے تذکرہ جات شامل ہیں۔مصنف نے اپنے دور کی کہانی میں طبقاتی تقسیم، عدم مساوات معاشی اور معاشرتی زوال کو جوں کا توں بیان کیا ہے۔آپ بیتی میں مصنف نے اپنے ہم عصر احباب کے دل کش انداز میں خاکے پیش کیے ہیں۔بیدی نے سیاسی حالات کو بھی مؤثر انداز میں آپ بیتی میں سمو دیا ہے۔

گرد راہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''گردِ راہ'' ۱۹۸۴ء میں مکتبہ افکار کراچی کے زیراہتمام چھپ کر اپنے قارئین تک پہنچی۔ آپ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ایک معروف افسانہ نگار، شاعر اور نقاد تھے۔ آپ بیتی بلاشبہ اشتراکی اور ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامے کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ آپ بیتی حرف آغاز کے بعد ۲۰ درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں مصنف لکھتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں علم کے حصول کے لیے اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر کلکتہ کی طرف عازمِ سفر ہوا۔ کلکتہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ اور پھر فرانس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے۔ مصنف اپنی عملی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے ۳۰ سال تعلیمی عملی مشاغل میں صرف ہوئے۔ اس کا دورانیہ ۱۹۴۲ء ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں شعبۂ تدریس سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء تک کا ہے، جب آپ یونیسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔

شام کی منڈیر سے

ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی ''شام کی منڈیر سے'' مکتبہ فکر و خیال کے زیراہتمام ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ آپ بیتی کو ۲۸۷ صفحات پر تحریر جبکہ اس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی سماجی اور ادبی زندگی کی تصویریں کھینچ کر ہمارے سامنے رکھ دی ہیں۔ آپ بیتی بلاشبہ اپنے دور کے مختلف عوامل کا بہترین انداز میں احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مصنف نے حالات و واقعات کو بڑے دلچسپ پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے جو کہ خاصے کی چیز ہے۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

شہرت بخاری کی آپ بیتی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' ۱۹۸۷ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ آپ بیتی ۴۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے آباؤاجداد، ابتدائی زندگی کے حالات، دوست احباب اور اساتذہ کے حالات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ شہرت بخاری نے اپنے عہد کی بہت سی شخصیات کے خاکے بھی آپ بیتی میں درج کیے ہیں۔ آپ بیتی میں لاہور کی تہذیبی زندگی کی رونق کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی نصف صدی میں رونما ہونے والی سیاسی تحریکوں اور سماجی تغیر کی تصویر ہے۔

شہاب نامہ

اُردو ادب کے نامور ادیب اور افسانہ نگار جن کی آپ بیتی نے معاشرے کے ہر عام اور خاص کو متاثر کیا۔ ۱۹۸۷ء میں ان کی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' شائع کی گئی جس کے اب تک بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ بیتی کے پہلے حصے

میں بچپن، تعلیم اور مصنف کی ابتدائی زندگی کے حالات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف کی سرکاری ملازمت اور دورانِ ملازمت پیش آنے والے اہم واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے بارے میں بھی مصنف نے اپنی آپ بیتی میں مشاہدات اور تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ آپ بیتی کے آخر میں مصنف نے روحانی تجربات کو بھی تحریر کیا ہے۔ یہ آپ بیتی بلاشبہ اپنے دور کی پوری داستان بیان کرتی ہے۔

ناممکن کی جستجو

حمید نسیم کی آپ بیتی ۱۹۹۰ء میں فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ ۶۲۸ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی مصنف کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے۔ ریڈیو کی معمولی ملازمت سے انہوں نے بہت جلد ترقی کی منازل طے کیں۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے دوران انہیں معروف فنکاروں سے ملنے کے بہت سے مواقع ملے۔ آپ بیتی میں بہت سے شعراء اور ادیب حضرات سے ملاقاتوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مصنف کو بسلسلہ ملازمت دنیا کے مختلف ممالک میں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ انہوں نے ان ممالک میں قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی زندگی کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی واقعات کے ساتھ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کو بھی تحریر کیا ہے۔

کاغذی ہے پیرہن

عصمت چغتائی کی آپ بیتی جو کہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات، مسائل، اپنے دلی جذبات اور احساسات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے بچپن کی داستان اور خاندانی حالات کو پیش کرنے میں بہت ہمت اور جرأت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اخلاقی، نفسیاتی، سیاسی اور سماجی صورت حال کو بیان کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ مصنفہ نے آپ بیتی میں اپنے مخصوص ادبی انداز سے گریز کیا ہے اور اپنی ذات کی جگہ اپنے ماحول کو مرکزی حیثیت دی ہے کہ کس طرح کے ماحول میں انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے دن گزارے۔ عصمت چغتائی باغیانہ مزاج لے کر اردو ادب میں وارد ہوئیں۔ ان کی پیدائش ایسے سماجی ماحول میں ہوئی جہاں عورتوں کو ہر لحاظ سے کمزور اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔ دراصل عورتوں کو مردوں کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے میں عورتوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب تھا اور سماج میں مرد تعلیم نسواں کے خلاف تھے لیکن عصمت چغتائی کو تعلیم کے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی کیونکہ ان کے والد تعلیم نسواں کے علمبرداروں میں سے تھے، ان کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ تھا اس بنا پر عصمت چغتائی کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تو مل گئی لیکن ان کی والدہ عصمت کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھیں۔ اس بارے میں انہیں بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑی آخر کار کامیاب ہوئیں۔

بری عورت کی کتھا

کشور ناہید کی داستانِ حیات ''بری عورت کی کتھا'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں ادبی پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے اشاعت پذیر ہوا جبکہ بعدازاں اس آپ بیتی کو ۱۹۹۷ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے بھی شائع کیا۔ مصنفہ کی تحریر کردہ آپ بیتیوں ''بری عورت کی کتھا'' اور ''شناسائیاں رسوائیاں'' میں ان کے بے باک اندازِ بیان کی بدولت خصوصی طور پر خواتین کی اُردو آپ بیتیوں میں انہوں نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے مخصوص پیرایہ اظہر کو اپنی تحریروں میں سموتے ہوئے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو اس طرح الفاظ کا روپ دیا ہے جس کی مثال ہمیں نسوانی آپ بیتیوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کشور ناہید نے آپ بیتی میں اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اہل مشرقی بنگال نے پاکستانیوں کی سیاسی بے انصافیوں اور سماجی طور پر ظلم وستم کو مردانہ وار برداشت کیا۔ حالانکہ پاکستان کا قیام نظریہ کی بنیاد پر تھا اور ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر اُبھرا تھا لیکن اہل اقتدار نے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی حق تلفی کے ساتھ ساتھ ان سے ناروا سلوک بھی جاری رکھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بغاوت اور آزاد ملک کے قیام کا مطالبہ کرنے پر ظلم و جبر کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مصنفہ نے اپنی داستانِ حیات میں دوسری جنگِ عظیم سے لے کر تحریکِ آزادی پاکستان، تقسیم ہندوستان، سانحہ مشرقی پاکستان، فوجی آمریت کے ادوار اور ان ادوار کے تناظر میں پیداشدہ سیاسی وسماجی صورت حال کو بھی اپنے تجزیات کے ساتھ مفصل نداز میں قلم بند کیا ہے۔ آپ بیتی میں درج مختلف قسم کے سیاسی و سماجی عوامل کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے آپ بیتی میں بہت سے سیاسی وسماجی حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ مصنفہ نے اپنی سرگزشت میں دوٹوک انداز میں مختلف سیاسی وسماجی عوامل کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی

اُردو ادب میں ایک منفرد پہچان کی حامل، معروف شاعرہ اداؔ جعفری ۲۲؍اگست ۱۹۲۴ء کو ہندوستان کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا پیدائشی نام عزیز جہاں رکھا گیا بعد میں آپ اداؔ جعفری کے نام سے اُردو ادب میں متعارف ہوئیں۔ آپ نے کم عمری سے ہی مشقِ سخن کا آغاز کیا اور اداؔ بدایونی کے نام سے فکرِ سخن میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ مصنفہ اختر شیرانی اور اثر لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت اپنی شاعری پر اصلاح لیا کرتی تھیں۔ آپ کے اہم شعری مجموعوں میں ''شہر درد''، ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' اور ''غزالاں تم تو واقف ہو'' شامل ہیں۔ آپ نے ۱۹۹۵ء میں اپنی داستانِ حیات ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے عنوان سے تحریر کی۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے اداؔ جعفری کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۱ء میں

آپ کو تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔ آدا جعفری کی آپ بیتی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں آپ بیتی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ان کا گہرا سیاسی و سماجی شعور بھی ہمیں پڑھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرگزشت میں بے لاگ تجزیات اور تبصرہ جات کے ذریعے قاری کو بھی ایک منفرد انداز سے سوچنے کی ترغیب دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے انیسویں صدی کی اہم ادبی، سیاسی و سماجی تحریکوں، تقسیم ہند کے اسباب، قیامِ پاکستان کے بعد پیدا شدہ مسائل، آمریت کے مختلف ادوار کے تناظر میں ملکی حالات، سیاسی حکمرانوں کا طرزِ عمل، سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب، پاکستان کے سیاسی افق پر غیر ملکی مداخلت کے اثرات اور مصنفہ کے مختلف ممالک کے اسفار کا مفصل احوال تحریر کر دیا ہے۔

اس آباد خرابے میں

اختر الایمان ضلع بجنور اتر پردیش میں ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں آپ کے والدین نے آپ کا نام راؤ فتح محمد رکھا تھا۔ آپ کا بچپن مختلف دیہات میں گزرا کیونکہ آپ کے والد مساجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس لیے کسی گاؤں میں چند سال گزارنے کے بعد کسی دوسرے گاؤں میں جا کر رہائش پذیر ہو جاتے تھے۔ مصنف اپنے بچپن کے دور کے بارے میں اپنی سرگزشت میں بیان کرتے ہیں کہ آپ اور آپ کے دوست مل کر دیہات کے قریبی باغات اور جنگلوں میں اکثر اوقات گھوما کرتے تھے۔ دور دراز دیہات میں جا کر میلوں اور عرسوں پر جا کر نوٹنکی بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ مصنف اپنی داستانِ حیات کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ''اس آباد خرابے'' میں وہی کچھ تحریر کیا ہے جو کہ جس طرح ان کی زندگی میں گزرا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی بتا دی ہے کہ آپ بیتی میں حالات و واقعات لکھنے میں آگے پیچھے ہو گئے ہیں، یعنی واقعات کی زمانی ترتیب کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس صورت حال کے ساتھ ساتھ مصنف اس بات کا بھی اقرار کر رہے ہیں کہ آپ بیتی میں بہت سے واقعات اور مشاہدات ایسے ہیں جو کہ انہوں نے اپنی سرگزشت کا حصہ نہیں بنائے۔ اسی طرح ان کی زندگی میں کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں جن کا تذکرہ کرنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔

جرمِ سیاست

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو کی آپ بیتی ۲۰۰۱ء میں احمد پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس آپ بیتی کے بعد میں اضافہ شدہ ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں۔ آپ بیتی کے تیسرے اضافہ شدہ ایڈیشن کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ میاں منظور احمد وٹو کی تحریر کردہ آپ بیتی پاکستانی سیاست کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ خود نوشت میں خاندانی پس منظر سے لے کر تعلیمی اور سیاسی زندگی کی تگ و دو کو بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں پاکستان کی سیاست کے نشیب و فراز کی کہانی کو ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی نظر سے دکھایا گیا ہے۔ مصنف

اپنی داستان حیات کو ایک منظم انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے قاری کے ذہن کی کئی سیاسی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک کامیاب سیاست دان کی تحریر کردہ کامیاب آپ بیتی ہے۔

تمنا بے تاب

آپ بیتی کے مصنف ڈاکٹر رشید امجد اردو ادب کے معروف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر مقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۶۰ء میں اپنی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق، تنقید اور افسانہ نگاری کو بھی کامیابی سے جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ آپ نامور اردو تحقیقی رسالوں ''دریافت'' اور ''تخلیقی ادب'' کے مدیر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ رشید امجد کی تحریر کردہ آپ بیتی جسے حرف اکادمی راولپنڈی نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ اس آپ بیتی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی مکمل آپ بیتی نہیں ہے بلکہ کچھ یادیں، خیالات اور تجزیات ہیں۔ جن میں ان کی زندگی اور ان کا گزرا ہوا دور دونوں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ان کے تاثرات بھی موجود ہیں جن کو انہوں نے بغیر تعصب اور مبالغہ آرائی کے جو کچھ دیکھا، جیسا دیکھا، سنا اور محسوس کیا قلم بند کرتے گئے۔ آپ بیتی میں زمانی ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ جو بات، واقعہ، قصہ، خیال اور تجربہ یاد آیا بیان کرتے گئے ہیں۔ رشید امجد نے ''تمنا بے تاب'' میں سیاسی ایوانوں کی ایماء پر ادبی اداروں کو یرغمال بنانے کے طرزِ عمل کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ آپ بیتی میں انہوں نے مارشل لاء کے چلن کے اہم منفی نوعیت کے پہلوؤں کو اپنے احساسات اور جذبات کے ساتھ مکمل صداقت سے پیش کیا ہے۔ پاکستان کے سیاسی نظام میں پائے جانے والی خامیوں کا تذکرہ بڑے تفصیلی انداز میں کیا ہے۔ رشید امجد کا آپ بیتی میں خصوصاً ملکی سیاسی معاملات کو بیان کرتے ہوئے انداز تجزیاتی رہا ہے۔ رشید امجد کی اس آپ بیتی میں انہوں نے پاکستان کو درپیش مسائل کو بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان مسائل کے حل کی طرف ہماری مکمل رہنمائی بھی کی ہے۔ آپ بیتی میں انہوں نے جہاں قیامِ پاکستان کے پہلے کے سیاسی و سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ قیام پاکستان کے بعد ملک کی سیاسی اور سماجی صورت حال کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔

میرا بچپن

عذرا عباس کی خودنوشت ''میرا بچپن'' کی اشاعت اوّل ۱۹۹۴ء جبکہ اشاعت دوم ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ ''میرا بچپن'' آپ بیتی کے علاوہ مصنفہ کی دوسری تصانیف میں ''میز پر رکھے ہاتھ''، ''راستے مجھے بلاتے ہیں''، ''حیرت کے اس پار'' اور ''میں اور موسیٰ'' شامل ہیں۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی بچپن کی یادداشتوں کو مفصل انداز میں تحریر کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے بچپن کی

یادوں کو ماضی کے دریچوں سے زمانہ حال میں بیان کیا ہے۔ قاری کو آپ بیتی کا مطالعہ کرتے ہوئے، یہی گمان ہوتا ہے گویا تمام واقعات لحہ موجود میں رونما ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مختصر آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کی بجائے حال کے صیغہ کو اپنے حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے برتا ہے۔ عذرا عباس کی خودنوشت ''میرا بچپن'' اکہتر صفحات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے اپنے بچپن کی اہم یادداشتوں کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ زیرِ نظر آپ بیتی بلاشبہ اپنے دور کی سماجی صورت حال کو بیان کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے بہت سے معاشرتی عوامل کو بہترین انداز میں اجاگر کرنے کی جسارت کی ہے۔ ان میں اہم تعلیم نسواں کی ضرورت، معاشرے کا استحصالی رویہ، خواتین پر سماجی قدغن اور غیر مساویہ اقدار کے خلاف واضح انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

بلاکم و کاست

مہدی علی صدیقی ۱۹۰۷ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ کی داستانِ حیات ''بلاکم و کاست'' ۲۰۰۲ء میں کراچی سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنف آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ ڈائری کبھی تحریر نہیں کی بلکہ وہ جو کچھ بھی اپنی سرگزشت میں تحریر کر چکے ہیں وہ انہوں نے اپنی ذاتی یادداشت کے بل بوتے پر کیا ہے۔ مصنف آپ بیتی کے آغاز میں اپنے خاندان کے پس منظر کے بارے میں اور اپنے بچپن کے حالات و واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ کے والد بہت مہمان نواز انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں اکثر مہمان قیام کرتے تھے اور کئی عہدے دار جو کہ قلیل مدت کے لیے حکومت وقت کی طرف سے اورنگ آباد تعینات کیے جاتے تھے، مصنف کے مکان میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ مصنف نے آپ بیتی میں سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات کے خاکوں کو بھی بطور خاص شامل کیا ہے۔ مہدی علی صدیقی کی داستانِ حیات ''بلاکم و کاست'' بیسویں صدی کی ایک مکمل تاریخ ہے، جس میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کو مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ آپ بیتی اُردو ادب کی آپ بیتیوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ آپ بیتی نہ صرف سماجی زندگی کی عکاس ہے بلکہ اپنے دور کی سیاسی صورت حال کو بھی واضح کرتی ہے۔

اپنا گریباں چاک

جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی اہم اردو تصانیف میں ''مئے لالہ فام''، ''زندہ رُود''، ''افکارِ اقبال''، ''جہانِ جاوید''، ''خطبات اقبال'' اور ان کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں۔ جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' کے عنوان سے تحریر کی گئی ۳۰۱ صفحات پر مشتمل ۲۰ ابواب میں منقسم اس آپ بیتی کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۲ء میں پہلی دفعہ شائع کیا۔ ۲۰۰۲ء کے بعد سے اس آپ بیتی کے کئی

ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ بیتی کے تمام ابواب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر باب میں مصنف نے عنوان کے مطابق سیر حاصل تفصیلات کو بے باک انداز میں سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چاہے وہ ملکی سیاسی صورت حال ہو یا بین الاقوامی سیاست انہوں نے اپنے بے لاگ تاثرات کو برملا تحریر کیا ہے۔ قومی اور انٹرنیشنل سیاسی معاملات کو مصنف نے انتہائی باریک بینی سے پیش کیا ہے اسی طرح انہوں نے ملک کے سماجی عوامل کو بھی بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

نشانِ جگر سوختہ

ڈاکٹر سلیم اختر کی داستان حیات جو کہ ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔ ابتدائی زندگی کے حالات لکھنے کے بعد آپ نے بتایا کہ راولپنڈی سے بی۔اے کیا اور لاہور میں لائبریری سائنس کا شعبہ اختیار کیا۔ آپ کو مختلف لائبریریوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دور کی یادوں کو بڑی تفصیل سے مصنف نے آپ بیتی میں جگہ دی ہے۔ اس کے بعد ازدواجی زندگی کا آغاز، لیکچرار کی ملازمت، علمی و ادبی مصروفیات، ملتان سے گورنمنٹ کالج لاہور تک کی روداد، گورنمنٹ کالج سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی تک کے مراحل اپنے تدریسی تجربات اور حالات کو مفصل انداز میں قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے آپ بیتی میں جن اہم ادبی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قتیل شفائی، مشفق خواجہ، انتظار حسین، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، محسن نقوی اور اصغر ندیم سید شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے دور کے اہم سیاسی اور ملکی حالات کو آپ بیتی میں بطور خاص جگہ دی ہے۔

شناسائیاں رسوائیاں

اُردو ادب کی نامور شاعرہ، کالم نگار اور ترجمہ نگار کشور ناہید کی تحریر کردہ دوسری آپ بیتی ''شناسائیاں رسوائیاں'' ہے۔ یہ آپ بیتی ۳۵ / ابواب میں منقسم، ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ۲۰۰۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی میں جن نامور ادبی، صحافتی، مذہبی، سرکاری وغیر سرکاری، سیاسی اور سماجی شخصیات کا مصنفہ سے میل ملاپ رہا ان کے بارے میں تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے ابواب میں جن شخصیات کے بارے میں لکھا گیا ہے ان میں صوفی تبسم، فیض احمد فیض، ایم اسلم، امتیاز علی تاج، عطا اللہ شاہ بخاری، نور جہاں، شاکر علی، قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، احمد فراز، حبیب جالب، یوسف کامران، علی امام، افتخار عارف، نیاز احمد، ساقی فاروقی اور سید سبط حسن شامل ہیں۔ آپ بیتی ''شناسائیاں، رسوائیاں'' میں جہاں سیاسی و سماجی صورت حال کا بیان جا بجا ملتا ہے وہاں بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز کا ادبی منظر نامہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ آپ بیتی پاکستان کی سیاست، سماج سے جڑی اقدار اور ادبی ماحول کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہے۔

جالب بیتی

حبیب جالب ۱۹۲۸ء میں ضلع ہوشیار پور کے گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ تھا، جو کہ اچھا علمی ذوق رکھنے کی بدولت کتاب ''گلہائے عقیدت'' کے مصنف تھے جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے واقعات، اہل علم وفضل بزرگ شخصیات کے حالات اور اپنے خاندان کے بارے میں مفید معلومات قلم بند کی ہوئی تھیں۔ حبیب جالب کی تحریر کردہ آپ بیتی ۲۰۱۳ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ یہ آپ بیتی تیئس ابواب اور ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''جالب بیتی'' میں مصنف نے اپنے دور کی اہم سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجزیات کا تفصیلی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف نے مختلف ممالک میں قیام کے دوران اپنے مشاہدات کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ حبیب جالب کی سرگزشت ایک ادبی شخصیت یا شاعر کی خودنوشت ہی نہیں بلکہ اس میں ان کی پاکستان میں حقیقی جمہوریت کے خواب کو پورا کرنے کے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی مصائب و آلام سے بھرپور داستان بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ ناساعد حالات میں انہوں نے اپنے نظریات اور اصولوں کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا تھا۔ حبیب جالب اصولوں پر مبنی حقیقی جمہوریت کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کو مصنف کی خودنوشت پڑھتے ہوئے ان کے سیاسی معاملات پر بے لاگ تجزیات جابجا ملتے ہیں۔

ہاں میں باغی ہوں

جاوید ہاشمی کی تحریر کردہ آپ بیتی ''ہاں! میں باغی ہوں'' ۲۰۱۳ء میں ساگر پبلشرز لاہور کے زیرِاہتمام شائع کی گئی۔ آپ بیتی ۱۳/ابواب میں منقسم ہے اور ۴۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی کے پہلے باب کا عنوان ''مخدوم رشید'' ہے۔ جس میں مصنف نے جن امور پر قلم فرسائی کی ہے ان میں سب سے پہلے مصنف نے اپنے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔ سابق وزیر صحت، مسلم لیگ ن کے قائم مقام صدر، ملتان کے ایک گاؤں مخدوم رشید میں جولائی ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔اے پولیٹکل سائنس کرنے کے بعد ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ مخدوم جاوید ہاشمی زمانہ طالبعلمی میں جماعت اسلامی کی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم رکن رہے اور ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی و سماجی تاریخ کی ایک مکمل داستان پڑھنے کو ملتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی عملی سیاست کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور اثرات، پاکستان میں مارشل لاء کے ادوار کے دوران سیاسی جدوجہد اور جمہوریت کے احوال کو موثر انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔

عاشقی صبر طلب

''تمنا بے تاب'' کے بعد رشید امجد کی دوسری آپ بیتی ''عاشقی صبر طلب'' کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۵ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا۔ سانجھ پبلی کیشنز کے اس پہلے ایڈیشن کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں ''تمنا بے تاب'' جو کہ پہلی بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی بعد میں اس کے دو مزید ایڈیشن ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکے تھے اس کو ''عاشقی صبر طلب'' آپ بیتی کے آغاز میں صفحہ نمبر ۱۲ سے صفحہ نمبر ۳۱۴ تک تحریر کر کے اس آپ بیتی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ رشید امجد کی آپ بیتی ''عاشقی صبر طلب'' میں پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کا مثالی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے ابتداء میں انہوں نے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کے کردار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کے بغیر کوئی ملک اقوام عالم میں ترقی کے خواب کی تعبیر حاصل نہیں کر سکتا۔ پاکستان کا شاید یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاداب، سید، خودنوشت نگاری.....تعریف، تشریح و توضیح، مشمولہ: پرواز، جلد ۷، ماہنامہ (صابر ارشاد عثمانی): برطانیہ: یونین اُردو رائٹر سوسائٹی، ۱۱ فروری، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۷

۲۔ ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۲۶

۳۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۰

۴۔ وہاج الدین، ڈاکٹر، اُردو خودنوشت: فن و تجزیہ، نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۱

۵۔ محمد طفیل، تصریحات، مشمولہ: نقوش، جلد اول، آپ بیتی نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۵

۶۔ عبدالمجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں، مشمولہ: سہ ماہی، الزبیر، شمارہ نمبر ۷، آپ بیتی نمبر، (مسعود شہاب)، بہاولپور: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص: ۲۹

۷۔ وہاج الدین، ڈاکٹر، اردو خودنوشت فن و تجزیہ، ص ۱۶۲

۸۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، اُردو میں سوانح نگاری، کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء، ص: ۷۸

۹۔ انصاری، یوسف جمال، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوش، جلد اول، آپ بیتی نمبر، (محمد طفیل)، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۸۰

۱۰۔ عبدالمجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں، مشمولہ: سہ ماہی، الزبیر، شمارہ نمبر ۷، آپ بیتی نمبر (مسعود شہاب)، بہاولپور: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۰

۱۱۔ وہاج الدین، ڈاکٹر، اردو نوشت فن و تجزیہ، ص: ۲۱

۱۲۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادی احوال و آثار، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۳ء، ص: ۴۵۳

۱۳۔ انصاری، یوسف جمال، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوش، جلد اول، آپ بیتی نمبر (محمد طفیل)، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۷۵

۱۴۔ ایضاً، ص: ۷۳

۱۵۔ ایضاً، ص: ۷۴

۱۶۔ ایضاً، ص: ۷۰

۱۷۔ ریحانہ خانم، آپ بیتی کیا ہے؟، مشمولہ: نقوش، جلد اوّل، آپ بیتی نمبر، (محمد طفیل)، لاہور: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۰

۱۸۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء، ص: ۶۶

۱۹۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، ص:۶۷

۲۰۔ روسو، ژاں ژاک، اعترافات، مترجم: امجد علی بھٹی، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء، ص:۸

۲۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۳۵۹

۲۲۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، مشمولہ: خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۱۲۹، پٹنہ: جولائی ۲۰۰۲ء، ص:۱۱۳

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۱۴

۲۴۔ سالک، علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ: نقوش، جلد اوّل، آپ بیتی نمبر، (محمد طفیل)، لاہور: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۶۴ء، ص:۵۴

۲۵۔ ایضاً، ص:۵۳

۲۶۔ صدیقی، محمد اکرم، قید یاغستان، لاہور: محمد عزیز الرحمان، ۱۹۷۰ء، ص:۲۸۷

۲۷۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، مشمولہ: خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۱۲۹، پٹنہ: جولائی ۲۰۰۲ء، ص:۱۱۵

باب دوم

اُردو کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ (۲۰۰۰ء تک)

باب دوم

اُردو کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ (۲۰۰۰ء تک)

اُردو آپ بیتیوں کو ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں زیادہ اہم ادبی وفکری آپ بیتیاں، افسانوی آپ بیتیاں، تاریخی آپ بیتیاں، مذہبی آپ بیتیاں اور سیاسی وسماجی آپ بیتیاں شامل ہیں۔

تحقیقی مقالہ میں راقم یہاں آپ بیتیوں کی سب سے اہم قسم یعنی سیاسی وسماجی آپ بیتیوں کو زیر بحث لانا چاہتا ہے۔ سیاسی وسماجی آپ بیتیوں میں مصنف اپنی زندگی کے سیاسی اور سماجی حالات کو تحریر کرتا ہے۔ اس طرح کی آپ بیتیاں انتہائی دلچسپ قرار دی گئی ہیں کیونکہ ان میں مصنف اپنے خاندانی حالات، بچپن، گھریلو ماحول، تعلیم کو اختصار سے بیان کرنے کے بعد اپنے دور کے اہم سیاسی رجحانات اور سماجی اقدار کو زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عالمی ادب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو آپ بیتیوں میں سب سے زیادہ مقبول آپ بیتیاں سیاسی وسماجی آپ بیتیاں ہیں، جیسا کہ ہٹلر، سارتر اور مسولینی کی آپ بیتیاں بہت مشہور ہیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو سیاسی اور سماجی آپ بیتیاں ایسی آپ بیتیاں ہوتی ہیں جن میں مصنف اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات کو خارجی اور باطنی پہلوؤں سے تجزیہ کرتا ہے اور اس کی ذات، اس کا اپنا وجود مکمل انداز میں نمایاں نظر آتا ہے۔

اُردو کی اہم سیاسی وسماجی آپ بیتیوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب (کالا پانی)''، جگن ناتھ آزاد کی ''میرے گزشتہ روز و شب''، ذوالفقار علی بخاری کی ''سرگزشت''، کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد''، جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ''یادوں کی برات''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں''، کلیم الدین احمد کی آپ بیتی ''اپنی تلاش میں''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، قدرت اللہ شہاب کی داستان حیات ''شہاب نامہ''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' اور اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

”تواریخِ عجیب“ (کالا پانی) از مولانا محمد جعفر تھانیسری

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی داستانِ حیات ”تواریخِ عجیب“ ہے جو کہ بعد میں ”کالا پانی“ کے عنوان سے بہت مشہور ہوئی۔ یہ آپ بیتی ۱۸۸۵ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس سرگزشت میں انگریز حکومت کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدینِ آزادی کا احوال، جزائر انڈیمان کے حالات اور ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی صورت حال کو واضح کیا گیا ہے۔ آپ بیتی ”تواریخِ عجیب“ کی ایک نہایت اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ اسے اُردو ادب کی اوّلین آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی خودنوشت کا آغاز ”معرکہ امبیلا“ کے عنوان سے ہوتا ہے۔ انگریز حکومت کی بے جا مداخلت اور زور زبردستی کی بناء پر ۱۸۶۳ء میں ہندوستان کی مغربی سرحد پر افغان قبائلیوں کے ساتھ زبردست جنگ کی شروعات ہوگئی تھی۔ جنرل چیمبرلین اس جنگ میں فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ مجاہدین کی مکمل امداد مقامی قبائل نے کی اور ہر لحاظ سے مرد و خواتین انگریز فوج کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ تین ماہ تک انگریز فوج کے ساتھ جنگی جھڑپیں جاری رہیں اور سات ہزار کے قریب افراد اس جنگ میں کام آئے۔ جنگ کے دوران ضلع کرنال کی چوکی کے پولیس سوار غزن خان نے مخبری کی اور ڈپٹی کمشنر کرنال کو اطلاع دی کہ محمد جعفر مجاہدین کے ہر لحاظ سے امداد بہم پہنچا رہا ہے۔ اس اطلاع پر مصنف کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ جاری کروائے گئے، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس انبالہ کپتان پارسن نے فوری طور پر آپ کے مکان کی تلاشی لی اور آپ کے محرری کے کام پر معمور منشی عبدالغفور کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔ پولیس نے مصنف کو گرفتار نہیں کیا تھا لیکن آپ کے پیچھے مخبر لگا دیے گئے تھے۔

مصنف نے حالات کے پیشِ نظر راہ فرار ہی کو مقدم جانا اور پانی پت سے دہلی کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ دوسرے دن آپ کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کر دیے گئے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مصنف کے فرار ہو جانے پر بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ سخت مار پیٹ کی وجہ سے آپ کے چھوٹے بھائی نے پولیس کو بتا دیا کہ مصنف پانی پت سے دہلی روانہ ہوئے تھے۔ مصنف کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو آپ دہلی سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے مگر علی گڑھ پہنچتے ہی پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا اور آپ کو حوالات میں پھانسی گھر کی تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ دوسرے روز آپ کو پولیس کی تحویل میں علی گڑھ سے دہلی پولیس کے بنگلے کے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا، اگلے دن آپ کو دہلی سے سخت پولیس پہرے میں انبالہ کی جیل میں پھانسی گھر میں منتقل کر دیا گیا۔

دورانِ حراست آپ پر بہت زیادہ تشدد کیا جاتا رہا۔ تاکہ آپ اپنے معاونین جہاد کے نام بتا دیں لیکن آپ ثابت قدم رہے۔ اس دوران پشاور سے بنگال تک ان گنت صاحبِ حیثیت مسلمانوں کو پوچھ گچھ کے نام پر گرفتار کیا جاتا رہا اور بھاری

رشوت وصول کر کے بعد میں رہا کر دیا جاتا، بہت سے مسلمان جو رشوت دینے کے قابل نہیں تھے، انہیں ڈرا کر گواہی دینے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ دس سال تک مسلمانوں کے ساتھ یہ ظلم جاری و ساری رہا۔ مخبری کرنے والے خوشامدیوں کو انگریز حکومت نے انعام و اکرام سے خوب نوازا۔ جنرل چیمبر لین کی اچانک موت کے بعد مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ اور جھوٹے گواہوں کے بیان پر ظلم و زیادتی کا سلسلہ کچھ کم ہوا۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری اور آپ کے ساتھیوں کو پانچ ماہ سخت قید میں رکھنے کے بعد مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کا آغاز کیا گیا۔ انبالہ کے مجسٹریٹ کے روبرو مصنف کو پیش کیا گیا، آپ کے خلاف بہت سے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر گواہ بنا لیا گیا۔ ان گواہوں کو آئندہ گواہی دینے کے لیے پولیس کی نگرانی میں حوالات میں رکھا جاتا تھا۔ سات ایام تک سماعت کے بعد یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک سیشن کورٹ میں سماعت کے بعد ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھانسی کی سزا، تمام جائیداد ضبط اور سزا کے بعد لاش ورثاء کے حوالے کرنے کی بجائے جیل کے قبرستان میں گاڑ دیئے جانے کا حکم سنایا گیا۔ تین ماہ تک آپ کو جیل کے پھانسی گھر میں قید رکھنے کے بعد نیا حکم سنایا گیا:

> "ہماری پیش گوئی کے مطابق ۱۶ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کی سزا کو بہت محبوب سمجھتے ہو اور اسے شہادت تصور کرتے ہو اس لیے حکومت تمہیں تمہاری پسندیدہ سزا دینے کے لیے تیار نہیں لہٰذا تمہاری پھانسی کی یہ سزا حبس دوام بعبور دریائے شور سے بدلی جاتی ہے۔"(۱)

مصنف کی پھانسی کی سزا کو حبس دوام کی سزا میں اس لیے بدل دیا گیا کیونکہ حکومت ان مسلمان مجاہدین کو ان کی من چاہی سزا پھانسی نہیں دینا چاہتی تھی۔ انبالہ جیل میں مصنف کو کالے پانی یعنی جزائر انڈیمان بھیجنے سے پہلے ایک دفعہ اہل و عیال سے ملاقات کروانے کا بندوبست کیا گیا۔ ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو قیدیوں کے ہمراہ آپ کو انبالہ جیل سے لاہور سینٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو لاہور سے کراچی جیل منتقل کر دیا گیا۔ چند روز کے بعد آپ کو بمبئی جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد آپ کو تھانہ جیل جو کہ مرہٹہ دور اقتدار میں ایک مضبوط قلعہ تھا، جس کے اطراف میں گہری خندقیں کھودی گئی تھیں، یہاں آپ کو سخت قید میں رکھا گیا۔ بالآخر جمنا جہاز کے ذریعے ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ کو جزائر انڈیمان میں سزا کے لیے بھیج دیا گیا۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری اپنی آپ بیتی میں جہاں قید کی صعوبتوں کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں مختلف جیل خانہ جات کے افسران اور قیدیوں کا احوال بھی قلم بند کرتے جاتے ہیں۔ مصنف اپنی سرگزشت میں جزائر انڈیمان کی سماجی اور جغرافیائی

صورت حال کو بھی مفصل انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ انڈیمان دراصل ایک ہزار چھوٹے بڑے جزائر اور ۴۶ ۱۷ میل کے رقبہ کا حامل ہے۔ ماہرین ارضیات کی تحقیق کے مطابق یہ جزائر قدیم تاریخ میں براعظم ایشیاء ہی کا حصہ تھے لیکن بعد میں یہ جزائر ایشیاء سے الگ ہو کر ہزاروں جزائر میں تقسیم ہو گئے تھے۔ یہاں پر سب سے اونچی پہاڑی کا نام ''مونٹ ہریٹ'' ہے جو کہ سطح سمندر سے ۱۱۱۶ فٹ بلند ہے۔ پورٹ بلیر کے علاقے میں ایک گندھک کا پہاڑ موجود ہے جس میں سے ہر لمحہ آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ ان جزائر کے جنگلات میں آم، املی، جامن اور دوسرے پھل دار درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں انواع واقسام کی سبزیاں وافر ہیں۔

ان جزائر کی آب و ہوا سارا سال معتدل رہتی ہے اور موسموں کی شدت بہت کم ہوتی ہے۔ خط استوا سے قربت کی بناء پر بارشیں سارا سال ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں کے مقامی باشندے وحشی قبائل میں منقسم ہیں اور ان کی بارہ مختلف زبانیں ہیں۔ قبائل کے لوگوں کے قد درمیانے اور شکل و شباہت حبشیوں جیسی ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ خدا کے خالق ہونے کے قائل ہیں لیکن یہ کسی مذہب کی پیروی نہیں کرتے۔ قبائل کے جنگلی لوگ ہمیشہ سے برہنہ ہی رہتے ہیں لیکن ان کی خواتین اندام نہانی کو کپڑے سے ڈھانپے رکھتی ہیں۔

جزائر انڈیمان کے سماجی حالات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ یہاں شادیاں بہت سادہ انداز میں کی جاتی ہیں، شادی کے موقع پر دولہا اور دولہن کے جسم پر چربی مل دی جاتی ہے۔ شادی پر قبیلے کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور قبیلے کا معتبر شخص دولہا کو اُٹھا کر دولہن کے پاس بٹھا دیتا ہے اور دولہا کو بہت سے تیر اور کمان بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔ خواتین کو بچوں کی پیدائش کے وقت پردے میں نہیں لے جایا جاتا بلکہ مردوں کے سامنے ہی مائیں اپنے بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ ان لوگوں کے گھر انتہائی سادہ ہوتے ہیں۔ ان کی اصل متاع تیر اور کمان ہوتے ہیں۔ جزائر کے قبائلی لوگ اپنے آباؤاجداد سے محبت کے اظہار کے لیے ان کی کھوپڑیاں اور مختلف اعضاء کی ہڈیاں اپنے پاس ہر وقت رکھتے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی فوت ہو جائے تو یہ لوگ مردے کو درخت کے چھال میں مضبوطی سے باندھ کر قبر میں گاڑھ کر آگ جلاتے ہیں، دو ماہ کے عرصہ کے بعد مردے کو قبر سے نکال کر اس کی ہڈیوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ غوطہ زنی، تیراندازی اور کشتی رانی کے ماہر ہوتے ہیں۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے جزائر انڈیمان میں دو شادیاں کیں۔ یہاں پہلی بیوی کے بطن سے اولاد نہ ہوئی اور بیوی کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئی۔ جبکہ دوسری بیوی سے آپ کے دس بچے پیدا ہوئے جن میں سے دو انتقال کر گئے تھے۔ مولانا کو بالآخر ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو لارڈ رپن کی ترحمانہ پالیسی کے سبب رہا کر دیا گیا اور آپ اٹھارہ برس جزائر انڈیمان میں قیام کے بعد

وطن واپس لوٹے۔ مصنف مع اہل و عیال انڈیمان سے کلکتہ اور یہاں سے انبالہ پہنچے۔ آپ بیتی کے آخر میں مصنف خود پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کا مجھ پر سب سے بڑا کرم یہ ہے کہ تاریخ قید سے لے کر آج تک میں جہاں اور جس جگہ رہا اس نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا۔ بیس برس میں ایک دن بھی مشقت کرنے کی نوبت نہ آنے دی۔ کالا پانی پہنچنے سے پہلے ہی اس نے میری راحت کے سامان فراہم کر دیئے تھے۔''(۲)

مصنف آپ بیتی کے اختتامی صفحات پر بیان کرتے ہیں کہ وہ جب انبالہ شہر میں کچہری کے پاس سے گزرتے ہیں تو ان کے دل میں اکثر خیال آتا ہے کہ یہاں ان کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا، جہاں ڈیڑھ برس تک پابند سلاسل رکھا گیا تھا، اسی شہر میں انہیں معزز اور ممتاز شخصیت کی حیثیت سے دوبارہ آنے کا موقع اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔

آپ بیتی کو مصنف نے بڑے دل کش اور سادہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ مولانا نے اپنی داستانِ حیات کو اختصار اور صداقت سے بیان کیا ہے۔ قاری اس خودنوشت کو پڑھتے ہوئے حالات و واقعات میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ وہ اس کو ایک ہی نشست میں مکمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُردو کی اوّلین آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد سرگزشت کی بھی خاصیت رکھتی ہے۔ اس آپ بیتی کے بارے میں علم الدین سالک بیان کرتے ہیں:

> ''سب سے پہلی آپ بیتی جو اُردو زبان میں لکھی گئی وہ جعفر کی ''کالا پانی'' ہے۔''(۳)

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی اس دل سوز تحریر میں ان کی زندگی کے بیس سالہ قید فرنگ کے واقعات اور مشاہدات کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی کو روزمرہ کی عام بول چال کی زبان اور دوسرے لوگوں کے اقوال کو من و عن نقل کیا ہے۔ یہ خودنوشت بلاشبہ اپنے عہد کی مذہبی سیاسی اور سماجی صورت حال کی ایک مستند تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

''میرے گزشتہ روز وشب'' از جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد کی مختصر خودنوشت ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنف کی دیگر اہم تصانیف میں ''بیکراں''، ''ستاروں سے ذرّوں تک''، ''گجراتی رسم الخط''، ''اُردو (طویل نظم)''، ''جنوبی ہند میں دو ہفتے''، ''وطن میں اجنبی''، ''انتخاب آزاد''، ''ابوالکلام آزاد (مرثیہ)''، ''تلوک چند محروم (تالیف)''، ''ہندی رسم الخط میں''، ''نوائے پریشاں''، ''کہکشاں''، ''اقبال اور اس کا عہد'' اور ''ماتم نہرو'' شامل ہیں۔

جگن ناتھ آزاد مغربی پنجاب کے شہر عیسیٰ خیل میں ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک تھے۔ مصنف کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہی ہوا لیکن جب آپ پانچ برس کے ہوئے تو آپ کے والد نے ''دیوانِ غالبؔ'' سے ایک غزل سن کر آپ سے کہا کہ وہ سکول میں داخل ہونے کا امتحان پاس کر چکے ہیں، لہٰذا مصنف کو کلورکوٹ کے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ان دنوں آپ کے والد کا تبادلہ بھی کلورکوٹ ہی ہو چکا تھا۔ اس سکول کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں باقاعدگی سے ادبی جلسے ہوا کرتے تھے۔ اس میں طلباء اُردو اور انگریزی کی نظمیں یاد کر کے سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اسی قسم کا ایک جلسہ میانوالی میں منعقد کروایا گیا جس کی صدارت ولسن نام کے انگریز کر رہے تھے۔ مصنف نے اس جلسے میں خوشی محمد ناظر کی نظم ''جوگی'' سنائی تھی جس کا خوب چرچا ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کے والد مشاعرے میں شرکت کے لیے بھیرہ روانہ ہوئے تو ساتھ مصنف کو بھی لے گئے۔ یہ آپ کی زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے میں مشہور شعراء کرام میں سے آپ کو حفیظ جالندھری کا نام یاد رہا۔ وہاں آپ کے والد نے بھی اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ کسی شاعر نے مصنف سے اپنے والد کی نظم ''ہندو مسلمان'' سنانے کی فرمائش کی تو آپ نے مکمل نظم سنا دی جس پر آپ کو انعام میں لنگی دی گئی تھی۔ مصنف نے آٹھویں جماعت تک تعلیم کلورکوٹ میں حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کو میانوالی کے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی پر آپ کو ڈی۔اے۔وی کالج راولپنڈی میں داخلہ مل گیا۔ بعد میں آپ کے والد نے بھی راولپنڈی تبادلہ کروا لیا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ عبدالحمید عدم سے ان کے والد کی گہری دوستی تھی اور یہاں آپ کے والد کی اکثر شعر وسخن پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس شعر وسخن کی بات چیت نے مصنف پر اپنے اثرات مرتب کیے تو مصنف نے باقاعدہ شعر وشاعری شروع کر دی تھی۔ راولپنڈی کی ادبی محافل میں عبدالعزیز فطرتؔ پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت انجمن ترقی اُردو کا قیام عمل میں لا کر پہلی دفعہ یومِ اقبال کا اجلاس منعقد کروایا گیا تھا، جس کی صدارت شیخ سر عبدالقادر نے کی۔ یومِ اقبال کا اجلاس پہلے دن ڈی۔اے۔وی کالج اور دوسرے روز کا اجلاس گارڈن کالج میں منعقد کروایا گیا۔ اس اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ اس

میں مصنف نے اپنا مقالہ ''اقبال کی منظر نگاری'' پڑھا۔ یہ مقالہ شیخ سر عبدالقادر کو بہت زیادہ پسند آیا اور انہوں نے اسے ''ہمایوں'' میں چھپوا دیا تھا۔ عبدالعزیز فطرت کی تحریک پر انجمن کی سرگرمیوں میں مصنف نے باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی .ور ہر دوسرے تیسرے ہفتے انجمن کے زیرِ انتظام کسی موضوع پر مشاعرے کا بندوبست کیا جانے لگا۔ ضیاء سرحدی ان مشاعروں میں بطور خاص شمولیت اختیار کرتے تھے۔ مصنف نے ایف۔اے کا امتحان ڈی۔اے۔وی کالج سے پاس کر کے بی۔اے میں گارڈن کالج میں داخلہ لے لیا اور وہاں بزمِ ادب قائم کی۔ کالج کے وائس پرنسپل ادبی سرگرمیوں میں خاص دل چسپی رکھتے تھے، انہوں نے بھی مصنف کی ادبی سرگرمیوں کی بہت حوصلہ افزائی کی۔

بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد مصنف لاہور تشریف لائے، یہاں پر آپ کی ملاقاتیں مولانا تاجور نجیب آبادی، کرپال سنگھ بیدار، گوپال متل اور وقار انبالوی سے ہوتی رہتی تھیں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی مصنف کو ''حافظ کلام اقبال'' کہا کرتے تھے۔ گورداس پور کے مشاعرے کے دوران ایک دفعہ مولانا نے آپ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ اب وہ دعوتِ سخن ''حافظ کلام اقبال'' کو دیتے ہیں۔ مصنف کی علامہ اقبال سے ملاقات کی دیرینہ خواہش تھی جو کہ دل میں ہی رہ گئی اور علامہ محمد اقبال دارِفانی سے کوچ فرما گئے تھے۔ مصنف مولانا ظفر علی خان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ راولپنڈی کے ایک جلسے میں انہوں نے مولانا ظفر علی خان کا جوشِ خطابت دیکھا جہاں وہ فصاحت اور بلاغت کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران مصنف ''ادبی دنیا'' کے دفتر میں ہی رہائش پذیر تھے۔ ان دنوں ''ادبی دنیا'' کے سال نامے چھپتے تھے جن میں عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر اور کرشن چندر کے افسانے بطورِ خاص شامل ہوتے تھے۔ ان دنوں ''ادبی دنیا'' کے دفتر میں شعر و سخن کی محافل کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''حامد علی خاں، حفیظ ہوشیارپوری، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی اور اکثر نئے لکھنے والے ''ادبی دنیا'' کے دفتر میں اکثر جمع رہتے تھے۔ یہ میرا جی کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند ادب کے خدوخال ابھی تک پوری طرح سے اُبھرے نہ تھے۔ میرا جی، یوسف ظفر، منٹو اور کرشن چندر یہ سب نئے ادب کے علمبردار تھے۔ ''رجعت پسندی'' اور ''ترقی پسند'' کا فرق بعد میں جا کے واضح ہوا۔''(۴)

''ادبی دنیا'' کے دفتر کے علاوہ بھی ادیب حضرات کی محفلیں عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری میں باقاعدگی سے ہوا کرتی تھیں۔ عرب ہوٹل ان دنوں اسلامیہ کالج کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ جہاں پر اختر شیرانی، حمید نسیم، مولانا چراغ حسن حسرت، عبدالمجید بھٹی اور ہری چند اختر اکثر ملاقات کرتے تھے اور شعر و سخن پر بات ہوتی تھی۔ مصنف بھی بطور خاص شعراء اور ادیب حضرات کی محفل کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں پنجاب حکومت نے اُردو کا اخبار جاری کیا، جس کے مدیر مولانا حسرت موہانی

تھے۔ اس اُردو اخبار کے پہلے شمارے کے صفحہ اوّل پر نظم لکھنے کے لیے مولانا صلاح الدین نے بطور نظم نگار مصنف کا نام تجویز کیا تھا۔ آپ نے نظم تحریر کر دی، اس نظم کو اخبار ''پنچایت'' کے صفحہ اوّل پر شائع کیا گیا اور مصنف کو نظم کا معاوضہ سات روپے ادا کر دیا گیا تو مصنف کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نظم کے چھپنے کے بعد مصنف کا حسرت موہانی سے ملنا ملانا بہت بڑھ گیا تھا لیکن تقسیم ہندوستان کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ رُک گیا تھا۔ ادیب اور شاعر حضرات کا دوسرا ٹھکانہ نگینہ بیکری ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، عاشق حسین بٹالوی اور باری علیگ کا مسلسل آنا جانا رہتا تھا۔

جگن ناتھ آزاد آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ وہ سکندر حیات کی ہندو مسلم یکجہتی کے لیے شروع کی گئی ''تحریک رفاقت'' میں شامل ہو گئے اور پنجاب کے طول و عرض میں ہندو مسلم اقوام کو متحد کرنے کے لیے کوششیں کرتے رہے لیکن سامراجی طاقتوں نے فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کا ایسا بیج بو دیا تھا جو کہ مسلسل توانا ہوتا رہا۔ ہندو مسلم دشمنی یہاں تک بڑھی کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئیں۔ اس بات کا عملی مظاہرہ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے ایام کے دوران دیکھنے کو ملا۔ مصنف کا دس برس پر محیط لاہور کا قیام ان کی زندگی پر اپنے ان مٹ نشانات چھوڑ گیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک مصنف کی زندگی میں لاہور شہر ایسا حائل ہوا کہ اس کو چھوڑنا اور یہاں سے دور جانا مصنف کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن تقسیم ہندوستان کے دوران ہجرت کے سیلاب میں بہتے ہوئے انہیں مجبوراً دہلی کے لیے رخت سفر باندھنا ہی پڑا۔ مصنف اس بات پر بھی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بہت سے شہر آئے جیسے راولپنڈی، سری نگر، لکھنؤ، دہلی اور حیدر آباد لیکن جو لطف و قرار لاہور میں ملتا تھا وہ اور کہیں دستیاب نہیں تھا:

> ''حالات کے تحت میں خود تو دہلی آ گیا لیکن میرا دِل لاہور میں رہا۔ مدتوں تک ایسا رہا کہ پارلیمنٹ اسٹریٹ کی بجائے مال روڈ کا نام زبان پر آیا۔ چاندنی چوک کا لفظ بڑی مشکل سے زبان پر چڑھا۔ بلا ارادہ جو نام زبان پر آتا تھا وہ ''انارکلی'' تھا۔ بات ''جمنا'' کی ہوتی تو زبان پر لفظ ''راوی'' کا ہوتا۔''(۵)

مصنف اپنی خودنوشت کے آخری حصہ میں لاہور کی خوش گوار یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ آپ نے آپ بیتی میں بطور خاص یہ بات تحریر کی ہے کہ ان کی ماں بولی زبان پنجابی ہے لیکن ان کے لیے اُردو زبان بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ مصنف کے نزدیک اُردو زبان کی ترقی میں ہی قوم کی ترقی پوشیدہ تھی اور ہے۔ مصنف اُردو کی ادبی روایات کو قوم کے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں اور اُردو ادیب اور شاعر ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

''سرگزشت'' از ذوالفقار علی بخاری

معروف براڈکاسٹر سیّد ذوالفقار علی بخاری جنھوں نے ریڈیو کی دنیا میں زیڈ۔اے بخاری کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کی تحریر کردہ آپ بیتی ''سرگزشت'' معارف لمیٹڈ کراچی سے ۱۹۶۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ آپ بیتی ۵۵/ابواب میں منقسم اور ۳۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ہندوستان کی سیاسی وسماجی، معاشی و معاشرتی اور تاریخی وتہذیبی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ آپ بیتی برصغیر کی ریڈیو نشریات کی مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔اس میں براڈکاسٹنگ کی دنیا کے حالات وواقعات کو تفصیلی اور دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

زیڈ اے بخاری ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔آپ بیک وقت ایک شاعر، صداکار، موسیقار، ہدایت کار اور اچھے منتظم بھی تھے۔آپ کو مختلف زبانوں سے بھی دل چسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اُردو، انگریزی، فارسی، پنجابی، عربی اور پشتو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ہر آدمی ایک شخص تو ہوتا ہے مگر ہر شخص میں ایک مکمل شخصیت کا ہونا ناممکن ہے۔ زیڈ۔اے بخاری کو اگر دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شخص کم اور ایک مکمل شخصیت زیادہ ہیں۔(۶) سیّد ذوالفقار علی بخاری کی آپ بیتی ''سرگزشت'' کے بارے میں قدرت اللہ شہزاد بیان کرتے ہیں:

> ''سید ذوالفقار علی بخاری کا تعلق چونکہ ریڈیو سے رہا ہے اس لیے عام تاثر یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی ''سرگزشت'' میں ریڈیو کے حوالے سے ہی ذکر ہوگا لیکن نہیں یہ تو بارہ مصالوں کی چاٹ ہے جسے کوئی بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔''(۷)

اگر بغور دیکھا جائے تو ہر شخص کی زندگی میں کچھ مشاہدات وواقعات ایسے ہوتے ہیں جو معاشرے میں بسنے والے دوسرے لوگوں کے لیے دل چسپی کا ذریعہ بن سکتے ہیں لیکن مصنف کی بھرپور اور پررونق زندگی میں ایسے حالات وواقعات کی کثرت ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ثابت ہوتی ہے کہ ان کے مشاہدہ، باریک بینی اور منفرد اظہار بیان نے واقعات کو دل چسپ بنا دیا ہے مگر اس بات سے مفر بھی ممکن نہیں ہے کہ کیسے ایک عام آدمی کی زندگی میں اتنے زیادہ غیر معمولی واقعات بھی پیش آ سکتے ہیں۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ ''سرگزشت'' سوانح عمری نہیں بلکہ آپ بیتی ہے جس میں بھرپور انداز میں جگ بیتی کے تمام عناصر کو بطور خاص شامل کر دیا گیا ہے۔(۸) آپ بیتی میں جا بجا فارسی، عربی اور اردو کے محاورات، اشعار کے برمحل استعمال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اظہارِ بیان پر نہ صرف عبور رکھتا ہے بلکہ مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے ایک ادبی چاشنی پیدا کرنے میں بھی کامیاب ثابت ہوا ہے۔

مصنف آپ بیتی میں خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں: ''وہ اردو ہی کیا جس میں عربی اور فارسی کی چاشنی نہ ہو''(۹)

یہی وجہ ہے کہ ''سرگزشت'' کے بارے میں مکمل صداقت سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ آپ بیتی اردو ادب کی آپ بیتیوں میں ایک قابلِ ذکر مقام کی حامل ہے۔(۱۰) مصنف کے بڑے بھائی احمد شاہ بخاری انگریزی زبان کے پروفیسر تھے۔ انگریزی اور اردو زبانوں پر عبور کا یہ عالم تھا کہ وہ بنیادی اصول وضوابط، محاورات، روزمرہ اور لغت کے معاملات میں اہلِ زبان شاعر اور ادیب حضرات سے کہیں بہتر تھے۔ احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کے بارے میں زبان دانی کے حوالے سے فیض احمد فیض کا تجزیہ ایک سند کا درجہ رکھتا ہے:

> ''علم کے معاملے میں دونوں بھائی اپنی جگہ استاد سے کم نہ تھے۔ بڑے بخاری صاحب کا انگریزی اور مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا...... چھوٹے بخاری صاحب نے اپنی توجہ اُردو اور فارسی کی طرف کی۔ ان کا طریقہ بھی صرف زبان کے فرق سے وہی تھا جو بڑے بخاری صاحب نے اختیار کیا تھا۔ یعنی بال کی کھال اتارنا، تلفظ، املا، ماخذ، معنی، استعمال، غرض ہر بات میں کمال، دونوں اہل زبان کو مات کرتے تھے۔ وہ انگریزی کے اہل زبان کو مات کرتے تھے، یہ اردو کے اہل زبان کو، زبان کے بارے میں تجسس اور تحقیق دونوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔''(۱۱)

آپ بیتی میں مصنف نے واقعات کو درج کرنے کے لیے زمانی ترتیب کا بالکل خیال نہیں رکھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی زندگی مختلف قسم کے واقعات اور مشاہدات سے عبارت ہے جو معاشرے میں موجود کسی شخص کو بالواسطہ یا بلاواسطہ پیش آتے رہتے ہیں۔ اب اس بات کا فیصلہ کون اور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ کون کون سے امور پہلے تحریر کرنے کے قابل ہیں اور کن حالات کو بعد میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا بہت حد تک بجا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک وہ کوئی تاریخ دان نہیں ہیں کہ وہ زمانی ترتیب کے اصول کی پیروی کریں۔ چونکہ مصنف کی زندگی میں ریڈیو سے تعلق ایک منجدھار کی سی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے انھوں نے آپ بیتی میں ریڈیو کی ملازمت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انگریز حکومت کی جانب سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کو ختم کر دیئے جانے کے بعد انگریزوں نے شملہ میں آر۔ سی ہیڈکوارٹرز کے جنرل سٹاف میں مشرقی زبانوں میں امتحان لینے کا ادارہ قائم کیا۔ جہاں انگریز فوجی اور انتظامیہ کے افسران کو امتحان کے بعد اسناد جاری کی جاتی تھیں۔ اس محکمہ کا نام بورڈ آف ایگزامنرز تجویز کیا گیا تھا۔ مصنف کو خوش قسمتی سے اکیس سال کی عمر میں اس بورڈ کے ایک ممبر کے طور پر ملازمت مل گئی تھی۔ بورڈ آف ایگزامنرز کے ممبر کی حیثیت سے آپ کی ملاقاتیں بڑے بڑے حکومتی عہدے داروں سے ہوا کرتی تھیں۔ ان میں وائسرائے، کمانڈر انچیف، اور انتظامی عہدوں پر فائز افسران شامل تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ اس محکمہ میں گزارہ یہاں آپ کے انگریز شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انہی انگریز

شاگردوں میں سے ایک جو کہ گورنر پنجاب کا .ے۔ڈی۔سی تھا، اس نے مصنف کی صلاحیتوں کو بھانپ کر براڈکاسٹنگ کے شعبہ میں جانے کا مشورہ دیا۔ ان دنوں خوش قسمتی سے مشہور براڈکاسٹر فیلڈن لندن سے انگریز حکومت کی طرف سے ریڈیو براڈکاسٹنگ کے لیے ہندوستان بلوائے گئے تھے۔ فیلڈن انگلینڈ کے وزیراعظم بالڈون کے گہرے دوست، ہندوستان کے وائسرائے کے چہیتے، بی بی سی لندن کے تجربہ کار، خاندانی رئیس، زندہ دل انسان اور ایک جاذب نظر شخصیت کے حامل تھے۔ ریڈیو سے منسلک مصنف کے دوستوں میں سجاد سرور نیازی، اسرار الحق مجاز اور آغا اشرف جبکہ بعد میں آنے والوں میں رشید احمد، اشتین قطب، جی کے فرید، ن م راشد، حفیظ ہوشیارپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور ملک حسیب شامل تھے۔

ذوالفقار علی بخاری کے بڑے بھائی احمد شاہ بخاری انگریزی ادب کے سابق پروفیسر، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، سابق سفیر پاکستان، اقوام متحدہ کے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری، پطرس کے قلمی نام کے حامل معروف ادیب جن کو حکومت پنجاب نے ریڈیو کے پہلے سلیکشن بورڈ کا ممبر مقرر کیا تو فیلڈن سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ بعد میں فیلڈن کی خواہش پر احمد شاہ بخاری کو ریڈیو کے صدر دفتر میں بطور ڈپٹی کنٹرولر تعینات کیا گیا۔ مصنف کو بعد میں ترقی دے کر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر اور آپ کے بڑے بھائی کو بطور اسٹیشن ڈائریکٹر ترقی دے دی گئی تھی۔ ان دنوں سردار دیوان سنگھ مفتون نے دونوں بھائیوں کی ریڈیو میں اس قدر ترقی پر ریڈیو کو ''بخاری برادرز کارپوریشن'' کا خطاب دیا۔ یہ خطاب بہت جلد مشہور ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کے احباب کو بھی بخاری برادرز کارپوریشن کا حصہ ہی کہا جانے لگا۔

ذوالفقار علی بخاری کی داستانِ حیات میں نہ صرف سیاسی وسماجی عوامل کا گہرا شعور پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ ہندوستان کے مذہبی، معاشی اور تہذیبی ورثہ کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنے عہد کی سیاسی صورت حال کو مثالی انداز میں بیان کیا ہے۔ چونکہ انگریز آغاز ہی سے ہندوستان میں اپنے سنہری اصول ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' پر گامزن تھے، لیکن پھر بھی انہیں بہت سے علاقوں اور ریاستوں سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور بعد میں انگریزوں کے ذہنی خلفشار اور حکمرانی کے خبط میں اضافہ ہونے لگا۔ اسی ذہنی خلفشار اور مغربی استعمار کے خبط میں انگریز حکومت نے بہت سی عجیب وغریب حرکات کیں۔ جن سے واضح انداز میں عیاں ہوتا ہے کہ انگریز دلی طور پر ہندوستانی اقوام سے سیاسی طور پر کس قدر خوف زدہ ہو چکے تھے۔ اس بات کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جیسے ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے آغا خاں کی قیادت میں لارڈ منٹو کے پاس وفد لے کر جانا اور انگریزوں کی طرف سے مسلمانانِ ہند کی سیاسی اہمیت کو تسلیم کرنا، مسلم لیگ کو وجود میں آنے دینا، منٹو مارلے سکیم کا نفاذ کروانا، تقسیم بنگال، تنسیخ تقسیم بنگال، پہلی جنگ عظیم کے دوران کانگریس کا مسلمانانِ ہند کے سامنے جھک جانا، میثاقِ لکھنؤ، ماٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کے ذریعے اپنی شکست کو تسلیم کرنا، تحریکِ خلافت میں مسلمانانِ ہند سے خوف کھا کر رولٹ ایکٹ کو نافذ کرنا، پنجاب میں مارشل لاء لگا کر بربریت کا بازار

گرم کرنا، گول میز کانفرنسوں کا انعقاد کروانا، سائمن کمیشن کا ناکام ہونا، نہرو رپورٹ کا ہر طرف سے مسترد ہونا، ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کروانا، اس وقت تک ہندوستانی اقوام میں بالعموم اور مسلمانانِ ہند میں بالخصوص آزادی کے جذبات بہت بڑھ چکے تھے۔ ہندو انگریز حکومت کی غلامی میں خوش تھے، لیکن مسلمان نہ تو انگریزوں کی غلامی کر سکتا تھا اور نہ ان ہندوؤں کی جن پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکمرانی کی تھی۔

۱۹۳۵ء کے بعد دوسری جنگ عظیم کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ انگریز حکومت نے اپنے نام نہاد حکومتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے ہندوستان میں ہنگامی بنیادوں پر ریڈیو کے قیام کی منظوری دی۔ انگریز حکومت کی بدقسمتی تھی کہ ریڈیو کی باگ ڈور فیلڈن جیسے آزاد خیال شخص کے پاس آ گئی۔ ریڈیو کے آغاز ہی میں فیلڈن کا ساتھ دینے کے لیے جن لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ تمام لوگ خوش قسمتی سے آزادی کے حصول کے جذبات سے سرشار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہند سرکار نے ریڈیو سے متعلقہ لوگوں کی کڑی نگرانی کا آغاز کر دیا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے اہلکاران کے خطوط کو خاص طور پر کھلوا کر پڑھتے اور ان کے ٹیلی فون بھی ریکارڈ کیے جاتے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس وقت سرکار کے لیے ریڈیو اور ریڈیو کے لیے سرکار دونوں ایک دوجے کے لیے دردِ سر بن چکے تھے۔ کیونکہ ریڈیو کے اہلکار اپنے آزادی کے جذبات سے مجبور تھے ادھر انگریز حکومت اپنے حکمرانی کے جذبات سے بھرپور تھی۔ کوئی بھی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سرکار چاہتی تھی کہ ریڈیو والے ہر وقت ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہیں لیکن مصنف اور ان کے ساتھی حقیقت پسندی کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ ریڈیو سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو دو قسم کی مشکلات کا براہِ راست سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یعنی انہیں بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑنا تھی، ایک انگریز سرکار اور دوسری کانگریس پارٹی۔ اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ فیلڈن کا طبعی میلان اور ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں۔ بہت سی کانگرسی سیاسی شخصیات جن میں اہم ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت جواہر لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی کا ملنا ملانا فیلڈن سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فیلڈن کا جھکاؤ کانگریس پارٹی کی طرف زیادہ تھا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے انگریز حکومت کی خواہش کے مطابق کانگریس کے راہنماؤں کو خوش کرنے اور ریڈیو کی ہندوستان میں ساکھ کو مزید بہتر بنانے کے لیے بہت سے کانگرسی ہندو قائدین جن میں اہم پنڈت نہرو، مرار جی ڈیسائی، بابو راجندر پرشاد اور امبیڈکر کی تقاریر ریڈیو سے براڈکاسٹ کیں۔ مصنف کی آرزو تھی کہ اب قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر بھی ریڈیو سے نشر کی جائے۔ ہزار جتن اور حد درجے انتظار کے بعد نومبر ۱۹۳۹ء میں مصنف کی قائداعظم سے ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے قائداعظم سے اپنی دیرینہ آرزو کا اظہار کیا کہ آپ ریڈیو سے تقریر فرمائیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے آپ کی درخواست قبول کر لی۔ یہ خبر فوراً جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ قائداعظم کی ولولہ انگیز اور پرجوش تقریر نے مسلمانوں میں آزادی کی نئی شمع روشن کر دی۔ مصنف قائداعظم کی ریڈیو پر نشر کی جانے والی تقریر کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"قائداعظم کی آواز تھی کہ صور اسرافیل، لہجہ تھا کہ صداقت کے سمندر کی لہریں، الفاظ تھے کہ ترستی مٹی پر رحمت باراں، جس جس نے قائداعظم کی تقریر سنی مبہوت ہو گیا۔"(۱۲)

قائداعظمؒ کی تقریر کا بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونا تھا کہ انگریز حکومت اور کانگریس پارٹی کے راہنما مصنف کا خون خشک کرنے پر تل گئے۔ دہلی سے جواب طلبی کی گئی کہ یہ تقریر آخر کیوں اور کس کی اجازت سے ریڈیو پر نشر کی گئی۔ سرکار اور کانگریس نے قائداعظم کی تقریر پر بہت سے اعتراضات اُٹھائے اور آئندہ کے لیے یہ حکم جاری کروا دیا گیا کہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے سیاسی راہنما کی تقریر بغیر تحریری اجازت کے نشر نہیں کی جائے گی۔

بمبئی ریڈیو کے ایک اہلکار بال سیتارام مرڈھے کر کا ذکر مصنف نے آپ بیتی میں بطور خاص کیا ہے اور ان کی احسان مندی کا تذکرہ کیا ہے۔ بال سیتارام انگریزی ادب میں انگلینڈ سے فارغ التحصیل تھے، سخت متعصب ہندو جس کی زبان پر ہر وقت ہندو مہاسبھا اور شیوا جی کا تذکرہ رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو سرکار کی طرف سے پوچھا گیا کہ کون کون پاکستان میں نوکری کے لیے جانا چاہتا ہے۔ مصنف نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو سب نے ہندوستان ہی میں نوکری کرنے کی تجویز دی لیکن بال سیتارام مرڈھے کر نے پاکستان چلے جانے پر اصرار کیا، جس پر مصنف کو تعجب ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب مصنف پاکستان منتقل ہوئے تو ایک دفعہ کراچی سے ڈھاکا جاتے ہوئے، ان کی ملاقات بال سیتارام مرڈھے کر سے ہوئی تو مصنف نے اس سے پوچھا کہ آخر تم مجھے فوراً پاکستان چلے جانے پر اتنا زیادہ مصر کیوں تھے۔ تو اس کا جواب مصنف نے آپ بیتی میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"کچھ دیر تو مرڈھیکر خاموش رہا اور پھر کہا، لو اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ میں کیوں تم کو پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا، میں راشٹریہ سیوک سنگھ کا ممبر ہوں۔ آر۔ ایس۔ ایس کی طرف سے مجھے حکم ملا تھا کہ تمہیں جان سے مار ڈالوں۔"(۱۳)

ذوالفقار علی بخاری نے آپ بیتی میں انتہا پسند اور متعصب ہندوؤں کا کھل کر پول کھولا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے ۱۹۲۵ء میں بہار پراونشل ہندو مہاسبھا میں ایک جلسے کے دوران لالہ لاجپت رائے اور بھائی پرمانند نے اپنی تقاریر میں کہا کہ ہندو قوم سورماؤں کی قوم ہے، گوشت کھانے کی بجائے قوموں کو ہی کھا جاتی ہے۔ ہندوستان میں یونانی قوم، ہن قوم اور دوسری بہت سی قوموں کو کھا گئی مگر افسوس مسلمان قوم کو ہزار سال گزر جانے کے باوجود نہیں کھا سکی۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے حاضرین سے کہا کہ ہندو قوم کو اپنی مردم اور قوم خوری کی عادت کو بھلانا نہیں چاہیے بلکہ فوراً مسلمان قوم کو اپنے دانتوں سے چبا چبا کر ختم کر دینا چاہیے۔ مصنف ان ہندو مقررین کی تقاریر سن کر ہندو مہاسبھا سے متنفر ہوئے اور خوابِ غفلت میں ڈوبی مسلمان قوم پر افسوس کا اظہار کیا جو ایک عرصہ تک "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا راگ ہی الاپتی رہی۔ علامہ اقبال اور قائداعظم اگر اس سوئی

ہوئی قوم میں اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے بیداری پیدا نہ کرتے تو شاید ہندوستانی مسلمانوں کو کبھی آزادی کی نعمت حاصل نہ ہوتی۔

مصنف نے پہلی اور دوسری عالمی جنگوں سے پہلے اور بعد کی عالمی سیاسی و سماجی صورت حال کو خاص طور پر اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے بعد مختلف اقوام کے عوام، سیاسی قائدین، افواج کے افسران کا طرزِ عمل اور مشاہدات کو من وعن قلم بند کیا ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں کا جب اٹلی پر قبضہ ہو گیا تو مصنف کو سرکار کی طرف سے وردی پہنا کر جنگ کے بعد کے حالات کی رپورٹنگ کے لیے لندن سے روم بھجوا دیا گیا۔ وہاں جا کر آپ کا پالا عجیب وغریب قسم کے حالات سے پڑا۔ اٹلی میں جسموں کی خرید کے بدلے روپیہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ایک ”دہ ڈبل روٹی کے بدلے جسموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ جسموں کے تاجر کہتے تھے کہ ہم روپیہ لے کر کیا کریں گے۔ کیونکہ یہاں نہ کوئی کھانے کا سامان ہے اور نہ ہوٹل۔ بس روٹی دے دو اور اپنی پسند کا جسم خرید لو۔ اس بازار میں فوجیوں کا داخلہ بند کر دیا گیا تو طوائفوں نے شہر کے عام محلوں کا رُخ کیا۔ وہاں جب طوائفوں کا کام بڑھ گیا تو شرفاء نے بھی پیٹ پالنے کے لیے جسم فروشی کا کام شروع کر دیا۔ جب اتحادی فوجی ڈبل روٹی یا کھانے کا سامان لے کر راستے سے گزرتے تو لوگ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے تا کہ ان کے جسم کے سودے کے بدلے ایک وقت کا کھانا تو میسر آ جائے۔ یہ سماجی حالت .بس ملک اٹلی کی تھی جو اقتصادی لحاظ سے بہت مضبوط تھا لیکن جنگ کے بعد اس کے حالات انتہائی دگرگوں ہو گئے تھے۔ آپ بیتی میں سیاسی و سماجی تجزیات قابلِ تعریف ہیں۔ مصنف تیسری عالمی جنگ کے بارے میں پیشین گوئی یوں کرتے ہیں:

> ”دوسری جنگ عظیم، پہلی جنگ عظیم سے ہول ناک تھی۔ اب کے اگر جنگ چھڑی اور اس میں نئے مہلک اسلحہ استعمال ہوئے تو یوں سمجھ لیجیے کہ قیامت کا نمونہ نظر آئے گا اور وہ بھی اس شرط پر کہ کوئی دیکھنے والا باقی رہ جائے۔“(۱۴)

آپ بیتی میں انگلستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آزاد قوموں کو شاید اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ وہ آزاد ہیں اور نہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ خدا نے انہیں کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ جب آزادی کی نعمت ہاتھ سے جانے لگتی ہے، تب اقوام اس نعمت کے دوبارہ حصول کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینے سے گریز نہیں کرتیں۔ انگلینڈ کی آزادی کو چھین لینے کے لیے جب جرمن افواج نے حملے شروع کیے تو انگلستانی قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہونے لگی۔ چرچل کی قیادت میں انگریز قوم بیدار ہو گئی اور اس قدر چاق و چوبند ہو کر میدانِ جنگ میں اتری کہ ہٹلر کو شکست فاش دے کر ہی سکھ کا سانس لیا۔

مصنف کے بقول انگریز قوم سے جب ان کی آزادی کو دوسری جنگ عظیم میں چھین لیے جانے کا وقت آیا تو ان کی

آنکھیں کھل گئیں اور وہ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب قیامِ پاکستان کے دوران دنیا کی سب سے بڑی ہجرت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ خواتین کے ساتھ درندگی کی گئی، بچوں کو کرپانوں اور نیزوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ غرض مسلمان مہاجرین کی ہجرت دل دہلا دینے والے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے حقائق کی داستان بن گئی۔

ذوالفقار علی بخاری کی آپ بیتی ''سرگزشت'' بلاشبہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ جو عمدہ اسلوبِ بیان کے باعث قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں برصغیر اور انگلستان کے سیاسی وسماجی تناظرات کی منہ بولتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ آپ بیتی ہندوستان میں ریڈیو کی تاریخ پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بیتی ''سرگزشت'' کا مقابلہ اردو کی کسی بھی اعلیٰ پائے کی سیاسی وسماجی آپ بیتی سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، لیکن صد افسوس اسے پھر بھی ادبی حلقوں میں نظر انداز ہی کیا جاتا رہا ہے۔

''بجنگ آمد'' از کرنل محمد خانؔ

کرنل محمد خاں ۵/اگست ۱۹۱۲ء میں ضلع چکوال کے ایک قصبہ میں چودھری امیر خان کے گھر میں پیدا ہوئے۔ چکوال اور کوہستان کے مضافاتی علاقوں میں مصنف کے مغل قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ عموماً یہ لوگ کھیتی باڑی کے پیشہ سے منسلک ہیں لیکن یہاں کے باشندوں کا شوق فوج میں خدمات سرانجام دینے کا ہے۔ مصنف کا تعلق مغلوں کے خاندان کی ایک شاخ ''مغل کسر'' سے ہے۔ محمد خان کی عمر چار سال تھی، جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا لیکن ان کی والدہ نے غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ آپ کو سکول میں چوتھی جماعت میں داخل کروایا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا[۱۵] اور لاہور میں کالج کی تعلیم مکمل کی۔ آپ کے ہم جماعتوں میں ایم۔ڈی تاثیر، فیض احمد فیضؔ، ن۔م راشد اور محمود نظامی شامل تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ایف ایس سی میڈیکل درجہ اوّل میں کی۔ آپ نے بی۔اے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے (اقتصادیات) کی ڈگری مکمل کی اور سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کچھ عرصہ بطور معلم شعبہ تعلیم سے بھی منسلک رہے لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے ملازمت کو خیرباد کہہ کر واپس چکوال آ گئے۔

مصنف کو فوج میں بطور لیفٹیننٹ شامل ہونے کا بہت شوق تھا اس لیے انہوں نے فوج میں کمیشن حاصل کرنے کی غرض سے درخواست گزاری۔ ان دنوں افواج میں کمیشنڈ آفیسر انتخاب کے لیے انٹر سروسز سلیکشن بورڈ ابھی قائم نہیں کیا گیا تھا۔ امیدواران کو حتمی انتخابات کے لیے مختلف انٹرویوز کمیٹیوں کے سامنے سوالات کے جوابات دینے ہوتے تھے۔ مصنف کو جہلم، پنڈی، شملہ میں کامیاب انٹرویوز کے بعد آفیسر ٹریننگ سکول مہو میں فوجی تربیت کے لیے ۸/اگست ۱۹۴۰ء کو بھیجا گیا۔

مصنف نے فوجی تربیت کے مختلف مراحل کو آپ بیتی میں بڑے دل چسپ انداز میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تربیت کے معمولات جن میں پی ٹی، ڈرل، پستول، مشین گن کی سکھلائی اور باقاعدہ لیکچرز شامل تھے۔ مصنف نے افسری کا جو تصور دل و دماغ میں قائم کیا ہوا تھا، وہ تو چند دن میں ہی نکال دینا پڑا کیونکہ ڈرل کے دوران پاؤں زخمی ہو گئے۔ رائفل کو سلوپ کرتے ہوئے ہاتھ جواب دینے لگے۔ مورچوں کی مسلسل کھدائی سے جان دوبھر ہوئی، رسے کے ذریعے چڑھنے، بھاگتے گھوڑوں سے کودنا، بے مرچ بدذائقہ کھانا اور پھر سونے پہ سہاگہ سارجنٹ میجر کا کرخت لہجہ برداشت کرتے کرتے ان کی نو ماہ کی تربیت مکمل ہوئی۔ مصنف فوجی تربیت کی تکمیل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اپریل ۱۹۴۱ء کی وہ صبح بھولنے کی نہیں، جب وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم تیم لفٹینوں کی ہنستی گاتی ٹولی کو لیے مہو کے سٹیشن سے نکلی۔ معاً ہمیں وہ دن یاد آیا جب نو ماہ پیشتر ہم اسی سٹیشن پر پہلی مرتبہ اترے تھے اور گورے سارجنٹوں نے ہمارے پندار کی گربہ کا روز اوّل ہی کام تمام کر دیا تھا، لیکن وہی گورے آج ہمیں سلیوٹوں سے رخصت کر رہے تھے۔''(۱۶)

تربیت کے بعد مصنف کو پشاور میں بطور او۔سی یا سیکشن کا افسر جس کا کام پہاڑی توپ خانے کو مواصلات پہنچانا ہوتا ہے تعینات کیا گیا۔ سگنلز کے اس سیکشن میں تمام ماتحت عملہ پنجابی مسلمان تھے۔ پندرہ بیس دن گزرنے کے بعد مصنف کو پشاور سے دتا خیل وزیرستان بھجوا دیا گیا، جہاں فوج قبائلیوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ میں مصروف تھی۔ دتا خیل کی چوکی چھوٹا قلعہ ایک کھلے میدان میں قائم کی گئی تھی، جس کے چہار اطراف اونچے پہاڑ تھے۔ چونکہ سرحدی جنگوں کا انداز عام جنگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے، اس لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک نیا معرکہ ہوتا تھا۔ قبائلی معرکوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ منظر ہوتا جس میں قبائلیوں کے گھروں کو گرا دیا جلا دیا جاتا تھا۔ عموماً سرے شام اردگرد کے پہاڑوں سے باقاعدہ فائرنگ شروع ہو جاتی اور پھر اس کے جواب میں گولوں اور گولیوں کی بارش کر دی جاتی تھی۔ دو ماہ تک دتا خیل کے پہاڑوں کی گوشمالی کے بعد مصنف کو بذریعہ بحری جہاز بمبئی سے سمندر پار جنگ میں شامل ہونے کا حکم ملا۔ ایک تو مصنف کے فوجی دوست احباب نے سمندر پار جانے سے اتنا ڈرایا اور دوسرا محاذ جنگ سے موصول ہونے والی خبروں سے گویا یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ شاید جنگی محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی خالق حقیق کو جاملیں گے۔

ان دنوں لڑائی مصر سے آگے لیبیا میں مسولینی کی افواج کے خلاف بڑے جوش وخروش سے لڑی جارہی تھی۔ مصنف ایک ہفتے کے بحری سفر کے بعد یکم ستمبر ۱۹۴۱ کو بصرہ پہنچے۔ مصنف کو بصرہ سے مغرب کی جانب پندرہ میل دور شائبہ کیمپ پہنچایا گیا۔ جہاں سے آگے محاذ جنگ پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اس فوجی کیمپ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''شائبہ کیمپ میں پہنچے، تو پہلی مرتبہ انسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی

فوجوں کے سپاہی.....فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں وہ جو لڑ کر جیتتے ہیں
اور وہ جو کھا کر جیتتے ہیں۔ شائبہ کیمپ میں دونوں قسمیں پائی جاتی تھیں۔"(۱۷)

اس کیمپ میں برٹش اور انڈین ونگ تھے۔ برٹش ونگ میں تمام فوجی اور افسران انگریز تھے جبکہ انڈین ونگ میں ہندوستانی فوجی اور ان کے افسران قیام پذیر تھے۔ اس دور میں ہندوستانی فوج میں اکثریت انگریز افسران کی ہی تھی، لیکن بعد میں تمام ہندوستانی اقوام کے لوگ شامل ہوتے گئے۔ مصنف آپ بیتی کے باب ششم میں ہندوستانی اقوام کی سیاسی و سماجی صورت حال کو واضح کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مسلم دنگل تھا، جس میں اکثر سکھ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے اور فقط پارسی ہی اس بزم شیر و شتر کو ساحل سے دیکھتے تھے، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خدا واسطے کا بیر تھا تو صرف انگریز افسروں سے۔"(۱۸)

مصنف کا ماننا ہے کہ ہندوستانی محکوم اقوام میں شاید محکومی کی وجہ سے حساسیت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کا انگریزوں سے ہمیشہ خواہ مخواہ الجھنے کو ہی جی چاہتا رہا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگریز عہدوں میں سینئر تھے، اس لیے ہندوستانی اور انگریز افسروں کے درمیان نوک جھونک ہمیشہ ہوتی ہی رہتی تھی۔ اسی دوران حکم دیا گیا کہ رائل سگنلز کے افسران انڈین ونگ میں قیام کی بجائے برٹش ونگ میں قیام و طعام کریں گے کیونکہ ان دنوں انڈین سگنلز کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے مصنف کو انڈین ونگ کی بجائے برٹش ونگ میں پہنچا دیا تھا:

"چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کو اپنی برادری سے ادھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی، لیکن کانگریسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔"(۱۹)

آپ بیتی میں مصنف نے بصرہ کی سماجی صورت حال کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بصرہ شہر فوجی کیمپ سے پندرہ میل دور تھا۔ شہر کے مرد حضرات کی رنگت گوری اور کالی تھی، لیکن یہاں کی خواتین بہت خوبصورت تھیں۔ معاشی لحاظ سے ان دنوں بصرہ کے لوگ غربت و افلاس کی چکی میں پس رہے تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں انہیں بصرہ سے بغداد اور پھر حبانیہ پہنچایا گیا، جہاں پر برطانیہ کا مشہور ہوائی اڈا تھا، حبانیہ کیمپ ایک سمندر کی طرح جھیل کے کنارے دسویں انڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جہاں جھیل گہرے نیلے پانی کی وجہ سے ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہی تھی۔ رات وہاں قیام کرنے کے بعد مصنف کو ۲۰ بریگیڈ کے سگنل سیکشن میں بطور سیکنڈ ان کمانڈ تعینات

کیا گیا۔ بغداد شہر سے قریباً ڈیڑھ سو میل دور کیارہ مقام پر ۲۰ بر گیڈ خیمہ زن تھی، جہاں ہر طرف بے آب و گیاہ صحرا تھا۔ باب ہفتم بعنوان ''صحرائے کیارہ اور بر گیڈ آفیسرز میس'' میں مصنف فوج میں پائے جانے والے نظم وضبط کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک ضبط کا تعلق ہے، یہ میس کی بے ضبطی صرف دورون میس کی بات تھی...... میس کے باہر وہی حفظ مراتب تھا جو فوج میں ہوتا ہے۔ سینئر کا حکم اور جونیئر کی لبیک، خواہ تعمیل حکم میں جان ہی کیوں نہ جائے، بلکہ یہ کہ میس کی آزادی ہی باہمی احترام اور محبت کی ضامن تھی۔''(۴۰)

آپ بیتی کے باب ہشتم بعنوان ''نیم لفظین بغداد میں'' کا آغاز مصنف نے علامہ اقبال کے ایک مصرعہ ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' سے کیا ہے۔ کیونکہ ان دنوں اس لق و دق صحرا میں وجودِ زن کا دور دور تک کوئی نام ونشان موجود نہ تھا۔ افسران اپنے دل کی دنیا کو رنگین کرنے کے لیے بغداد جانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ بغداد میں اگر کوئی کام نکل آتا، تو کئی افسران رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہوتے تھے۔ بغداد شہر میں ''کٹ کیٹ'' اور ''ملہی الف لیلہ'' عربی رقص کے دو مشہور کیبرے تھے، جو کہ فوجی افسران کے راحت اور سکون کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ رقص وسرود کے حوالے سے ہر ملک میں اپنا اپنا مخصوص طریقہ کار ہے۔ ہندو پاک میں رقص کے دوران آنکھوں، ابرو کے اشاروں، ہاتھوں اور پیروں کی حرکات وسکنات کو شامل کیا جانا لازم ٹھہرایا جاتا ہے۔ جبکہ عربی رقص کا لازمی حصہ عریانی ہے۔ دوسرا کولہوں اور چھاتیوں کی حرکات کو خاص طور پر رقص کے دوران شامل کیا جاتا ہے۔ مصنف کو بغداد کے معروف کیبرے ڈانس میں بھی وہ بات نہ ملی جو ہندوستانی رقص میں تھی۔ عرب رقص اور دیسی رقص میں فرق اتنا زیادہ تھا گویا جتنا ستار نوازی اور ڈھول میں یا گلاب کے اور گوبھی کے پھول میں ہوتا ہے۔

کرنل محمد خان نے جہاں ہندوستانی سیاسی وسماجی صورت حال کو اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے، وہاں بطور خاص مشرق وسطیٰ کی سیاسی وسماجی زندگی کے عناصر کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری آپ بیتی میں کھو سا جاتا ہے اور اس کی دل چسپی صفحات کی ورق گردانی سے مزید بڑھتی جاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ عرب مسلمانوں کا دیسی مسلمانوں کے دلوں میں ایک پیدائشی احترام موجود ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ ان عرب ممالک میں جا کر، ان کی نام نہاد حرکات کو اپنی گناہ گار آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے بعد یہ احترام انتہائی کم ہونے لگتا ہے۔ دراصل مشرقی ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیشہ محض عرب ہونے کی وجہ سے انہیں اتنا زیادہ راسخ العقیدہ مسلمان سمجھ لیا ہے کہ ہم سوائے اس بات کی شاید ان سے توقع ہی نہیں کرتے کہ وہ تہجد سے لے کر عشاء تک عبادات اور نوافل ہی ادا کرتے رہتے ہیں۔ ہم شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح کے گناہ گار خدا کی بندے ہیں اور ان کے سینوں میں بھی دل پائے جاتے ہیں۔

مصنف کو بغداد کے لوگوں کی نماز پڑھنے کا طریقہ عجیب معلوم ہوا۔ آپ نماز عید کے لیے بصرہ مسجد پہنچے تو وہاں دیکھا کہ لوگ فرداً فرداً اپنی نماز پڑھ رہے تھے، یعنی باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کروایا گیا تھا اور مسجد میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی نماز ادا کر رہی تھیں۔ ایک خاتون تو دوران نماز سگریٹ کے کش سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ البتہ ایک کام میں عرب لوگ ہم سے آگے تھے اور وہ تھا قرأت۔ عربوں کی تلاوت قرآن پاک سن کر انسان خود بخود وجد میں آ جاتا ہے۔ بغداد کا قیام اختتام پذیر ہوا تو انہیں واپس کیارہ بلایا گیا، جہاں سے انہیں موصل کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ان دنوں اس کوچ کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شمال کی طرف سے ہٹلر کی افواج بھی اس جانب پہنچ رہی ہیں اور جلد مڈبھیڑ کا امکان تھا۔

موصل میں کچھ عرصہ قیام کے بعد مصنف کی بریگیڈ کو موصل سے افریقہ کے صحرائے اعظم میں طبرق پہنچنے کا حکم ملا۔ نقشہ دیکھنے سے انہیں معلوم ہوا کہ موصل سے طبرق براستہ فلسطین کے ساحل تک اور اس کے آگے نہر سویز کو عبور کر کے افریقہ کے شمالی کنارے ساحلی سڑک پر منزل مقصود تھی۔ صحرا میں طویل سفر کے بعد ان کا قافلہ دریائے اردن کو عبور کر کے فلسطین پہنچا۔ فلسطین کا علاقہ کشمیر یا سوات کے علاقے سے مشابہت رکھتا تھا۔ فلسطین کے حیفہ شہر پہنچ کر فوجی قافلے کو حیفہ شہر دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ حیفہ ایک پہاڑی پر واقع تھا اور اس کے حسن میں قدرت کے ساتھ ساتھ انسانوں نے بھی اپنے جوہر دکھائے تھے۔ فلسطین کی سیاسی وسماجی صورت حال کی مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

> ''۱۹۴۲ء میں اسرائیل ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن یہودی فلسطین پر چھا رہے
> تھے اور حیفہ تو ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی گود میں گرنے کو تھا۔''(۴۱)

فوجی بریگیڈ حیفہ سے گزر کر اسلوج اور نہر سویز عبور کرنے کے بعد اسماعیلیہ میں رات کو داخل ہوا۔ وہاں ایک رات قیام کے بعد قاہرہ سے گزر کر دریائے نیل عبور کر کے کانوائے نے صحرا میں رات کو قیام کیا۔ ایک صبر آزما سفر کے بعد کارواں مرسیٰ مطروح پہنچا، جہاں پر گزشتہ سال کی جنگ کی یادوں نے تازہ دم کر دیا۔ یہاں پر چوتھے انڈین ڈویژن نے مسولینی کی افواج کو خوب سبق سکھایا۔ اس جنگ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ مخالف فوج کے اطالوی افسران کو جب مورچوں سے باہر نکالا گیا، تو ہر افسر کے ساتھ اس کی داشتہ بھی مورچے سے باہر نکل آئی۔ مرسیٰ مطروح سے سیدی بارانی سے ہوتے ہوئے قافلہ شام کو سلوم پہنچا۔ سلوم مصر اور لیبیا کی سرحد پر واقع تھا، رات قیام کر کے بلفایہ سے طبرق کے نزدیک بل حمد کے مقام پر ڈیرہ جمایا:

> ''صبح ہوئی تو وہ حکم بھی آ گیا جس کا انتظار تھا۔ یعنی یہ کہ بریگیڈ آگے بڑھ کر سیدی
> رزیغ کی پہاڑ پر دفاعی مورچے قائم کرے اور جرمنوں کے حملے کا منتظر رہے کیونکہ
> آثار سے پیدا تھا کہ جرمن طبرق کی بجائے سیدی رزیغ پر حملہ کرنے والے ہیں۔''(۴۲)

دس دن گزرنے کے بعد بل حمد سے پیدل فوج کے دستوں کو سیدی رزیغ میں مورچہ زن ہونے کا حکم ملا۔ دو دن تک

جرمن فوج کے حملے کا مسلسل انتظار کرنے کے بعد سیدی رزیغ کے وسیع میدان جنگ کا جائزہ لیا گیا۔

دشمن نے ہر طرف بارودی سرنگوں کا جال بچھایا ہوا تھا، سڑک کے دونوں اطراف خاردار تاریں لگا دی گئی تھیں۔ جیسے ہی کوئی انسان یا گاڑی سڑک سے دائیں یا بائیں ہو کر ان تاروں سے الجھتی تھی تو اسی وقت زوردار دھماکے سے بارودی سرنگ پھٹ جاتی تھی۔ بالآخر ۱۷ جون ۱۹۴۲ء کے دن گڑھوال رائفلز، راجپوت رائفلز اور ساؤتھ ویلز بارڈرز نے اپنے مورچے سنبھال لیے اور جرمن فوجی دستوں کی طرف سے شدید گولہ باری کا آغاز کیا گیا۔ مصنف کی ذمہ داریوں میں وائرلیس کے ذریعے پیغام رسانی بہم پہنچانے کا کام تھا، اس لیے جنگ کی شروعات سے ہی قیامت خیز خبریں پہنچنے لگیں۔ اگلی صبح سے شام تک شدید گولہ باری جاری رہی، اسی دوران جرمن فوج کی معروف ۹۰ لائٹ آرمرڈ ڈویژن مشرق سے پوری آب و تاب کے ساتھ اتحادی افواج کے پسپائی کے راستے کو کاٹنے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ اس خفیہ خبر کے ملتے ہی بریگیڈ کو فوری طور پر سیدی رزیغ کو چھوڑ کر پیچھے سلوم کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا گیا۔

مصنف تیرہویں باب بعنوان ''قاہرہ ایام جنگ میں'' مصر کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی و سماجی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان دنوں قاہرہ کے دلکش اور پررونق بازاروں میں بہت چہل پہل تھی، خصوصاً مصری خواتین کا پہناوا، آرائش و زیبائش اور چال ڈھال مغرب زدہ تھی۔ یہاں پر ہندوستان، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، یونان، افریقہ، فرانس اور پولینڈ کے مرد اور خواتین فوجیوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ قاہرہ میں مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والی افواج کی اتنی کثرت تھی کہ گمان ہوتا تھا، اصل جنگ تو قاہرہ کے بازاروں میں ہو رہی تھی۔ مصنف نے قاہرہ کی مشہور رقص گاہ ''گراپی'' کا تذکرہ یوں کیا ہے:

> ''گراپی کے کشادہ دروولان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں مصروف اختلاط تھے۔ دفعتہً بینڈ پر ایک نئی دھن کی ابتداء ہوئی اور مرد التجائے رقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا جھکے۔''(۴۳)

جنگ عظیم دوم ۱۹۴۳ء کے اواخر تک افریقہ سے بہت دور اٹلی میں داخل ہو رہی تھی لیکن اچانک اطالوی افواج نے ہٹلر کا ساتھ چھوڑ کر اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جنگ کے اختتام پر مصنف وطن واپس لوٹ آئے۔ آپ بیتی کے آخر میں مصنف ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان دنوں ملک میں ایک سیاسی انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ قائداعظم اور پنڈت نہرو دِلّی میں لارڈ مونٹ بیٹن سے مل کر انگریزی راج کا قصہ تمام کر رہے تھے اور اڑتی سی خبر تھی کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔''(۴۴)

ریگولر کمیشن کے حصول کے لیے مصنف کو ۶ جون ۱۹۴۷ء کو سلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے پیش ہونے کا حکم ملا۔ ۳ جون

۱۹۴۷ء کو ریڈیو کے ذریعے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو اور قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر نشر کی گئیں۔ اہل ہندوستان کو خوش خبری سنائی گئی کہ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اُبھرے گا۔ قیام پاکستان کے حوالے سے مصنف اپنی ایک خوش گوار یاد کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''سیسل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۲۶ ایک منکسر مزاج سا سنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لیے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سنا۔''(۲۵)

آپ بیتی ''بجنگ آمد'' میں کرنل محمد خان نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی داستان حیات کے سیاسی و سماجی حالات کو سچائی سے دل چسپ اور مزاحیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ آپ بیتی کی ورق گردانی سے بہت سے حقائق منکشف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کے طرزِ عمل سے آگاہی ہوتی ہے اور خصوصاً انگریز حکومت اور افواج کے افسران کے تفاخر پسندانہ اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ انگریزوں کے ہتک آمیز سلوک کی کئی مثالیں ہمیں آپ بیتی میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے اسباب و اثرات اور نتائج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف کے اندازِ بیان میں ایک فطری کیفیت ہے، اس پر بلاشبہ اچھے مصنفین فخر کر سکتے ہیں۔(۲۶) کرنل محمد خان اپنی داستان مزاحیہ، بے باک اور انبساط سے تحریر کرتا ہے کہ ایسی مہارت کی امید کسی فوجی سے نہیں کی جا سکتی۔(۲۷) مصنف نے نظم وضبط سے بھرپور فوجی ملازمت کے دوران پیش آنے والے واقعات، مشاہدات اور تفکرات کو اتنے دل کش انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری تحریر سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بے لاگ اندازِ فکر، اشعار، مصرعہ جات اور محاورات کے برمحل استعمال نے آپ بیتی کو مزید نکھار دیا ہے۔ آپ بیتی کے بارے میں سید ضمیر جعفری کہتے ہیں:

> ''انسانوں کی طرح کتابیں بھی قسما قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ''بزرگ کتابیں''، ''نادان کتابیں'' وغیرہ وغیرہ۔ ''بجنگ آمد'' ایک ''دوست کتاب'' ہے یعنی ایسی کتاب جس پر دل ٹوٹ کر آ جائے۔''(۲۸)

کرنل محمد خان نے آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کے لیے پرلطف واقعات، الفاظ کے رد و بدل، کرداروں کی حرکات، واقعات کے تضاد و تقابل اور کہیں پہ مکمل تحریف نگاری سے کام لے کر اپنی فوجی زندگی کی داستان کو مزاح کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

’’یادوں کی برات‘‘ از جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ ملیح آبادی ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو اتر پردیش ہندوستان کے مردم خیز علاقے ملیح آباد کے ایک علمی اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام شبیر حسین خان تھا۔ تقسیم ہند کے چند برسوں بعد ہجرت کر کے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جوشؔ ملیح آبادی اردو ادب کے نامور اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ نہ صرف اپنی مادری زبان اردو میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ آپ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ اپنی انہی خداداد لسانی صلاحیتوں کے وصف آپ نے قومی اردو لغت کی ترتیب و تالیف میں بھرپور علمی معاونت کی۔ نیز آپ نے انجمن ترقی اردو (کراچی) اور دارالترجمہ (حیدر آباد دکن) میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی آپ بیتی ’’یادوں کی برات‘‘ اردو ادب میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ آپ بیتی پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی میں مختلف عنوانات کے تحت ان کی ذاتی زندگی جس میں ابتدائی میلانات، بچپن کی عادات آباؤ اجداد اور احباب کا تفصیلی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے قدیم لکھنؤ کے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام حیات کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔

آپ بیتی میں رجائیت پسندانہ سوچ ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں مایوسیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی جگہ کیف و نشاط کے ساتھ ساتھ محفل کی رونقیں، اودھ کی رنگینیاں اور دلفریبیاں پائی جاتی ہیں۔ آپ بیتی میں ایک طرف دلچسپ حقائق کا بیان ہے تو دوسری طرف حقائق کے بیان اور صداقت کے تعین میں دشواری بھی پیش آتی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے چار بنیادی عناصر کو بیان کیا ہے۔ شعر گوئی، عشق بازی، حصول علم اور انسان دوستی۔ مصنف کی اس تحریر میں جابجا تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی میں انسان دوستی اور قوم سے ہمدردی کو درج ذیل انداز میں لکھا ہے:

> ’’آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے۔ چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے، اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مجھ نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے، غور فرمائیے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔‘‘(۲۹)

مصنف نے آپ بیتی میں بے رحم سماج میں لوگوں کی غربت و افلاس کی داستان بیان کرتے ہوئے اپنے دلی جذبات و احساسات کا برملا اظہار کیا ہے۔ آپ بیتی میں جوش ملیح آبادی نے سلطنت اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کی بھرپور

عکاسی کی ہے اور ساتھ ہی لکھنؤ کی تہذیب کے زوال کی داستان بھی سنائی ہے کہ جب سلطنت اجڑی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہر ایک راہ راست سے بھٹک گیا ہو اور ٹھیک یہی واقعہ جوشؔ کے خاندان کے ساتھ بھی پیش آیا ان کے خاندان کا زوال کسی دشمن کے ہاتھوں نہیں ہوا، بلکہ اس کے ذمہ دار خود ان کے آباؤ اجداد تھے۔ مصنف آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا۔ جس کے نتائج بہت ہی گھمبیر برآمد ہوئے۔ مال و جائیداد کو اس طرح عیش و عشرت میں اڑا دیا گیا جیسے ململ کے کپڑے کو ببول پر ڈال کر کھینچ لیا جائے تو وہ کپڑا ہر طرف سے تار تار ہو جاتا ہے۔ اولاد کی بہتر تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہونے کی بنا پر آپ کے اسلاف معاشی، معاشرتی اور سماجی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

جوشؔ نے اپنے دور کی سماجی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمانوں کے زوال ور انحطاط کی ایک بڑی وجہ تعلیم سے دوری تھی۔ ''یادوں کی برات'' میں جوشؔ اپنے خاندان کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ انہوں نے انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک پٹھان خاندان میں آنکھ کھولی اور اپنے بچپن کو بڑی بے فکری، عیش و عشرت اور ناز کے ساتھ گزارا۔ جوشؔ اپنے باپ سے زیادہ اپنے دادا سے زیادہ متاثر تھے۔ اپنے گھریلو ماحول کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں ان کا گھر رکھ رکھاؤ میں صاحب حیثیت لوگوں کے روایتی ماحول کی طرح کشادگی پر مشتمل تھا، جہاں ہمیشہ رونق رہتی۔ آپ کے گھر میں آسودگی کی وجہ سے بہت سے خاندانوں کے مرد و خواتین کی ملازمتیں جڑی ہوئی تھیں۔ ان میں مختلف پیشہ جات سے تعلق رکھنے والیاں شامل تھیں جن میں لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں، انائیں، دوائیں، کھلائیاں، استانیاں، پنکھے جھلنے اور کہانیاں سنانے والی خواتین شامل تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی عورتیں دور دراز سے زندگی کے چند اچھے دن گزارنے کی خاطر بطور مہمان ان کے گھر پر قیام و طعام کرتی رہتی تھیں۔

جوشؔ ملیح آبادی نے اس دور کے متوسط طبقے کی سماجی صورت حال کو بڑی وضاحت سے تحریر کر دیا ہے۔ مسلمان گھرانوں کی گھریلو زندگی کو دل کش انداز میں مصنف نے بیان کیا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں انہوں نے پوری آپ بیتی میں توازن اور احتیاط کو برقرار رکھا ہے حالانکہ ان کے افتادِ طبع میں تعلی کا عنصر غالب تھا لیکن سوائے ایک دو جگہ چھوڑ کر کہیں بھی انہوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہیں کیا۔ مصنف اپنی شعر و شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''شاعری، میری حاکم ہے، میں محکوم، وہ جابر ہے، میں مجبور وہ قاہر ہے، میں مقہور، وہ آمر ہے اور میں مامور۔ مصنف اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے چند بزرگوں نے دینی مصلحت پسندی کی وجہ سے ایک انوکھا اصول یوں وضع کیا کہ کلام موزوں پر مشتمل وہ اشعار ہوں جن کو بالقصد کہا جائے گا۔ آپ یہ اصول تسلیم

کرنے سے بالکل باز رہے۔"(۳۰)

درج بالا اقتباس میں مصنف اپنی شعر و شاعری کی خصوصیات کا اختصار سے بیان کرتے ہیں کیونکہ شاعری ان کی زندگی کا اثاثہ ہے۔"یادوں کی برات" آپ بیتی کو ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ایک حصہ مصنف کی ذاتی زندگی، ذہنی نشو ونما، خاندان، ملازمت اور معاشقوں سے تعلق رکھتا ہے۔دوسرے حصے میں اپنے قرابت داروں، رشتے داروں اور چند قابل ذکر دوست احباب کا خاکہ پیش کیا ہے۔ان خاکوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو علمی اور سماجی اعتبار سے کوئی خاص مقام رکھتے ہیں اور نہ ان کو کوئی شہرت حاصل ہے۔ جوش نے اس طرح کے گم نام لوگوں کو اپنے زور بیان سے زندہ و جاوید کر دیا ہے۔ درحقیقت آپ بیتی کا پہلا حصہ ہی خودنوشت کے زمرے میں آتا ہے۔اس حصے میں ذاتی احساسات کا بیان منفرد انداز میں کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو واضح طور پر آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ قائداعظم اور گاندھی کی سیاسی کاوشیں بارآور ثابت ہونے لگیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سیاسی لحاظ سے قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جانے لگا۔ انگریز حکومت کو ہندو مسلم اتحاد ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا بلکہ انہوں نے تو ایک روشن اصول کے تابع حکومتی انتظام و انصرام سنبھالا ہوا تھا۔یعنی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" برصغیر کے عوام کو تو صرف مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت میں اس حد تک آگے پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ حکومت سے اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔یہی مذہبی منافرت تھی جس کی وجہ سے انگریز کی حکومت پھل پھول رہی تھی۔انگریز حکومت بذات خود امن پسند علاقوں میں بطور خاص فرقہ وارانہ عفریت کو ہوا دے کر اپنے مذموم اور گھناؤنے عزائم اور مفادات کو تقویت دینا چاہتی تھی۔ جب ہندو مسلم سفارت کاری کا آغاز ہوا تب ہی حکومت کے کان کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔انہوں نے فوراً ہندو مسلم اتحاد کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے اپنے مہروں کو میدانِ عمل میں اپنا اثر و رسوخ اور کردار ادا کرنے کے لیے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے تاکہ جلد سے جلد اس مثبت سفارت کاری کی دیوار کو گرا دیئے جانے کا تحرک کیا جا سکے۔حکومت کی طرف سے مذہبی ہم آہنگی اور یگانگت کے فتنہ کے تدارک کے لیے جنگی بنیادوں پر حکمت عملی تیار کروائی گئی اور اس کا نفاذ بھرپور انداز میں کیا جانے لگا۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی میں "مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات" کے عنوان کے تحت انہوں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو اپنے منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔مہاتما گاندھی کے بارے میں ان کے تاثرات درج ذیل ہیں:

> "مولانا آزاد کے ساتھ گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے، میرے ذوق جمالیات کے منہ پر تڑاق سے تھپڑا مار دیا۔اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی، دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور گاندھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟؟ مایوسی

نے مجھ کو ڈھانک لیا۔لیکن جب مختلف مسائل پر انہوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلا دیا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔''(۲۱)

مصنف نے ہندو مسلم فسادات، مہاتما گاندھی سے ملاقات، تحریک آزادی کے محرکات، فرنگی سے نفرت کا اظہار، قومی تحریک سے وابستگی کے اثرات اور سیاسی مشاہدات کو بڑے اختصار سے بیان کیا ہے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا حسرت موہانی ہندوستان کی اقوام کے لیے مکمل آزادی کی قرارداد پاس کروانے کے لیے سرتوڑ مساعی کر رہے تھے جبکہ دوسری جانب گاندھی تشریف فرما تھے جو کہ انگریز حکومت کے زیر سایہ آزادی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ ہندو راہنماؤں کی شدید مخالفت کے باوجود بھی مولانا حسرت موہانی اپنے کامل آزادی کے حصول کے اصول پر سختی سے کاربند رہے اور ہندوستانی اقوام کی مکمل آزدی اور خود مختاری کی ریزولیشن لے کر سٹیج پر پہنچ گئے تھے۔(۲۲)

جوشؔ ملیح آبادی نے اہم شخصیات اور معاصرین کا ذکر اپنے منفرد انداز میں کیا ہے۔سر سید احمد خاں کی انہوں نے کھل کر مخالفت کی ہے اور تحریک علی گڑھ کو قوم کے لیے باعث نقصان سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سر سید احمد خاں کے طریقہ تعلیم سے شاید سرکاری عہدہ تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی بڑا انسان نہیں بنا جا سکتا ہے۔انگریزی زبان و ادب کے پڑھنے اور پڑھانے کی مخالفت ہی کرتے رہے۔ وہ علامہ اقبال کے نظریات عشق و عقل کو بھی غیر اسلامی گردانتے تھے۔ ان کے مطابق علامہ اقبال کی دانش قرآنی تعلیمات سے تضاد رکھتی ہے۔ جوشؔ لکھتے ہیں:

''چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین تھے، اس لیے شروع شروع میں انہوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔''(۲۳)

جوشؔ نے اپنی آپ بیتی میں علامہ محمد اقبال کے نظریات اور تصورات پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے نطشے کے تصور ''مافوق البشر'' کو اپنے انداز میں ڈھال کر ''تصور شاہین'' قرار دے دیا ہے۔ ناقدین نے جوشؔ کے معاشقوں، ان کے آباؤ اجداد کے ذکر اور حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنے کی صداقت پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ درحقیقت یہ رویہ ایک قسم کا ثقافتی اور تہذیبی رویہ ہے جس سے جوشؔ محفوظ نہ رہ سکے۔ بلاشبہ بہت سے واقعات اور کارنامے ایسے ہیں جو جوشؔ کی ذات سے منسلک ہیں۔ ان پر اخلاقی پہلو سے کئے سوالات اُٹھائے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم آپ بیتی کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ہم پر منکشف ہوگی کہ جوشؔ نے کبھی بھی اپنے آپ کو اخلاق کا علم بردار نہیں کہا، بلکہ ان میں جو نقائص اور خامیاں تھیں ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی بے راہ روی کو بیان کرنا اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ جوشؔ لکھتے ہیں:

> ''جی ہاں، میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر، لیکن عشق بازی کی ہے، جی سے گزر کر،
> عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں، عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں،
> عیاشی نے لذاتِ حواس سے دوچار کیا۔''(۴۴)

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں بڑے والہانہ انداز میں معشوقوں، مختلف طوائفوں اور کچھ ہم جنسوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک مقام پر بیان کرتے ہیں کہ ہمارا کوئی بھی معاشقہ ناکام نہیں رہا اور عورتوں کو میں نے اپنی طرف راغب نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود کو میری طرف راغب کیا۔ آپ بیتی میں مصنف کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تحریر میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو شخصیت اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ معنی اخذ کیے جاسکتے ہیں کہ جوشؔ کے یہاں عشق کا تصور صرف عیاشی ہے۔ جوشؔ کے انداز بیان کی مشرقی معاشرہ اور تہذیبی اقدار نے کھل کر مخالفت کی اور یہی وجہ تھی کہ ناقدین نے بھی اس کو نشانہ بنایا۔ جوشؔ کے نزدیک عشق جدید وقدیم شعراؑ کے خیالات سے مختلف خیالات اپنائے ہوئے ہے۔ دراصل انھوں نے اسے ایک رئیس زادے کی بے راہ روی کے طور پر بیان کیا ہے۔ جس کو کسی سے سچی محبت نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے عشق و محبت کو دل کا جذبہ نہیں بلکہ ایک مادی شے سمجھا ہے آپ بیتی میں مصنف رقم طراز ہیں:

> ''اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس و فرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے عشق
> کرنے کے بدلے، اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر
> بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا، میرے بس کا روگ
> نہ تھا۔''(۴۵)

مصنف نے اپنے آپ کو ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے اور جاگیردارانہ رہن سہن کو پوری شد و مد سے پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو صرف تہذیبی زوال کو دیکھ کر نوحہ خوانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ تہذیبی آثار کو پوری آب و تاب سے بیان کیا ہے۔ حیدرآباد کی سماجی حالت کا نقشہ مصنف نے منفرد انداز میں قلم بند کیا ہے:

> ''ہائے کیونکر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا۔ ارزانی اور اس پر
> دولت کی فراوانی۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔''(۴۶)

دولت کی ریل پیل کے سبب اہل حیدرآباد کے صاحبِ حیثیت خاندانوں کے چشم و چراغ امیر کبیر حضرات کے لیے روز و شب مختلف قسم کی تقریبات اور محافل کے انعقاد اور ان میں بطور خاص شمولیت میں بسر ہوتے تھے۔ ان محافل میں جلسے، مجرے، ناؤنوش کی دعوتیں اور مشاعرے جن میں شراب و شباب کے خوب دور چلا کرتے تھے۔ علمی و ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ

تہذیبی و ثقافتی عوامل بھی بام عروج پر پہنچے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ رقص و سرود میں ڈوبی شامیں، شبستانوں میں ناچتی ہوئی اٹھتی جوانیوں کی امنگوں کی سوغاتوں سے بھری راتوں کی بہار، میلے ٹھیلوں کی رونق اور محرم راز لوگوں کی صحبت گویا بے خود کر دینے والے تمام ذرائع یکجا کر دیئے جاتے تھے۔

آپ بیتی میں ہندوستان کی مشرقی اقدار اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ایک قسم کی تہذیبی کشمکش کے طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے جوشؔ خود کو مشرقی تہذیب کے دل دادہ کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اپنی معاشرتی اقدار کے لیے ان میں ایک احساس تفاخر بہت نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی میں تہذیبی مظاہر جیسے رمضان، عید، بقر عید، محرم، شب برات، ہولی اور دیوالی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان مذہبی عناصر کو پس منظر میں رکھ کر ثقافتی سطح پر ان موقعوں پر اپنائی جانے والی روایات رسوم اور ان سے متعلق سماجی مصروفیات کی تفصیلات، تہذیبی مرقعوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس آپ بیتی میں سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ شخصی خاکوں کو بھی بطور خاص شامل کیا گیا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی کا آپ بیتی میں بے باکانہ انداز اور جرأت مندانہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شخصیت لکھنؤ کے اعلیٰ طبقہ کی تہذیب اور رہن سہن کی عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کو بے مثل انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آپ بیتی لکھنوی زبان و بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ آپ نے فارسی اشعار کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔

آپ بیتی کے تیسرے حصے بعنوان ''میرے چند قابل ذکر احباب'' میں انہوں نے اپنے دوست احباب کی شخصیت کو گہرے مشاہدے کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان شخصیات کی واضح تصویریں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جوشؔ مولانا عبدالسلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''وہ مشرقی علوم کے، حرف آخر، انسان اور شاہنشاہ تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے۔''(۳۷)

جوشؔ ملیح آبادی آپ بیتی میں ''میرے چند قابل ذکر احباب'' کے باب میں مشاہیر کا تذکرہ مفصل انداز میں کیا ہے۔ ان میں قابل ذکر نام نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، فانی بدایونی، آغا شاعر قزلباش، کنور مہندر سنگھ بیدیؔ، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، سردار دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبدالسلام، فراقؔ گورکھپوری، وحید الدین سلیم، مصطفیٰ زیدی اور مجازؔ شامل ہیں۔

آپ بیتی کے چوتھے باب ''میرے دور کی چند عجیب ہستیاں'' میں مصنف نے اپنے عہد کی قابل قدر سماجی شخصیات پر اپنے بے مثل انداز میں ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کہ اس دور کی سماجی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ بیتی میں راقم کو جن عجیب ہستیوں نے بطور خاص متاثر کیا ہے ان میں سرفہرست حیدر آباد دکن کے چیف جسٹس ناظم الدین

حسن ہیں۔ ان کے بارے میں جوشؔ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دکن میں تعیناتی کے زمانے میں روزانہ صبح کے وقت باغ میں سیر کرنے کے لیے جاتے تھے اور وقت مقررہ پر واپس گھر تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دن وہ حسب عادت صبح کے وقت باغ میں سیر کر رہے تھے کہ نظام دکن بھی باغ کا معائنہ کرنے کی خاطر پہنچے تو وہاں اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ چیف جسٹس ہیں اور جب سے آئے ہیں یہاں رشوت، سفارش اور ناانصافی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ نظام کے بلانے پر آئے اور خلاف دستور نظام کو جھک کر سلام کرنے کی بجائے سلام دعا کے بعد گھر کی طرف یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ میرا ٹہلنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

آپ بیتی میں جن مشاہیر زمانہ شخصیات کا بطور خاص بیان کیا گیا ہے ان میں چیف جسٹس نظم الدین حسن جو کہ انصاف پسندی کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ اس دور کے سماج میں بھی چند ایسی ہستیاں موجود تھیں جو کہ اصول پسند اور باکردار تھیں۔ آپ بیتی کے چوتھے باب میں علی گڑھ کے ایک گم نام، پٹھان شاعر کی عجیب طبیعت اور طرز عمل کو جوشؔ نے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اپنا کلام دوسروں کو سنانے کے لیے کتنے بے تاب رہتے تھے اور خاطر مدارت کے بعد زبردستی اپنا کلام سناتے تھے۔ جوشؔ ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”وہ اپنے مکان کے چبوترے پر ڈھکی لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر اُدھر سے گزرے اور وہ اس کو اپنا کلام سنائیں اور جب کوئی شاعر ان کے ہتے چڑھ جاتا تھا وہ اس کو اپنے کمرے میں لے آتے، بڑی مدارت کرتے، اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے۔“(۳۸)

جوشؔ ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ بہت بڑے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے نئی تراکیب اور بہت سے نئے الفاظ بھی وضع کیے۔ آپ کا ذخیرہ الفاظ بے حد وسیع تھا۔ آپ بیتی میں ہندی اور فارسی اشعار، الفاظ، محاورات، تشبیہات، کہاوتوں اور استعارات کے برمحل استعمال نے ان کی تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ادیب حضرات کی آپ بیتی پر مختلف آراء کے باوجود اس کی مقبولیت اور شہرت اس کی عظمت اور شان دار نثری سرمایہ ہونے کی دلیل ہے۔ سماجی، سیاسی اور ادبی حوالے سے یہ آپ بیتی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ جوشؔ کی شخصیت کا تعارف اس وقت تک نامکمل صورت میں رہتا ہے جب تک کہ ان کی زندگی کے سب سے دردناک واقعہ یعنی ترک وطن کا ذکر نہ کیا جائے۔ جوشؔ کو جس خدشے کے سبب ہندوستانی سکونت ترک کر کے پاکستان ہجرت کرنا پڑی وہ مسئلہ بقول ان کے معاشی سے زیادہ مذہبی اور تہذیبی تھا۔ ان کو ترک وطن سے کہیں

زیادہ اپنے بچوں کے تہذیبی اور لسانی مستقبل کا خیال تھا۔

جوشؔ کے کلام کی گھن گرج اور جذباتیت ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے۔ یہاں بھی الفاظ کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ بعض جگہات پر منظر نگاری اور واقعہ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی خوبیوں، خامیوں، اپنے ماحول، خاندان، احباب، معاصرین اور معاشقوں کا احوال بلا کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ جوشؔ کے بعض واقعات کے اظہار سے انانیت اور خود پسندی جھلکتی ہے لیکن یہ انانیت، خودپسندی اور مبالغہ آرائی دراصل جاگیر دارانہ ماحول اور شاعرانہ مزاج کی دین ہے۔ یہ ان کی فطرت ثانیہ ہے جو ان سے کسی وقت الگ نہیں ہوسکتی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض واقعات میں مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس آپ بیتی میں دورِ حاضر کے ایک عظیم شاعر کی زندگی کے مختلف گوشوں کے ساتھ اس دور کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو بھی بے باک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''لاہور کا جو ذکر کیا'' از گوپال متل

گوپال متل کی سرگزشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' اپنے عنوان ہی سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں لاہور کی خوش گوار یادوں کو مصنف نے انتہائی نفاست اور دل کش اسلوب بیان میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مصنف فکرِ سخن کے ساتھ ایک منجھے ہوئے ترجمہ نگار بھی تھے۔ آپ کی تحریر کردہ آپ بیتی کی پہلی اشاعت ۱۹۷۱ء میں ہوئی، یہ مختصر خودنوشت ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

مصنف اپنی داستانِ حیات کا آغاز ۱۹۳۲ء میں بی۔اے کے امتحان میں پاس ہو جانے کے بعد کرتے ہیں۔ آپ زمانہ طالب علمی سے ہی فکر وسخن کے دلدادہ تھے، لہٰذا شعر وشاعری کی محافل کے ساتھ ساتھ آپ نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی باقاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت میں اُردو کی پذیرائی میں کمی ہوگئی تو ہندو شعراء نے یہ بات پھیلا دی کہ مسلم اہل سخن ہندو قلم کاروں کی مہارت کو تسلیم کرنے سے احتراز برتتے ہیں۔ اس بات پر ہندو شعراء کی پذیرائی کا آغاز ہوگیا۔ مصنف کا خیال ہے کہ تقسیمِ ہند سے دونوں اقوام کو وقتی طور پر اپنے مال واسباب کا نقصان اُٹھانا پڑا لیکن اُردو کے ہندو شاعر حضرات کو بہت فائدہ پہنچا۔

مصنف شاعر اور ادیب لوگوں کے مسکن اسلامیہ کالج کے بالمقابل عرب ہوٹل کا احوال بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں بہت سے شعراء، ادباء اور صحافیوں کی آماج گاہ عرب ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر آپ سے جن شخصیات کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں ان میں ہری چند چڈھا، چراغ حسن حسرتؔ، عبدالمجید بھٹی اور باری علیگؔ شامل ہیں۔ عرب ہوٹل کے علاوہ ادیبوں کا دوسرا

اڈہ نگینہ بیکری ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر چراغ حسن حسرت سرکاری ملازمت ملنے کے بعد آنا شروع ہو گئے۔ باری علیگ جو کہ پہلے عرب ہوٹل کے نزدیک رہتے تھے بعد میں پرانی انارکلی میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور ان کا گھر نگینہ بیکری کے پاس ہی تھا۔ باری علیگ مولانا صلاح الدین کے ساتھ اکثر محفل کا حصہ بنتے تھے۔ مولانا صلاح الدین عاشق بٹالوی کو بھی اکثر یہاں لایا کرتے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر سید عبداللہ اور خود مصنف بھی نگینہ بیکری کی ادب و سخن کی ان محافل میں باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے تھے۔

گوپال متل ہندوستان کے سیاسی حالات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۵ء کے آخر میں ملک میں عام انتخابات میں یہ بات سب پر عیاں ہو چکی تھی کہ پنجاب میں مسلمانوں کی نشستوں پر مسلم لیگ ہی کامیاب ثابت ہو گی۔ مسلم لیگ کو کانگریس کی بے بسی کا سب سے زیادہ فائدہ احراری جماعت کو پہنچا تھا۔ عام انتخابات میں یہ ثابت ہو گیا مسلم لیگ پنجاب میں ایک مضبوط سیاسی جماعت ہے۔ شہر کے علاقہ جات کی نشستیں کانگریس اور مسلم لیگ میں منقسم ہو گئی تھیں لیکن دیہاتی علاقہ جات میں جہاں ووٹ برادری کی بنیاد پر دیئے جاتے تھے کچھ نشستیں یونینسٹ پارٹی کو بھی مل گئیں۔ اس لیے یونینسٹ پارٹی اور کانگریس نے مل کر حکومت قائم کر لی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد مصنف لاہور میں ہی قیام پذیر تھے اور آپ کا ارادہ لاہور شہر میں رہنے کا تھا لیکن جب لاہور میں فسادات کا آغاز ہو گیا تو آپ نے ہجرت کرنے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ ان دنوں آپ کی جائے سکونت انارکلی میں تھی۔ مصنف ان فسادات کا آنکھوں دیکھا احوال آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں:

> "یکا یک ماسٹر تارا سنگھ کے دل میں آئی کہ ان کے لیے کچھ کر گزرنا ضروری ہے۔ انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ایک بہت بڑے جلسے میں اپنی کرپان کو برہنہ کیا اور ہندوؤں اور سکھوں کو مشورہ دیا کہ ان کے لیے کچھ کرنے اور مرنے کا وقت آ گیا ہے۔"(۳۹)

مصنف اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں کہ ان فسادات میں ماہر اقتصادیات پروفیسر برج نرائن بھی لقمہ اجل بن گئے تھے جو کہ اکثر ان ماہرین معاشیات کی اس بات کی مخالفت کرتے تھے کہ پاکستان معاشی لحاظ سے کبھی مضبوط ملک نہیں بن سکے گا لیکن پروفیسر برج نرائن اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان معاشی لحاظ سے ایک مضبوط ملک بن کر اُبھر سکتا ہے۔

گوپال متل نے اپنی داستانِ حیات میں اپنی تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد ملازمت کے آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے حالات و واقعات، ادبی حلقوں کا احوال، ادیب حضرات سے میل ملاقات، مختلف ادبی رسالوں سے وابستگی کی تفصیلات اور ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کو مفصل انداز میں قلم بند کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف جن ادیب حضرات کے

بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں ان میں کرشن چندر، منٹو، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، کنہیا لال کپور، ایم حسن لطیفی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ، میرا جی اور ڈاکٹر سید عبداللہ اہم ہیں۔

''آشفتہ بیانی میری'' از رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی اتر پردیش کے شہر جون پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جون پور میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ مالی مشکلات کے سبب کچہری میں ملازمت اختیار کی۔ اس ملازمت کے ساتھ آپ نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور ایم۔اے فارسی کیا۔ آپ نے طالب علمی کے زمانے میں باقاعدہ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کو علی گڑھ میگزین کا مدیر بھی نامزد کیا گیا تھا۔ آپ شعر و ادب سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے پر آپ کالج میں بطور معلم اپنی ذمہ داریاں سرانجام دینے لگے۔ علی گڑھ کالج جب یونیورسٹی بنا تو شعبۂ اُردو قائم کیا گیا تو آپ کو شعبۂ اُردو کا چیئرمین تعینات کر دیا گیا تھا۔

رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' شائع ہونے کے بعد بہت زیادہ پسند کی گئی کیونکہ اس آپ بیتی میں مصنف نے اپنے مخصوص اسلوب بیان اور صداقت کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے ساتھ ساتھ نامور شخصیات کے خاکوں کو مختصر انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ اپنی سرگزشت میں آپ نے علی گڑھ کالج سے اپنی محبت کا اظہار برملا کیا ہے کیونکہ آپ نے اپنی زندگی کے بیالیس برس علی گڑھ میں گزارے تھے اس لیے آپ کی علی گڑھ کے درخشندہ تعلیمی ادارے سے انسیت ایک فطری عمل تھا۔ ابتدائی تعلیم چونکہ آپ نے جون پور سے حاصل کی تھی اس لیے آپ بیتی کے آغاز میں مصنف نے جون پور شہر میں بچپن کے حالات، سکول کے معمولات، جون پور کی تعلیمی و سماجی حالت اور شہر کی تاریخی حیثیت کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے:

> ''جون پور تاریخی شہر ہے وہاں شاہان شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ کئی جید مسجدیں، مزارات اور مقبرے، ایک عالی شان قلعہ، عیدگاہ، پل، پختہ سرائے اور کتنے سارے کھنڈر شاہی زمانے کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۴۰)

جون پور شہر ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب اور ثقافت کا ایک اہم گہوارہ رہا ہے۔ اس لیے مصنف نے بڑی وضاحت سے جون پور شہر کی اہمیت اور سماجی صورت حال کے بارے میں بیان کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جون پور شہر کے درمیان سے دریائے گومتی بہتا تھا جو کہ برسات کے موسم میں طغیانی لاتا تھا۔ وہاں شاہانِ شرقی کی باقیات میں ایک عالی شان مگر ویران قلعہ بھی موجود تھا، جس کے ایک سرے پر پبلک لائبریری ہے اور وہاں شہر کے لوگ کتابیں پڑھنے کے لیے کم جبکہ شعر

وادب پر گفتگو کرنے کے لیے روزانہ شام کو جمع ہوتے تھے۔ جون پور میں زیدہ آبادی شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والی تھی۔ شہر کے اکثر گھرانے ایسے تھے جو کہ مختلف اعتبار سے اپنی مخصوص پہچان رکھتے تھے، اہل جون پوراپنے ذوق وشوق کے مطابق مختلف قسم کے اشغال میں مشغول رہتے تھے۔ جن میں اہم پہلوانی، پنجہ آزمائی، بٹیر اور کبوتر لڑانے والے، علم اُٹھانے والے، طبل بجانے والے، ماتم اور سوز خوانی کرنے والے شامل تھے۔

آپ بیتی میں رشید احمد صدیقی نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے دور میں مسلمانوں کی سیاسی وسماجی صورت حال کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے حالات بہت تیزی سے خراب ہوئے اور مسلم قوم کو انگریز حکومت سے بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی لحاظ سے تنزل کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ اس پر آشوب دور میں مسلمانانِ ہند کی تعلیمی رہنمائی کے لیے جس شخصیت نے عملی مساعی کا آغاز کیا، وہ سرسیّد احمد خاں تھے، جنھوں نے مسلم قوم کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے پہلے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور باقاعدہ تحریک علی گڑھ کا آغاز کیا۔ مصنف سرسید احمد خاں کی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بڑے پُر خلوص، ہمدرد، فطین، جہاں دار، شعر وادب سے خاص رغبت کے حامل غیر معمولی صفات کے ساتھ ساتھ ماہر سیاسیات اور مذہب کے سچے شیدائی تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد یہ سرسید احمد خاں کی ہمہ جہت شخصیت کا فیضان تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تعلیم کے حصول پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانانِ ہند کو یہ باور کروانے میں بھی کامیاب رہے کہ تعلیم کے بغیر وہ اپنے جائز حقوق کو حاصل کرنے کی جنگ کبھی نہیں جیت سکتے۔ سرسید احمد خاں اپنی دور اندیشی کے باعث بہت پہلے یہ بھانپ چکے تھے کہ مذہبی، لسانی، معاشرتی اور سماجی اقدار میں حد درجہ تفاوت کے باعث کبھی بھی ہندو مسلم متحد نہیں رہ سکتے تھے۔ دو قومی نظریہ ہی مسلمانوں کے لیے راہ نجات ثابت ہو سکتا تھا۔

مدرسۃ العلوم کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے اس ادارہ کو مذہبی ادارہ نہیں بننے دیا بلکہ یہاں پر دینی اور دنیاوی علوم کا ایک موثر گہوارہ بنا دیا تھا۔ تعلیم وتربیت کے ساتھ اس عظیم درس گاہ نے نہ صرف ہندوستانیوں کی تعلیمی لحاظ سے تشنگی کو دور کیا بلکہ اتحاد و یگانگت کی نئی مثالیں بھی قائم کر دیں۔ اس مادرِ علمی سے مستفیض ہونے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور قادیانی طلباء کی کثیر تعداد شامل تھی۔ یہاں نہ صرف مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے فیض یاب ہوئے بلکہ مختلف مکاتب فکر سے منسلک شعراء کرام اور ادیب حضرات نے بطور استاد جویندگان علم کی پیاس بجھانے میں اپنی زندگیاں وقف کیے رکھی تھیں۔ علی گڑھ سے باہر عموماً مذہبی، لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کی آگ دہکتی رہتی تھی لیکن علی گڑھ کی علمی وادبی فضا اس نحوست سے کوسوں دور رہی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ علی گڑھ کالج و یونیورسٹی کے اساتذہ کرام کی نظر میں فرقہ پرستی کو ہوا دینا انسانیت کی تذلیل کے مترادف تھا، بلاشبہ علی گڑھ کے تعلیمی ادارے میں باہمی یگانگت اور بھائی چارے کو

فروغ دیا جاتا رہا تھا۔

آپ بیتی میں مصنف علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا میں شعر و سخن اور مشاعروں کے مسلسل انعقاد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ان دنوں ادبی محافل منعقد کروانا تہذیبی و ثقافتی روایات کا حصہ گردانا جاتا تھا۔ مصنف مشاعروں کی روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کا باقاعدہ سلسلہ عرب ممالک سے ہوتا ہوا ایران اور ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تھا لیکن یہاں یہ بات بھی حیران کن تھی کہ مشاعروں کا وہ چلن اور قدر و منزلت عرب ممالک میں دیکھنے کو نہیں ملی جو کہ ایران اور پھر ہندوستان میں دکھائی دیتی رہی۔ شعر گوئی اور شعر خوانی اہل عرب کے میلوں اور بازاروں سے شروع ہوئی تھی جو کہ ایران اور ہندوستان کے بادشاہوں کے ایوانوں تک پہنچی تھی لیکن بعد میں شعر و سخن کی محفل عام لوگوں کے ذریعے بازاروں تک پہنچ گئی ہیں۔ شعر گوئی کئی صدیوں کا سفر کر کے عرب کے بازاروں سے جنم لے کر ہندوستان کے بازاروں تک پہنچی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی سرگزشت ''آشفتہ بیانی میری'' بلاشبہ انیسویں صدی کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور لسانی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی نامور شخصیات کے تذکرہ جات بھی مفصل انداز میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مصنف نے اپنی داستانِ حیات میں علی گڑھ کی دل کش یادوں کو بڑے دلچسپ اور اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' از غلام السیدین

نامور ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین کی تحریر کردہ سرگزشت ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' تعلیم کو بہت مرکزی حیثیت فراہم کی گئی ہے۔ آپ بیتی میں دوسری اہم ترین بات یہ بھی ہے کہ مصنف اپنی حیات میں صرف تین ابواب ہی مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا تھا جبکہ باقی حصہ آپ کی ہمشیرہ صالحہ عابد حسین نے ترتیب دے کر آپ بیتی کو مکمل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آپ بیتی کا پہلا حصہ تو آپ بیتی کی تعریف پر پورا اترتا ہے جبکہ اس کا دوسرا حصہ سوانح نگاری پر مشتمل ہے۔ اپنی داستانِ حیات تحریر کرنے کے محرکات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب میرے دل میں اس کتاب کو لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو میں اس کے جواز کے لیے مفروضہ کلیہ کا سہارا نہیں لے سکا۔ نہ زندگی میں ایسے کارنامے ہیں جن کا بیان کرنا دنیا کی نجات کے لیے ضروری ہو! نہ بیان کی وہ قدرت کہ اس کے نشیب و فراز، اس کی محرومیوں اور کوتاہیوں، اس کی خوشیوں اور تھوڑی بہت کامیابیوں اور اس کی پوشیدہ کمزوریوں کو استادانہ مہارت کے ساتھ بے نقاب کر سکے۔''(۴۱)

مصنف اپنی آپ بیتی میں دراصل اپنے ہی خواہوں کے ساتھ اپنی رفاقت کے گزرے ساٹھ سالوں کو اپنی کتاب میں یکجا کر کے ان تمام شخصیت کی بے لوث محبتوں کو تحریری شکل میں لانا چاہتے تھے۔مصنف کا اپنی زندگی میں ایسے لوگوں سے پالا پڑا جنھوں نے انہیں زیست کے ایسے ایسے ہنر سکھائے جن کی بدولت وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک خوش قسمت انسان ہی سمجھتے رہے تھے۔ مصنف کا بچپن پانی پت میں گزرا، یہاں سے آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے علی گڑھ کے لیے رخت سفر باندھا۔علی گڑھ میں داخلہ ان کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہوا۔ آپ کو کتب سے ایک فطری انس ہو گیا تھا۔علمی تشنگی نے مصنف کو مختف موضوعات کی کتب کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب کیا .ور آپ کی کتب بینی کی عادت مزید پختہ ہو گئی۔مصنف کے علی گڑھ میں قیام کے دور میں ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف مسلمانانِ ہند کی اپنے حقوق کے حصول کے لیے بیداری شعور کی لہر اُٹھی۔ جس کی بدولت تمام تعلیمی ادارے بھی سیاسی طور پر سرگرم ہو گئے تھے۔ ابتدا میں تو مصنف سیاست سے دور رہنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بالآخر آپ نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی سماجی صورت حال کو دیکھا جائے تو وہ قدرے بہتر تھی کیونکہ مختف اقوام کے آپس میں سماجی تعلقات بہتر تھے۔کہیں خال خال ہی کسی مذہبی تہوار پر کوئی .یک آدھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا اور مذہبی منافرت کا جن ابھی بوتل سے باہر نہیں آیا تھا۔اس دور میں عموماً معاشرے کے شرفا مذہبی تہواروں میں کم ہی نظر آتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اگر کہیں کوئی دنگل فساد ہوتا بھی تھا تو اس میں عام عوام ہی آپس میں ایک دوسرے کے نبرد آزما ہوتی تھی۔

زیرِ نظر آپ بیتی میں مصنف ہندوستان کی سماجی اور معاشی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ معاشرے میں امیر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، جن امراء کے پاس مال و دولت وافر تھی وہ بھی دولت کو پوجنے کے قائل نہیں تھے۔ ان دنوں دولت عموماً ہندو تاجروں کے پاس زیادہ تھی، لیکن اس دور میں بھی شاید ابھی عزت کا معیار دولت کو مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے معاشرے میں اہل زر کے مقابلے میں اہل علم کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ ان دنوں سماج میں مجموعی طور پر اخلاص، رواداری، بھائی چارے اور دوسرے کا دکھ، درد بانٹنے کا چلن تھا۔مصنف کا کہنا ہے کہ ان کی والدہ کا طرزِ عمل اہلِ محلّہ کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ آپ کی والدہ ہر کسی کی امداد اور دستگیری میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ مصنف کے والد کے انتقال کے بعد حالانکہ آپ کے گھر کے معاشی حالات انتہائی دگرگوں ہو چکے تھے لیکن پھر بھی آپ کی والدہ کے دل میں ضرورت مند اور محتاجوں کے لیے ہمدردی کے جذبات موجود رہتے تھے۔ اہل محلّہ یا آپ کے رشتہ داروں میں اگر کہیں کوئی لڑائی جھگڑا ہوتا تو آپ کی والدہ معاملے کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جلد سے جلد حل کرنے کے لیے تگ و دو کرتی تھیں۔ آپ کی والدہ کا طرزِ عمل ایسا تھا کہ وہ دوسروں کے دکھوں اور تکالیف کو اپنا سمجھ کر انہیں کم سے کم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی تھیں۔

مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ پانی پت کے رہن سہن میں بہت سی محرومیاں بھی موجود تھیں لیکن وہاں اسلاف کی روایات کا پاس بھی قائم و دائم تھا۔ معاشرے میں سچ اور انصاف کی بالا دستی تھی، اس دور میں جھوٹ اور منافقت نے اپنے پنجے سماج میں پیوست نہیں کیے تھے۔ ان دنوں ہندوستان کے طول وعرض میں بہت سی سیاسی اور سماجی تحاریک نے جنم لینا شروع کر دیا تھا لیکن ان تحاریک کے اثرات ابھی تک پانی پت نہیں پہنچے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کے اس دور کو ہم بلاشبہ ایک نئے سماجی دور کا آغاز قرار دے سکتے ہیں کیونکہ یہ زمانہ ہندوستان میں مختلف سیاسی اور سماجی تحریکوں کی بدولت شعور کی بیداری کا دور تھا۔

مصنف آپ بیتی میں اپنے والد کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی بیالیس برس قومی وملی خدمات کی انجام دہی میں گزارے تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں ہمیشہ سچائی اور انصاف پسندی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ آپ کے والد کو خدمات کی تکمیل کے دوران کبھی شہرت حاصل کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ ان کی زندگی کا فلسفہ شاید یہ تھا کہ انسان کو ہمیشہ بلند مقاصد کے حصول کے لیے حوصلہ اور ہمت سے آگے بڑھتے رہنا چاہیے کیونکہ یہی زندگی کا خاصہ ہے۔

اختر الایمان کی داستانِ حیات کو اگر فنی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ آپ بیتی نامکمل ہے کیونکہ اس میں مصنف کی ستر سالہ زندگی کی مکمل سرگزشت کو بیان نہیں کیا جا سکا لیکن اگر اسلوبِ بیان کے حوالے سے پرکھا جائے تو یہ ایک قابلِ قدر آپ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو اس آپ بیتی کے بارے میں یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اگر مصنف اپنی زندگی میں اسے مکمل کر پاتے تو یہ آپ بیتی اُردو آپ بیتیوں میں ایک انتہائی اہم اور قابل قدر آپ بیتی بن کر اُبھر سکتی تھی۔

''جہانِ دانش'' از احسان دانش

''جہانِ دانش'' نامور شاعر احسان دانش کی آپ بیتی ہے۔ آپ کا اصل نام احسان الحق تھا۔ والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ آپ ۱۹۱۴ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ گھریلو حالات خراب ہونے کی وجہ سے مالی مشکلات کا بچپن سے ہی شکار ہو گئے تھے لیکن آپ نے معاشی بدحالی کی وجہ سے کبھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اُردو ادب میں آپ ''شاعرِ مزدور'' کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔

احسان دانش کی تصنیفات و تالیفات میں ''حدیثِ ادب''، ''دردِ زندگی''، ''تفسیرِ فطرت''، ''نوائے کارگر''، ''چراغاں''، ''آتش خاموش''، ''مقامات''، ''شیرازہ''، ''جادہ نو''، ''زخم و مرہم''، ''گورستان''، ''میراث مومن''، ''روشنیاں''، ''طبقات''، ''خضرِ عروض''، ''دستورِ اُردو''، ''لغات الاصلاح''، ''اُردو مترادفات''، ''اردو تذکیر و تانیث''، ''رموزِ غالب''، ''جہانِ دانش'' اور ''جہانِ دگر'' شامل ہیں۔ جبکہ غیر مطبوعہ کلام کے مجموعوں میں ''فصل سلاسل''، ''قفس رنگ''، ''قصر نگاراں''، ''زنجیر بہاراں''، ''سازِ شیون''، ''بام و برزن''، ''عکس و آئینہ'' اور ''غبار کارواں'' اہم ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت پاکستان نے آپ کو ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ ''جہانِ دانش'' پہلی بار ۱۹۷۳ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کے بعد اب تک آپ بیتی کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

آپ بیتی ''جہانِ دانش'' کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے لیکن درحقیقت یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، ان میں پہلا حصہ جس میں انہوں نے اپنے آبائی وطن، ماحول، تعلیم، لڑکپن کے رجحانات، مختلف مشاغل، دوست احباب کا طرزِ عمل، اساتذہ کرام اور اپنی زندگی کی پہلی محبت شمّی کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ''عملی زندگی'' کا عنوان دے کر اپنی زندگی کے مصائب اور ملازمتوں کا احوال، والد کی علالت، شعر و شاعری کا شوق، کاندھلے کا ادبی ماحول، شمّی سے ملاقاتوں کا احوال، شادی اور مخلص دوستوں کا تذکرہ شامل ہے۔ آپ بیتی کے تیسرے اور آخری حصہ جس کا عنوان مصنف نے ''ترکِ وطن'' تحریر کیا ہے۔ یہ حصہ ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جن اہم امور کا بیان ملتا ہے، ان میں ترکِ وطن، شورش کاشمیری، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں مزدوری، تلاشِ معاش، اردو پنجابی کا تقابلی احساس، شمّی کا آخری خط، منافقین کا رویہ، مشاعروں کے احوال، معاصرانہ چشمک، والد کا انتقال، تقسیم ملک کا ہنگامہ، قائداعظم کی رحلت اور قائدِ ملت کی شہادت کو بطور خاص آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔

آپ بیتی کے آغاز میں مصنف اپنے آبائی وطن کاندھلے کی مردم خیز مٹی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں پر متعدد شعراء کرام، ادیبوں اور جید علماء کرام نے جنم لیا تھا۔ مصنف نے اپنے ننھیال میں پرورش پائی۔ آپ کے نانا ابوعلی شاہ جو پیشے

کے اعتبار سے ایک سپاہی تھے۔ مصنف نے جب ہوش سنبھالا تو آپ کے والد نہر جمن شرقی میں کھدائی کے ٹھیکے داروں کے پاس جماعت دار کے طور پر ملازمت کیا کرتے تھے۔ جب مزدوروں کی جماعت داری کا کام نہ ملتا تو خود ٹوکری اور پھاوڑے اُٹھا کر مزدوری کیا کرتے تھے۔ مصنف کی والدہ اہل محلّہ کے کپڑے سلائی اور اجرت پر اناج پیس کر دیتی تھیں۔

آپ نے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم یکتائے روزگار حافظ سیّد محمد مصطفیٰ سے حاصل کی۔ سکول کی تعلیم ایک نہایت شفیق استاد منشی عبدالرحیم جلال آبادی سے حاصل کرنا شروع کر دی۔ اپنے استاد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھوں نے تیسری جماعت تک وہ باتیں ذہن نشین کرا دی تھیں جو کہ تا عمر ان کی علمی کم مائیگی کو چھپائے رکھے تھیں۔ ان کے ایک اور استاد منشی محمد عمر تھے جن کا طرزِ عمل ہمیشہ بہت سخت ہوتا تھا۔ معمولی باتوں پر وہ خوب بچوں کو مارا کرتے اور سکول سے نکال باہر کرنے کی دھمکی عموماً دیا کرتے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ میرے استاد کی بے التفاتی یا کچھ التفات ان کے حق میں بہتر ثابت ہوا کیونکہ وہ تعلیمی میدان میں بھٹکنے نہیں پائے لیکن اپنے استاد کی محبت ور حوصلہ افزائی سے محروم ہی رہے۔ مصنف چوتھی جماعت میں پڑھائی کے دوران اگرچہ زیادہ خوش نہیں رہے لیکن ان کے تعلقات چند ایسے ہم جماعت دوستوں سے استوار ضرور ہونے لگے تھے، جنھوں نے مستقبل میں انہیں قدم قدم پر سہارا دیا اور ان کی پرخلوص محبت مصنف کے لیے متاعِ حیات بنی رہی۔ احسان دانش نامساعد معاشی حالات کی بناء پر اپنی تعلیم مزید جاری نہ رکھ سکے۔ مصنف اگر اپنے ان دوستوں کے والدین کو علمی پیاس بجھانے کے لیے کہتے تو انہیں امید واثق تھی کہ ان کے دوستوں کے والدین ضرور ان کی مدد کرتے لیکن ان سے ہمیشہ برابر کی دوستی کے باعث ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ وہ ان سے تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے امداد طلب کرتے۔ دگرگوں معاشی عوامل کی بناء پر آپ کو چوتھی جماعت کے بعد ہی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔

مصنف اپنی عملی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے ایک رشتہ دار منشی محمود علی جو کاندھلے میں بطور محرر ضلع داری تعینات تھے۔ ان سے ''پٹرولی'' کا کام سیکھنے لگے۔ آغاز میں مصنف ڈاک کے رجسٹروں میں چٹھیوں کی نقول، پنسال لکھنا، شجرے ملانا، آب پاشی اور آب ضائع کا اندراج کرنے لگے۔ کام میں مہارت کے باوجود دفتر میں کوئی ملازمت کی صورت نہ نکل سکی تو بہ امر مجبوری دفتر چھوڑنا پڑا۔ منشی محمود علی کے والد منشی محمد علی شجرہ نویس تھے۔ ان کے گھر آمد و رفت کے سبب مصنف کو شجرہ نویسی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مصنف کو چند روز میں اس کام میں بھی مہارت ہو گئی لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ آپ نے کچھ عرصہ دِلّی پرنٹنگ ورکس میں ایک مشین مین کے ساتھ ''انک مین'' کی ملازمت اختیار کی لیکن ناموافق حالات کی وجہ سے جلد ہی ملازمت کو خیر باد کہہ کر دِلّی سے واپس کاندھلہ چلے آئے۔ بے کاری اور تنگ دستی کی وجہ سے مصنف کو بادلِ نخواستہ قصبہ کے ایک مہاجن کے پاس پانچ روپے ماہانہ کی تنخواہ پر نوکری کرنا پڑی۔ مہاجن امیر کبیر تھا لیکن اس کے تنگ دلانہ رویے اور غیر منصفانہ حرکات کے باعث مصنف نے خدا ترس مہاجن کی بیوی کے کہنے پر وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ احسان

دانش اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری عمر کی باؤلی گہری ضرور ہے لیکن اندھیری نہیں، جب میں اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں میں چراغ جل اُٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ درزیں تک نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھے میرے ماضی نے اس قدر کھندلا ہے کہ کہیں تو پٹخنیاں کھا کھا میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں چوٹل جگہیں اپنی سطح سے ابھری کی ابھری رہ گئیں۔ مگر نظر میں تہ رسی آ گئی۔''(۴۲)

احسان دانش بچپن سے ہی فطری طور پر شاعری کو پسند کرتے تھے۔ شاعرانہ میلانات کے ساتھ ساتھ قاضی محمد ذکی کے فیضان صحبت، شعر و شاعری کی مجالس سے دل چسپی، قصبے کے ارباب ذوق سے میل ملاپ اور مختلف شعراء کرام کے اشعار از بر ہونے کے سبب مصنف بھی شعر کہنے لگے۔ شعر و شاعری سے رغبت میں بزم شفیق نے بھی خاصا حصہ ڈالا۔ ان دنوں قاضی محمد ذکی اور حکیم شفیق الرحمٰن شفاؔ کے مکان پر ایک مخصوص بزم شاعرے کا انعقاد بھی آٹھویں دن کروایا جاتا تھا۔ مصنف اپنے آبائی قصبہ کاندھلہ کے سماجی و ادبی ماحول کے بارے میں تفصیل سے تحریر کرتے ہیں کہ جغرافیائی اعتبار سے ان کا قصبہ دلی، سہارن پور اور میرٹھ کے قریب ہی تھا۔ اس کے باوجود وہ تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی لحاظ سے آس پاس کے قصبہ جات اور شہروں سے ممتاز تھا۔ کاندھلہ کے ادبی ماحول پر داغؔ اور ذوقؔ کی شاعری کے اثرات کو بآسانی دیکھا جا سکتا تھا:

''کاندھلے کی شعری فضا پر داغؔ اور ذوقؔ کا رنگ غالب تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ قاضی محمد ذکی صاحب کے بڑے بھائی قاضی شیخ محمد صاحب رسواؔ استاد ذوقؔ کے سلسلے سے تھے۔ اردگرد کے شہروں میں تو شعری ذوق ممکن ہے ترقی کر رہا ہو لیکن یہاں ہنوز اُسی قدیم ڈگر پر ہی شعر کہا جاتا تھا اور اشعار میں وہی ذکر و اذکار اور معاملہ بندی کا زور تھا جو جنسی تعلقات کی بنا پر ظہور میں آتی ہے۔''(۴۳)

آپ بیتی میں احسان دانش کا کہنا ہے کہ وہ شادی کے بعد گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے مزید دب گئے۔ مصائب کو دور کرنے اور مالی آسودگی کے لیے مصنف نے جز وقتی بہت سے کام کیے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات کے مصداق اجرت اتنی کم ملتی تھی جس پر ان کے والدین اور بیوی کا گزارہ بمشکل ہوتا تھا۔ مصنف نے معاشی حالات میں بہتری کی خاطر لاہور جا کر مزدوری کرنے کا ارادہ باندھا۔ ان دنوں لاہور میں مختلف قسم کی تعمیرات کا سلسلہ چل رہا تھا اور یہاں مزدوروں کی اجرت بھی معقول تھی۔ لاہور میں ویسے بھی اس دور میں مزدور طبقہ اچھا خاصا بیدار تھا اور وہ اجارہ داروں سے اپنے جائز سماجی اور معاشی حقوق حاصل کرنے کا خواست گار بھی تھا۔ اگرچہ مزدور طبقہ کی آواز اس دور میں زیادہ بلند نہیں تھی لیکن ان کے جائز مطالبات

کی بات زیادہ دیر تک جبراً دبائی نہیں جاسکتی تھی۔ مصنف آپ بیتی میں اپنی ترک سکونت کا احوال اور لاہور شہر کی سماجی اور معاشی صورت حال کو ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''بے روزگاری سے تنگ آ کر میرے محلے کے کئی جیالے لوگ کاندھلے سے لاہور چلے آئے تھے، ان میں کچھ صندوق ساز تھے کچھ معمار، جب وہ لاہور سے کاندھلے آتے تو لاہور کے ایسے عجیب وغریب حالات و واقعات بیان کرتے کہ دل بیتاب ہو جاتا۔ انارکلی کی رونق، شاہی مسجد کی عظمت، جہانگیر کے مقبرے کی ضائی اور شالامار باغ کے طبقات کی موزونیت اور نور جہاں کے مزار کی کس مپرسی ان کے موضوعات سخن رہتے۔ تڑپ تڑپ جانے کے باوصف میری مجبوریوں کی وارورسن اور فرائض کی صلیب مجھے کہاں راستہ دینے لگی تھی۔''(۴۴)

''جہانِ دانش'' میں بجا مختلف مقامات پر سماج میں موجود جبر، معاشی اور معاشرتی اونچ نیچ پر مدلل انداز میں بحث کی گئی ہے۔ احسان دانش نے افلاس میں بھی جہد مسلسل اور عزت نفس جیسی خوبیوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا بلکہ ان کو زور سے تھامے رکھا۔(۴۵)

''جہانِ دانش'' میں مصنف نے اپنی پہلی محبت کی داستان بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ آپ کے بچپن کے دوست کا بھائی ایک بہت بڑا سارنگی کا استاد تھا، جو کہ ایک طوائف کا سنگتی تھا۔ اس طوائف کی لڑکی شمی ان دنوں سارنگی کی سرگم سیکھ رہی تھی، جب مصنف شمی پر دل وجان سے فریفتہ ہوئے۔ قدیم دور سے ہی ہمارے سماج میں طوائف کے کردار کو ہمیشہ بری نظر سے ہی دیکھا جاتا رہا ہے، لیکن مصنف نے طوائف کے عشق سے معاشرے کے اونچ نیچ کو پرکھا اور تمام جوانی اپنے عشق کو ہوس کی صورت اختیار نہیں کرنے دی۔ آپ بیتی میں مصنف اپنی محبوبہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> ''وہ مجھ سے قد میں تو ذرا بڑی تھی لیکن خوش رنگ شربتی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ پیاز کے گھارے کی طرح ابرو اور چھریرا بدن۔ جب وہ بولتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک غیر مرئی لذت کانوں سے دل پر چھن رہی ہے۔''(۴۶)

احسان دانش نے اپنی روداد عشق کو بڑی بہادری سے اوّل آخر بیان کیا ہے۔ شمی سے ان کا میل ملاپ ان کی زندگی کا اثاثہ ثابت ہوا کیونکہ شمی پیشہ کے اعتبار سے ایک طوائف ضرور تھی لیکن اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل لڑکی تھی۔ وہ ظالم معاشرے کی گناہ آلود سماجی زندگی سے فرار کا راستہ چاہتی تھی لیکن کوئی عزت دار انسان اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔ شمی سے تعلقات کی نوعیت، بے قراری، جذبات کی شدت، بے تکلفی کی گفتگو اور احساسات کا تبادلہ خیال قاری کو آپ بیتی میں ایک خاص قسم کی

دل چسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ بیان کرتے ہیں:

> ''جہانِ دانش'' میں عشق کا نمائندہ ہر حال میں اونچا انسان، مہذب انسان نظر آتا ہے۔ اسے ہم کسی جگہ بھی حیوان ہوتا نہیں دیکھتے۔'' (۴۷)

احسان دانش نے آپ بیتی میں جا بجا اپنے دور کے سماجی حالات کو مفصل انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاندھلے سے ترک سکونت کے بعد جب مصنف لاہور میں مزدوری کی غرض سے تشریف لائے تو یہاں پر اپنے ایک دوست صدیق کے کہنے پر ٹبی بزار میں نامہ نویسی کا آغاز کیا۔ لاہور شہر کی سماجی صورت حال کا اگر اس دور کے حساب سے جائزہ لیا جائے تو تب بھی جسموں کے کاروبار کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مصنف کو مجبوراً ایک چکلے میں حجام کی دکان کے تھڑے پر نامہ نویسی کے لیے جگہ دستیاب ہو سکی۔ جہاں پر آپ کو مختلف قسم کے لوگوں کی ذہنیت، سماجی شعور کی گراوٹ کا آنکھوں دیکھا تماشا اور کانوں سے سنا احوال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ مصنف چونکہ حساس طبیعت کے حامل تھے اس لیے وہ رات بھر یہی سوچتے رہتے کہ صبح ہوتے ہی انہیں اس بازار میں قلم دوات لے کر بیٹھنا ہوگا۔ جہاں تماش بین لوگ اپنے جسم کی بھوک مٹانے آتے ہیں۔ مصنف کو اس بازار میں چلنے پھرنے والی خواتین گویا ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے ان کے جسموں اور روحوں کو شدید طوفان جھنجھوڑ کر گزر گیا ہو۔ کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ اپنے آپ کو کسی مچھلی منڈی میں نیلامی کے لیے لائے ہوئے ہوں۔ مصنف نے اپنے دور کے لاہور شہر کی سماجی انحطاط کی صورت کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا ہے:

> ''یوں تو کوٹھوں پر دن میں بھی ان آدمیوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی جن کے نفس کے کتے طوائفوں کی گندگی کے زہر میں ڈوبے ہوئے ٹکڑے کھا کر کوٹھے سے نیچے راہگیروں کو بھونکتے رہتے تھے لیکن شام کے وقت شہر کے کچھ شوقین مزاج اور دفتروں کے کچھ ملازمین بھی رشتوں سے جیبیں کھنکھناتے زینوں میں جھانکتے پھرنے لگتے دریافت سے معلوم ہوا کہ ذرا رات گزرنے پر نااہل حکام اور چابک دست تاجر بھی اپنے دماغوں کا لرزتا ہوا گندا پارہ یہاں کی متعفن کٹھالیوں میں چرخ دینے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بعض جھکے ہوئے سرمایہ دار اور بلند منصب شرابی انہی کوٹھوں سے صبح تک کے لیے یہ بار گناہ اپنی موٹروں میں بھی لے جاتے اور صبح کو واپس چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے کارپوریشن کی گاڑی غلاظتوں کو اس کے مرکز پر پہنچا دیتی ہے۔'' (۴۸)

احسان دانش نے لاہور کے سماج کی حقیقت جاننے کے لیے کئی بار راتوں کو جا کر اس بازار میں دیکھا اور سنی سنائی باتوں کو بالکل درست پایا۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی کئی چراغ ٹمٹمانے لگتے اور جسموں کی خرید و فروخت کا بازار گرم ہونا شروع

ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ عورتیں غربت و افلاس کی ماری ہوئی ایسی مخلوق نظر آنے لگتی جنہیں مجبوراً نہ چاہتے ہوئے اس ذلالت کے گڑھے میں اترنا پڑتا تھا۔

آپ بیتی میں مصنف اپنے دور کے سماج پر بھی روشنی ڈالتے دکھائی دیتے ہیں مصنف سماجی صورت حال کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اہل اقتدار نے سماج کو تین طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلا طبقہ ایسا ہے جو اپنے عقبیٰ کے اصولوں پر یقین نہیں رکھتا اور اگر رکھتا بھی ہے تو صرف اور صرف دکھاوا کرنے کے لیے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اخلاق سے محروم، انصاف سے خالی اور رحم دلی ان میں نام کو نہیں ہے۔ دوسرا طبقہ پس ماندہ، مزدوروں، محتاجوں اور افلاس زدہ لوگوں پر مشتمل ہے جو مذہب کے احکامات کو مانتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن آئے دن پستی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس میں سفید پوش لوگ ہیں جو غیرت کی خاطر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو شاید گناہ خیال کرتے ہیں۔ اصلاح اور ترقی اس طبقے کے سامنے ہے مگر ان کی ناکامیوں کی ذمہ داری سرکار کی ایسی پالیسیاں ہیں، جن کی وجہ سے وہ نامراد رہتے ہیں۔ اس طبقے میں سے چند لوگ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن سماج ان کو جائز حق دینے سے قاصر رہتا ہے۔ مصنف کو ملک میں کوئی ایسی سیاسی جماعت بھی دکھائی نہیں دیتی جو پس ماندہ طبقوں کو ان کے جائز حقوق دینے کے لیے مسلسل آواز اُٹھا سکے۔ آزادی سے پہلے کی سیاسی صورت حال کو مصنف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''آج بھی ہر سیاسی شعبدہ باز اسی درمیانہ درجے کے چوک میں اپنی ڈگڈگی بجاتا اور ہر سپیرا یہیں اپنا پٹارا کھول کر بین کا لہرا شروع کرتا ہے، جس سے گلی محلے کے سنپولے مست ہو جاتے ہیں لیکن یہ معصوم طبقہ اس سے بے خبر ہے کہ سانپ کا ڈسا ہوا تو دوا دارو یا جھاڑ پھونک سے بچ بھی جاتا ہے لیکن ان سپیروں کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا۔''(۳۹)

احسان دانش قیام پاکستان کے سیاسی و سماجی عوامل اور صورت حال کو واضح کرتے ہوئے آپ بیتی میں تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے آزادی کی بہت بھاری قیمت ادا کی تھی۔ کئی کارکنان آزادی کو پھانسیاں لگیں، بہت سے قائدین کو جیل کی کال کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا اور خواتین کے پرامن جلوسوں پر بلاوجہ لاٹھیاں برسائی گئیں۔ تشدد پسند ہندوؤں کی اصلیت اس وقت سامنے آئی جب انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مظالم کا بازار گرم کیا۔ مسلمانوں پر ہندوؤں نے ثابت کر دیا کہ دو قومی نظریے میں ہی مسلمانوں کی بقاء ہے۔ حالانکہ چند مفاد پرستوں نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے آزاد خیالی اور عظمت انسانیت کا راگ آلاپا لیکن خودغرض اور تنگ نظر ہندو قائدین کی تخریبی سرگرمیوں اور متعصبانہ بداعمالیوں کی ایسی آندھی چلی کہ مسلمانوں کو ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کی پالیسی پر افسوس کرنا پڑا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب ان کا

ہندوؤں کے ساتھ رہنا خطرات سے خالی نہیں۔

کانگریس پارٹی کی مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں اور تعصب پسند سوچ کے سبب مسلمانوں پر ان کی حقیقت آشکار ہوتی گئی۔ مسلم لیگ چونکہ کانگریس کی اسلام دشمنی کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی اس لیے اس میں فرنگ پرستی بہت کم تھی۔ بعد میں یہی پارٹی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی سیاسی، معاشی مسائل کو حل کرنے کی خاطر اور ان کے جائز انسانی حقوق کو حاصل کرنے کے لیے بھرپور انداز میں قائداعظم کی سربراہی میں میدانِ عمل میں آ چکی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح پر بہت جلد یہ آشکار ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا اور مفاہمت کی مزید کوششیں کی گئیں تو آپس کے مناقشات بہت زیادہ بڑھ سکتے ہیں۔ قائداعظم نے نظریہ پاکستان کو بھرپور انداز میں پیش کیا اور مسلمانوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ثابت ہوئے کہ ہندو مسلم میں صرف مذہب کا فرق ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کی روایتی ہٹ دھرمی نے دوسرے تمام مذاہب کے خلاف خود کو منظم کر لیا ہے۔ قائداعظم کے ان خیالات پر ہندو راہنما بہت سیخ پا ہو کر میدان میں آ گئے۔ مگر آپ مسلمانوں کے لیے ایک الگ نظریاتی ملک بنانے کے لیے تگ و دو کرتے رہے کیونکہ انہیں یقین کامل تھا کہ مسلمان قرآن کے احکامات پر چل کر سیاسی اور سماجی اعتبار سے ترقی کی منزل طے کر سکتے ہیں۔ مصنف قیامِ پاکستان کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہو رہا تھا اور تصورات و تیقنات کا مجسمہ قائداعظم کی معرفت ایک نیا ملک مثالی ثقافت اور تابندہ تصور کی بنیادوں پر عالم وجود میں آ گیا۔ کسے معلوم نہیں اسلام اپنے یہاں تعصب کو راہ نہیں دیتا وہ تو مفتوحہ قوموں کے مذہبی اقدار و شرافت کی حفاظت کرتا ہے اور دشمنوں کی دل شکنی کو بھی روا نہیں رکھتا وہ کسی کو عورتوں، بچوں اور بیماروں پر ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔''(۵۰)

احسان دانش کی آپ بیتی میں جہاں بھرپور انداز میں سیاسی صورت حال کو جابجا بیان کیا گیا ہے۔ وہاں سماجی حالات کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مصنف نے جہاں شاعر و ادیب حضرات کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقدہ مشاعروں کا احوال بیان کیا، اس کے علاوہ سماجی شخصیت کا بھی مکمل تعارف پیش کیا ہے۔ مصنف نے بہت سے احباب کے خاکے شامل کیے ہیں جن میں شورش کاشمیری، م۔ حسن لطیفی، مولانا تاجور نجیب آبادی، نوح ناروی، قاضی محمد ذکی، اصغر جنگ، سردار کرپال سنگھ، مرزا شفاعت بیگ اور سردار سوہن سنگھ شامل ہیں۔

احسان دانش کی آپ بیتی بلاشبہ ایک مزدور کی دلیرانہ داستان حیات ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی وضاحت سے

بیان کیا ہے کہ افلاس ایک بہت بڑی مصیبت کا دوسرا نام ہے۔''جہانِ دانش'' قاری کے دل و دماغ پر جہد مسلسل کے اثرات رقم کرتی ہے۔(۵۱) مصنف آپ بیتی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''میں اس کتاب میں دیدہ و دانستہ سیاست کے اینچ پینچ اور مذہب کے رموز و غوامض کی طرف بلند بانگ ہو کر نہیں آیا اور نہ خود کو اس کا اہل خیال کرتا ہوں میں تو صرف محبت کا بندہ ہوں اور خلوص کو انسانیت کا زیور گردانتا ہوں۔''(۵۲)

آپ بیتی ''جہانِ دانش''، ''شاعرِ مزدور'' اور ''شاعرِ فطرت'' جیسے القابات کے حامل شاعر و ادیب احسان دانش کی پرجوش زندگی کے حقائق پر مبنی کہانی ہے۔ اس میں جہاں انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ دکھائی دیتا ہے وہاں ایک دور کی مکمل سیاسی وسماجی صورت حال بھی ملتی۔ گویا یہ آپ بیتی مصنف کی ایسی دل آویز یادوں کا مرقع ہے، جس میں مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تنقید وتبصرہ کے مختلف پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مشاہیر زمانہ کی دل کش یادوں، ادبا و شعراء کی محافل مشاعرہ کا احوال، مصنف کے احساسات اور ایک قابل قدر شاعر کی ذاتی زندگی کے رجحانات ومیلانات کے اظہار کا ایک گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔ جس میں ہر پھول اپنی جدا خوشبو کا حامل ہے۔

''اپنی تلاش میں'' از کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد کی پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء میں عظیم آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد پٹنہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور اُردو و فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ کلیم الدین احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی جبکہ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ ایم۔اے انگریزی کی تعلیم کے حصول کے لیے کیمبرج یونیورسٹی انگلستان روانہ ہو گئے۔ کیمبرج سے تعلیم مکمل کر کے مصنف پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے لگے تھے۔

آپ بیتی میں مصنف اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں مفصل انداز میں لکھتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم حافظ عبدالکریم سے حاصل کرتے تھے جبکہ سکول کی تعلیم کے لیے محمڈن اینگلو عربک سکول موجود تھا۔ اس سکول میں پڑھنے کی خاص بات یہ بھی تھی کہ یہاں سے مصنف کے والد اور تایا نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ چھوٹی کلاسز کے ساتھ ساتھ یہاں میٹرک کو فرسٹ کلاس پھر سیکنڈ، تھرڈ اور فورتھ کلاس کے درجے تھے۔ مصنف کو سکول میں فورتھ کلاس کے درجے میں داخل کروایا گیا تھا۔ مصنف کے خاندان والوں کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے گھر میں اکثر مشاعرے منعقد کروائے جاتے تھے۔ مصنف کا شاعری سے لگاؤ اس لیے بھی بڑھا کیونکہ آپ کے گھر میں بہت سے نامور شعراء کرام کے دواوین موجود تھے اور جن

کی مسلسل ورق گردانی سے مصنف کا شعروشاعری کا شغف بڑھنے لگا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ مصنف نے ان دواوین میں سے اپنی پسند کے انتخاب جمع کر رکھے تھے اور وہ انتخاب آپ نے ازبر کر رکھے تھے۔ اپنی سخن فہمی کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ محمڈن اینگلوعربک سکول میں داخلہ لینے سے پہلے آپ نے اپنی غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ آپ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی غزلیں بھی لکھا کرتے تھے اور عین الہدیٰ ثمر جو کہ مشہور شاعر بدر آروی کے بھانجے اور شاگرد تھے، ان کو اصلاح کے لیے بھجواتے رہتے تھے۔

مصنف وہابی تحریک کے حوالے سے پروفیسری کے دور میں ایک کتاب تحریر کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس تحریک کی اصل روح کو درست انداز میں عوام کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا تھا۔ انگریزوں کے نزدیک وہابی تحریک شاید کوئی نیا مذہب تھا اور جس کے پیغمبر سید احمد تھے۔ انگریز اس بات کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے کہ یہ تحریک اس وقت کی اوّلین ضرورت تھی کیونکہ اس دور میں مسلمان نہ صرف معاشی، معاشرتی، سماجی، اقتصادی، لسانی بلکہ مذہبی طور پر بھی تنزل کا شکار ہو رہے تھے۔ مصنف کے خیال میں مذہب اسلام کو سیاست سے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا اس لیے وہابی تحریک ایک مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریک تھی۔ آپ بیتی میں مصنف وہابی تحریک کے مقاصد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جس دور میں تحریک کا آغاز کیا گیا تھا، ان دنوں مذہب اسلام پر ہندوانہ رسومات کا غلبہ تھا۔ گور پرستی، تعزیہ داری اور دیگر شرک کی رسومات کا زور اہل ہندوستان میں بڑھ چکا تھا۔ بہت سے مذہبی عوامل میں مختلف بدعات کا زور تھا اور اگر وہابی تحریک کا آغاز نہ ہوتا تو آہستہ آہستہ مسلم تشخص خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ تحریک نہ صرف مسلمانوں کو پھر سے مسلمان بنانے کی تھی بلکہ اس تحریک کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنا بھی تھا۔ یہ جدوجہد انگریزوں کو اس ملک سے نکال باہر کرنے اور پھر سے ہندوستان میں مسلم ریاست کے قیام کے لیے بھی تھی۔

وہابی تحریک کے روحِ رواں سید احمد کی بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑائی کے دوران شہادت کے بعد بھی یہ تحریک بڑی شدومد سے جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس تحریک کو برقرار رکھنے کا سہرا اہل صادق پور کے سر رہا کیونکہ سرحد کے اس پار جنگ کو جاری رکھا گیا اور ہندوستان سے سینکڑوں مجاہدین کو محاذِ جنگ پر بھیجا جاتا تھا۔ اس تحریک میں تین اہم امور کو موثر انداز میں نبھایا گیا۔ پہلا کام تھا وعظ و تبلیغ کرنا، دوسرا مجاہدین کو طول و عرض سے جنگ کے لیے بھرتی کرنا اور تیسرا کام پورے ہندوستان سے چندہ اکٹھا کر کے فراہم کرنا تھا۔ یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے کئی برسوں تک جاری و ساری رہا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اگر سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تحریک ناکام رہی کیونکہ اس تحریک کے جو فوری مقاصد تھے یعنی انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ اور سکھوں کے خلاف جہاد کو جاری رکھنا، تکمیل پذیر نہ ہو سکے تھے۔ وہابی تحریک نے مذہبی اور

سماجی حوالے سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی کیونکہ مسلمانانِ ہند مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے گراوٹ کا شکار تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس تحریک نے مسلمانانِ ہند کو پھر سے مسلمان کر دیا۔ ہندوانہ مشرکانہ رسومات اور سماجی برائیوں کو مسلم معاشرے سے دور کر دیا تھا۔ وہابی تحریک کا ایک اور بڑا کام یہ تھا کہ اس نے اُردو نثر کو ترقی دی۔ وہابیوں کا ایک اہم کام وعظ اور دین اسلام کی تبلیغ تھا۔ تبلیغ اسلام اور معاشرے سے بدعتوں کو مٹانے کی غرض سے علمائے دین نے بہت سے رسائل و جرائد جاری کیے جن کی بدولت اُردو نثر کی ترویج ممکن ہوئی۔ ان رسائل اور کتب میں قرآن و حدیث کے احکامات، توحید کی دعوت، شرک سے دور رہنے کی ہدایت، عقائد اسلام کا پرچار، سنن رسول، بدعات سے پرہیز کی ترغیب اور اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا۔ آپ بیتی میں مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہابی تحریک کا ایک ایسا کارنامہ جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا وہ اُردو نثر کو نثر بنانا اور اسے ترقی دینا اور اس کی ترویج کرنا ہے۔ وہابیوں کا ایک اہم کام تھا وعظ و تبلیغ۔۔۔ البتہ انہوں نے جو رسالے اور کتابیں لکھیں ان کی مدد سے اُردو نثر کو نثر بنایا جا سکا۔''(۵۳)

وہابی تحریک کے زیرِ اثر بہت سے رسائل، جرائد اور کتب کو اُردو زبان میں بطور خاص شائع کروایا گیا اور ان میں زبان کی سادگی کو اس لیے ملحوظِ خاطر رکھا گیا تاکہ عام کم پڑھا لکھا آدمی بھی ان رسائل کو پڑھ کر اسلامی تعلیمات آسانی سے سمجھ سکے۔ مصنف آپ بیتی میں اُردو ادب سے فطری لگاؤ اور بچپن سے شعر و سخن کی طرف مائل ہونے کے بارے میں تفصیلی انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ مصنف اپنی داستانِ حیات میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کی سرگزشت میں ان کے عہد کے سیاسی و سماجی عوامل کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

''آپ بیتی'' از مولانا عبدالماجد دریابادی

عبدالماجد دریابادی ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو دریاباد، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ معروف محقق اور مفسر قرآن تھے۔ آپ نے انگریزی اور اردو میں جامع تفاسیر قرآن تحریر کی ہیں۔ آپ کئی ادبی اور اسلامی تنظیموں اور تحاریک کا حصہ بھی رہے ہیں جن میں اہم ''تحریکِ خلافت''، ''رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لندن''، ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ''، ''ندوۃ العلماء لکھنؤ''، ''شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ'' شامل ہیں۔ مولانا نے اپنی آپ بیتی میں اپنے اوصاف کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی مفصل انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

مصنف نے آپ بیتی میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اور بعد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال، قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کے مسائل، حکومتوں کے جبر کی داستانیں، اردو زبان سے سوتیلوں جیسا سلوک اور تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے انحطاط کے مختلف اسباب و اثرات شامل ہیں۔ مصنف نے اپنی ذات سے جڑے ایسے حالات و واقعات کا بھی برملا اظہار آپ بیتی میں کیا ہے جنہیں عموماً آپ بیتیوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ آپ نے آپ بیتی تحریر کرتے ہوئے حقائق کو جوں کا توں بیان کرنے کی عملی سعی کی ہے۔

مولانا کی آپ بیتی ۵۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں حکیم عبدالقوی کی جانب سے مصنف کی وفات پر سات صفحات کو ''حادثہ وفات'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کے کلمات وصیت کو چار صفحات پر اختصار سے تحریر کر دیا گیا ہے۔ مولانا نے آپ بیتی کا آغاز آباؤاجداد کے احوال، پیدائش، خانگی تعلیم سکول و کالج کی زندگی کے بعد ازدواجی زندگی، صحافت، تصنیف و تالیف، احباب اور مخالفین کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ آپ بیتی ایک ایسا موضوع ہے جس پر اکثر ادیب حضرات لکھنے سے گریز کرتے ہیں چونکہ اس میں اپنی ذات کے بارے میں اظہار بیان کیا جاتا ہے۔ مولانا نے آپ بیتی تحریر کرنے کے سماجی محرکات کے بارے میں یوں بیان کیا ہے:

> عزیزوں، دوستوں، مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴، ۷۵ سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں، سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے۔''(۵۴)

مولانا کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر میں کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے آپ کو گھریلو ماحول ایسا فراہم کیا گیا جو اخلاقی لحاظ سے مکمل تھا۔ آپ نے اسی صحت مند علمی ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی جن کی وجہ سے آپ مہذب ہو گئے تھے۔ مصنف اپنے دور کے اہم سماجی رسوم کے بارے میں بھی تفصیل سے تحریر کرتے ہیں۔ رسم بسم اللہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں باشعور اور پڑھے لکھے گھرانے میں بچوں کو ایک چھوٹے سے مجمع میں بٹھا کر قواعد بغدادی سے لفظ بسم اللہ پر انگلی رکھوا کسی پڑھے لکھے معتبر شخص سے بسم اللہ پڑھوا دی جاتی تھی۔ بسم اللہ کروانے والے کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ شریک محفل میں مٹھائی تقسیم کر دی جاتی تھی۔

مولانا چونکہ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے برے ماحول سے بچے رہے اور اپنے دامن کو بہت سے گناہوں سے بچا کر رکھا۔ مصنف اپنے زمانہ طالب علمی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہم مکتب طالب علموں کی عادات و اطوار کا براہِ راست اثر لازماً مجھ پر بھی پڑا تھا۔ سکول کے گندے ماحول میں اس دور میں بھی خباثت پائی جاتی تھی۔ آپ جب سکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو کالج میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوتے ہی ان کی زندگی میں نئے ردِعمل کا جنم ہو گیا تھا۔ کالج کی تعلیم کے آغاز سے ہی آپ دین سے دور ہونے لگے تھے۔ مصنف کفر و الحاد کے جذبات کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں دیکھتے ہیں دیکھتے وضع و قطع کھانے پینے، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے لحاظ سے مسلمان لیکن دلی طور پر اسلام چھوڑ چکا تھا۔ مصنف کا ماننا ہے کہ اسلام سے ارتداد کے باوجود بھی وہ کسی دوسرے مذہب سے لگاؤ پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ مصنف مغربی تہذیب کے اثرات کے نمودار ہونے کی بناء پر اپنے مذہب سے دور ہوتے گئے لیکن اسلامی شعائر کو دل سے مکمل طور پر ختم نہیں کر سکے تھے۔ کالج کی تعلیم سے فراغت کے بعد ہر نوجوان کی زندگی میں دو مراحل یعنی ملازمت اور شادی ایسے ہوتے ہیں جن سے انہیں گزرنا ہی پڑتا ہے۔

ازدواجی زندگی کے آغاز کی خوشیوں کو مصنف نے بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انسان کی سماجی زندگی میں چند ایسے واقعات ضرور ہوتے ہیں جو کہ ناقابل فراموش ہوتے ہیں۔ مولانا کی زندگی میں بھی دوسری شادی کا ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کے لیے بہت رسوائی کا سبب بنا۔ اس واقعے کا تذکرہ انہوں نے کئی بار کیا ہے۔ اپنے دوسرے نکاح اور طلاق کی نوبت تک پہنچنے کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''طلاق کا دینا تھا کہ معلوم ہوا ملک بھر میں ایک زلزلہ سا آ گیا! جن جن صاحبوں کو سچ (صدق کے نقش اوّل) سے کوئی بھی وجہ ملال تھی ان کی بن آئی، سب نے خوب خوب قلم کی کارفرمائی دکھائی۔''(۵۵)

ہر دور کے سماج میں چونکہ طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے اس وجہ سے مصنف کو کئی اطراف سے ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ مولانا نے اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں بھی اپنی آپ بیتی میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی جو صورت حال تھی اس کو جوں کا توں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں مسلمان سیاسی اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک وہ جو حکومت کے وفادار تھے اور اب اسی وفاداری کو مسلمانوں کے حق میں بہت زیادہ بہتر سمجھتے

تھے۔ دوسرے وہ جو حکومت کی پالیسی کے خلاف تھے اور وہ انگریزوں کے ظلم وستم اور غلامی سے نجات پانا چاہتے تھے۔ مولانا اپنی سیاسی زندگی کی صورت حال کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''میٹرک پاس کر کے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا، کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب ''آزادی'' کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں کلکتہ سے الہلال مولانا ابوالکلام کی ایڈیٹری میں بڑے آب وتاب اور اہتمام خصوصی کے ساتھ نکلا۔ میں اس سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا، بلکہ ان کے مخالفین ہی کے گروہ میں شامل رہا۔''(۵۶)

ادبی دنیا میں چند ایسی شخصیات لازمی موجود ہوتی ہیں جو کہ افراد معاشرہ پر اپنے کردار و افعال کے ذریعے اپنے اثرات چھوڑتی ہیں۔ مولانا پر جن ادبی شخصیات اثر انداز ہوئیں ان میں مرزا ہادی رسوا، رتن ناتھ سرشار، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا شبلی نعمانی اور سرسید احمد خاں شامل ہیں۔ روحانی طور پر آپ جن سے متاثر تھے ان میں مولانا عبدالحق کسمنڈی، مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہیں۔

کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر سید محمد حفیظ، خان بہادر ظفر حسین، مولانا مسعود علی ندوی ان لوگوں سے کافی مخلصانہ اور گہرے تعلقات تھے۔ معاصرین میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سید مناظر احسن گیلانی سے دل و دماغ دونوں بہت متاثر رہے۔ محسن شخصیات میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نواب سالار جنگ حیدر آبادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین شامل ہیں۔

سیاسی زندگی میں جن شخصیات نے ان کو متاثر کیا ان میں مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود اور چودھری خلیق الزماں ہیں۔ سماجی و معاشرتی زندگی میں جن لوگوں نے ان کے کردار و افعال کو متاثر کیا ان میں جسٹس کرامت حسین، خواجہ غلام الثقلین اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان کا شمار ہوتا ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک اہم شخصیت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی جنھوں نے آپ کو متاثر کیا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دوسری شخصیت ان سے بھی اہم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی، مدتوں ان سے شدید بدظنی میں مبتلا رہا اور اس بدظنی کے بڑھانے میں بڑا حصہ خود حضرت ہی کے بعض مریدوں، معتقدوں کا تھا، مدتوں یہ سمجھتا رہتا کہ یہ ایک متشدد

خشک مولوی ہیں، برطانیہ نواز اور نصرانیوں کے دوست۔ جب وصل بلگرامی نے ان کے وعظ پڑھنے کو دیے تو پہلی بار آنکھیں کھلیں اور پھر جب مراسلت کے بعد نوبت دید و زیارت کی آئی تو کتنے ہی کمالات ظاہر و باطن کھل کر رہے، علم و تفقہ، تصوف و شریعت کے جامع حسن عمل کے ایک زندہ پیکر اور ارشاد و اصلاح کے فن کے تو بادشاہ۔ وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔"(۵۷)

مصنف نے مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت اور طرزِ عمل کو وضاحت سے بیان کر دیا۔ مولانا عبدالماجد کی آپ بیتی کے درج بالا اقتباسات سے ان کے متنوع علمی، ادبی، دینی، سیاسی اور سماجی کارناموں کا سراغ ملتا ہے۔ مولانا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فلسفیانہ اور نفسیاتی تحریروں سے کیا۔ جس وقت انہوں نے یہ آپ بیتی لکھنا شروع کی ان کی حیثیت ایک ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن کی تھی۔ اسلامی اقدار سے شدید وابستگی، اعلیٰ اخلاقی اقدار سے لگاؤ، مسلم نشاۃ ثانیہ کی جستجو اور صدق گوئی ان کے قلم کی پہچان بن گئی تھی۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے اپنے ماضی کو آواز دی ہے۔ ماضی کی طرف فرد کا رجحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے خائف ہو، مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ تہذیب جدید کے سیلاب کے آگے بند باندھنا دشوار ہے اور ہندوستان میں غلام مسلمان کا حال بے حال ہے۔

اس آپ بیتی میں ایک مبلغ نظر آتے ہیں لیکن اس کی چاشنی بہرحال بہت ہلکی ہے اور آپ بیتی کے تقاضوں کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔ مولانا نے اپنے دور کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو صاف گوئی اور صداقت سے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

''مٹی کا دیا'' از میرزا ادیب

اردو کی اہم آپ بیتیوں میں شمار کی جانے والی میرزا ادیب کی داستانِ حیات ۱۹۸۱ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس آپ بیتی کے کچھ حصے مختلف رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ان رسائل و جرائد میں ''اُردو ڈائجسٹ''، ''قومی ڈائجسٹ'' اور ''ماہ نو'' اہم ہیں۔ مصنف ۴ر اپریل ۱۹۱۴ء کے دن محلہ ستھا، بھاٹی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ مصنف اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ان کے دادا میرزا غلام حسین بڑے اثر و رسوخ کے مالک اور عالم فاضل تھے۔ آپ کے دادا افغانستان کے شہر قندھار سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ آپ کے والد اندرونِ شہر درزی کا کام کرتے تھے۔

مصنف نے آپ بیتی میں اپنے بچپن کے حالات کے ساتھ ساتھ لاہور شہر کی سماجی صورت حال کو بھی مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ کی عمر ساڑھے چار سال تھی جب آپ کی دادی انہیں اپنے گھر لے گئی تھیں۔ آپ کی دادی کا گھر چونکہ اندرون شہر جسے قدیم لاہور کہا جاتا ہے، واقع تھا۔ اس دور میں لاہور شہر کی اکثریتی آبادی میں ہندو شامل تھے جبکہ مسلمان اقلیت میں تھے۔ محرم کے مہینے میں اکثر مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی پانی اور دودھ کی سبیلیں لگاتے تھے۔ جہاں پر بغیر کسی مذہبی امتیاز کے ہر کسی کو پانی، دودھ یا شربت مہیا کیا جاتا تھا۔ ہندو ''دسہرے'' کے موقع پر مسلمانوں کے ساتھ منٹو پارک میں راون کے بت کو مل کر آگ لگاتے تھے۔ راون کے بڑے بت میں بارود بھر دیا جاتا تھا جو آگ لگانے پر دھماکوں کی آواز کے ساتھ پھٹنے لگتا تھا۔ دسہرے کے دوسرے دن سوانگ کی باری آتی تھی جنہیں ہندو رام لیلا کہتے تھے۔ ان میں رام کی زندگی کے مختلف واقعات کا سوانگ بھر کر جلوس نکالا جاتا تھا۔ ان دنوں ہندو دیوالی کا تہوار بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے۔ رات کے وقت ہر طرف چراغاں کیا جاتا تھا۔ دیوالی کی رات کو ہندو لکشمی دیوی کے سواگت کے لیے خصوصی تیاری کرتے تھے۔

مصنف آپ بیتی میں لاہور شہر کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں موسمی تہوار بسنت پوری آب و تاب سے منایا جاتا تھا۔ بسنت کے روز رنگ برنگی پتنگیں اُڑائی جاتی تھیں۔ اہل لاہور باقاعدہ اس تہوار کی تیاری کرتے تھے، خواتین بسنتی دوپٹے اور مختلف شوخ رنگوں کے لباس پہنتی تھیں۔ مہمانوں کو بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا اور ان کے لیے پکوان تیار کروائے جاتے تھے۔ میلہ چراغاں کی چہل پہل کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ اصل میں میلہ چراغاں شالامار باغ کے اندر لگتا تھا لیکن بعد میں انتظامیہ نے میلہ منانے والوں کے لیے شالامار باغ کا دروازہ بند کر دیا، جس کی وجہ سے میلے کی رونق ماند پڑنے لگی تھی۔ عموماً لاہور کے مضافات سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں میلے میں شامل ہونے کے لیے آتے تھے۔ میلے کا اہتمام بڑے جوش و خروش سے کیا جاتا تھا۔ میلہ چراغاں صرف لاہور کا ہی نہیں بلکہ پنجاب کے بڑے بڑے میلوں میں سے ایک اہم میلہ ہوا کرتا تھا۔ عیدین کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ ان کے عہد میں رواج تھا کہ عید کے دن سویاں پکا کر تمام

اہل محلہ میں بانٹ دی جاتی تھیں۔ مسلم یا غیر مسلم کی تخصیص بالکل نہیں تھی۔ غیر مسلم میٹھے کی اس سوغات کو بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ان دنوں ہندو مسلم امن وسکون سے رہا کرتے تھے۔ غیر مسلم آبادیوں میں مسلمان بھی رہتے تھے اور مسلم آبادی میں غیر مسلم بھی رہائش پذیر تھے۔ ہندو روزانہ کی بنیاد پر صبح کے وقت اپنی عورتوں کے ساتھ راوی میں اشنان کرنے کے لیے جاتے تھے، گویا صبح کے وقت سے ہی میلے جیسی صورت حال دکھائی دیتی تھی، ادھر ہندو اشنان کرنے نکلتے ادھر مسلمان فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے مساجد کا رُخ کرتے تھے۔ اس دور میں موری دروازے کے باہر ایک مخصوص قسم کا میلہ لگتا تھا جسے ''قدموں کا میلہ'' کہا جاتا تھا، اس میں جماعت کی صورت میں ڈھول کی تھاپ پر ناچنے اور گانے والے لوگ ہوا کرتے تھے جو چھوٹے بچوں کو اُٹھا کر لوریاں دیتے تھے اور بچوں کے والدین خوش ہو کر انہیں پیسے دیتے تھے۔

میرزا ادیب آپ بیتی میں ہندوستان کی سماجی صورت حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر نامہ بھی پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سیاست کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سیاسی عوامل میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے رہے، لیکن بالآخر کانگریس کے عروج کے دور میں کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد آپ بھی مسلم لیگ کے رکن بن گئے تھے۔ تحریکِ خلافت کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ تحریک کے کارکن ان کے محلے میں چندہ اکٹھا کرنے کے لیے چکر لگایا کرتے تھے۔ ان کے پردرد اور پراثر اشعار کی بدولت خواتین بڑھ چڑھ کر روپے پیسوں کے ساتھ ساتھ اپنا زیور تک اتار کر چندے میں دے دیا کرتی تھیں۔ ان دنوں مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ترک مسلمانوں کے لیے ایک فطری محبت اور لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تحریکِ خلافت کے دوران مسلم اکابرین کی مذہبی جذبات سے بھرپور تقاریر نے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ عداوتوں سے نکال کر اخوت اور بھائی چارے کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ خلافت کی تحریک کے دوران مصنف کو تین اہم سیاسی شخصیات پسند تھیں۔ ان میں مصطفیٰ کمال، انور پاشا اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ مصنف نے اپنی زندگی میں ہندوستان کی سیاست میں بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ میرزا ادیب مختلف تحاریک کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''میری زندگی پاک و ہند کی اس فضا میں بیتی ہے جس میں سیاست کی طوفان خیزی روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ نمک سازی کی تحریک میرے سامنے اُٹھی تھی۔ تحریک ترک موالات کے بھی کچھ مناظر میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے تھے اور یہ مناظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں زندہ ہیں۔ عدم تشدد کی تحریک کا بھی میں ایک عینی شاہد ہوں۔ میرے سامنے متعدد تحریکیں اُٹھیں اور ختم ہو گئیں۔ مولانا ظفر علی خان کی تحریک نیلی پوش، احرار اسلام کی تحریک سرخ پوش، مسجد شہید گنج کی تحریک، ہندوؤں کی شدھی کی تحریک، اہنسا کی تحریک۔''(۵۸)

لاہور کے سیاسی جلسے عموماً دِلی اور موچی دروازے کے باغوں میں ہوا کرتے تھے۔ جلسے جلوسوں میں جن سیاسی قائدین کو بطور خاص تقاریر کے لیے مدعو کیا جاتا تھا، ان میں مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر، چوہدری فضل حق، علامہ محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ کانگریس پارٹی کے جلسے اکثر موری دروازے کے باغوں میں ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مصنف نے جن سیاسی راہنماؤں کی تقاریر کو متاثر کن پایا ان میں پنڈت مدن موہن، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ دنی چند، ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر راجندر پرشاد قابلِ ذکر ہیں۔ میرزا ادیب شہید گنج مسجد کی تحریک کے دنوں میں قائداعظم محمد علی جناح کی پرجوش تقریر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''حضرت قائداعظم کو تقریر کرتے ہوئے میں نے شاہی مسجد میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ نحیف و نزار ہی تھے مگر آواز...... خدا کی پناہ...... جیسے بادل گرج رہا ہے۔''(۵۹)

ترقی پسند تحریک کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ اس انقلابی تحریک کا آغاز کیا گیا تھا۔ تحریک کے مخالفین کی سوچ یہ تھی کہ اپنے دور کے بڑے آمر ہٹلر اور مسولینی کے مخالف ایسی رائے عامہ ہموار کرنا ہے جو ان کی امن کے خلاف سرگرمیوں کو روک سکے اور امن کا پرچار بآسانی کیا جائے۔ دراصل یہ لوگ سیاسی میدانوں سے ادب کی دنیا میں وارد ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہیں ادبی تقاضوں سے زیادہ شناسائی نہیں تھی۔ ادب سے گہری آشنائی نہ ہونے کی بدولت یہ تحریک ادبی ہونے کی بجائے زیادہ سیاسی ہوگئی تھی۔ ادب کی خاصیت یہ ہے کہ جب سیاست ادب میں داخل ہوتی ہے، تو سیاست کا وجود ختم ہو جاتا اور وہ ادب کا حصہ بن جایا کرتی ہے۔ اس عمل کے متضاد جب سیاست کو ادب کے سر پر سوار کر دیا جائے تو ادب اپنے تقاضوں کو مکمل طور پر نبھانے سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کے موقع پر سیاسی لوگ ادبی تحریکوں میں شامل ہو کر انہیں ادبی کی بجائے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاست زدہ تحریکوں میں بدل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ ترقی پسند تحریک ہٹلر اور مسولینی کے جارحانہ عزائم کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، یہ ایک ٹھوس وجہ تھی لیکن اس کے علاوہ بھی اس تحریک کے کئی پہلو تھے۔ حکمرانوں کے آمرانہ نظریات اس تحریک کو وجود میں لانے کا ایک محرک بنے تھے لیکن صرف ایک ہی وجہ کو اس تحریک کی بنیاد سمجھ لینا بھی انصاف کی بات نہیں ہے۔

تحریکوں کا وجود میں آ جانا ایک طویل مسلسل عمل ہے۔ کوئی بھی تحریک اچانک نہیں اُبھرتی بلکہ اس کے پیچھے انسانی جذبات واحساسات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ داخلی اور خارجی سطحوں پر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے ادب میں غالب اور سرسید احمد خان روایت شکن اور عقلیت پسندی کے پرچارک تھے، جنھوں نے انسانی زندگی کے بارے میں سائنسی تدبر پر زور دیا تھا۔ قدیم روایات سے انحراف اور زندگی کے ہر شعبے میں عقلی استدلال کو اپنانے کے

لیے عملی مسائی ترقی پسندیت کی بنیادوں میں پہلی اینٹ ثابت ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کو ایک غیر ادبی اور سیاسی تحریک سمجھ لینا کسی خام خیالی سے کم نہیں ہے۔ یہ تحریک خالص ادبی تحریک تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر تحریک کی وابستگی ادب سے ہی ہوتی ہے کیونکہ ادب زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے اور ہر شعبہ زندگی سے ادب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل ہم ادب کو زندگی سے اور زندگی کو ادب سے دور نہیں رکھ سکتے کیونکہ انسانوں کی زندگی بہت سی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لیے ادب ہی بہتر انداز میں اقوام کی زندگی کی عکاسی کر سکتا ہے۔

میرزا ادیب ترقی پسند تحریک کے قائل تھے چونکہ مصنف ان دنوں ہندوستان کے صفِ اول کے ادبی مجلّے کے مدیر تھے۔ اس لیے ایک تو آپ ترقی پسند خیالات کے حامل ادیب حضرات کی فکر اور فہم سے خوب آشنا تھے۔ دوسرا ''ادب لطیف'' سے وابستہ بہت سے لوگ ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں سمجھے جاتے تھے۔ ان جملہ وجوہات کی بنا پر مصنف ترقی پسند تحریک سے براہِ راست متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ادب لطیف نے ہر لحاظ سے اس تحریک کا خوب ساتھ دیا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب اس تحریک کی آل پاکستان کانفرنس منعقد کروائی گئی تو مصنف دو وجوہات کی بنا پر اس کانفرنس کی تائید کرنے سے قاصر رہے۔ ایک تو قرار داد اس مفہوم کے تحت مرتب کی گئی کہ پاکستان کے صوبوں میں بولی جانے والی زبانیں قومی زبان بننے کا حق رکھتی ہیں۔ مصنف کو اس بات پر اختلاف تھا کہ اگر صوبائی زبانوں کو قومی قرار دے دیا گیا تو اردو زبان پاکستان کے صوبہ جات کے درمیان رابطہ کو کیسے برقرار رکھ سکے گی۔ ربطہ کی زبان کے بغیر قومی سلامتی کو کیسے ممکن بنایا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ کے جلسے میں باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اُردو ہو گی۔ قائداعظم کی مدبرانہ سیاسی بصیرت نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ پاکستان کا قومی اتحاد، لسانی اتحاد کے بغیر زیادہ دیر تک ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔

کانفرنس کی دوسری قرار داد رسائل و جرائد کے حوالے سے تھی۔ اس میں بطور خاص کہا گیا تھا کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رسائل و جرائد میں تحریک کے مخالف نظریات کے حامل ادیب حضرات کی تحریروں کو ہرگز نہ چھاپیں۔ مصنف کو اس قرار داد سے بھی اختلاف تھا اور آپ نہیں چاہتے تھے کہ مخالفین کی تحریروں کو محض فکر و آگہی کے تضادات کے سبب چھاپنے سے روک دیا جائے۔ مصنف نے بعد میں ترقی پسند تحریک کی مجلس عامہ کو اپنی ذاتی آراء سے تحریر انداز میں آگاہ کیا تو دوسرے روز اخبارات میں باقاعدہ خبر چھپی کہ میرزا ادیب کو ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف کے باعث نکال دیا گیا ہے۔ مصنف کو اس بات کا ادراک تھا کہ متذکرہ قرار دادیں قابل عمل نہیں ہیں یہ جلد ختم ہو کر رہیں گی، بعد میں آپ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ان قراردادوں کو ختم کر دیا گیا۔

میرزا ادیب اس فکر کے حامی تھے کہ ہر قوم میں موجود ترقی پسندی کے نظریات دوسرے ملکوں کی اقوام کے تصورات

سے یکسر مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر ملک کی تہذیب و ثقافت الگ الگ پہچان کی حامل ہوتی ہے۔ پاکستانی ادیبوں کے پاس قلم کی طاقت قوم کی امانت ہے۔ پاکستانی تہذیب کی جڑیں اسلامی اقدار و روایات سے منسلک ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہمارے ادیب حضرات کو جلد از جلد اس حقیقت کو تسلیم کر کے پاکستانی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ممکن بنانا چاہیے۔

انجمن مصنفین کے قیام کے بارے میں مصنف خامہ فرسا ہیں کہ رائٹرز گلڈ کی آغاز میں بہت مخالفت کی گئی تھی۔ انجمن کے قیام پر بڑا اعتراض یہ لگایا گیا تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان ادیبوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنی حکمرانی اور اقتدار کو مزید تقویت پہنچا سکیں۔ مصنف نے بعد میں گلڈ کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل اس وجہ سے کر لیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ انگریز حکومت نے بھی فورٹ ولیم کالج اردو کی ترویج کے لیے نہیں بلکہ انگریز افسروں کو اردو سکھانے اور کاروبار حکومت کو چلانے کے لیے قائم کیا تھا۔ مصنف کو بعد میں رائٹرز گلڈ کے اراکین سے میل ملاقات کا موقع ملا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ باقاعدہ مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بن کر اپنی خدمات سرانجام دینے لگے اور ادیب حضرات کے مسائل حل کرانے کی کوششوں میں مصروفِ عمل رہے تھے۔ حالانکہ ادیبوں کے روز افزوں مسائل بڑھتے رہے لیکن حتی الامکان مصائب کو کم کرنے کی تگ و دو جاری رہی۔ گلڈ کے متحرک کارکنان اور اراکین میں اشفاق احمد، میرزا ادیب، وقار عظیم، قتیل شفائی، ڈاکٹر وحید قریشی، حبیب کیفوی، محمد طفیل، ڈاکٹر رشید انور اور جمیل الدین عالی شامل تھے۔

میرزا ادیب آپ بیتی کے حصہ دوم کے آغاز میں اپنی خودنوشت کو تحریر کرنے کے مراحل اور اسباب کے بارے میں تفصیل سے رقم طراز ہیں کہ وہ اپنی دوسری تمام کتب کے بارے میں التزاماً مفصل انداز میں نہیں لکھ سکے کہ ان تصانیف کو کیوں اور کن حالات میں منصۂ شہود پر لایا گیا تھا۔ مصنف خصوصاً اپنی داستان حیات کو لکھنے کے اسباب پر اپنی خواہش کو دبا کر نہیں رکھ سکے تھے۔ خودنوشت کو تحریر کرنے کے پیچھے کارفرما اپنے جذبات کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ ان کی یہ تصنیف دوسری تمام تصانیف سے جدا اور مختلف ہے کیونکہ دوسری کتب افسانوی نثر یا تنقیدی مقالات پر مشتمل ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ تحقیق و تنقید پر کتب تحریر کرنے میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے کیونکہ ایسی اصناف ادب کے متعلقہ بہت سی کتب شائع ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کی نظر میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ جب کوئی ادیب اپنی داستانِ حیات کو خود صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ کسی شخصیت کا اپنی زندگی میں اپنی آپ بیتی کو چھپوا دینا ایک فساد انگیز کام ہے کیونکہ کسی ادیب کی کتب پڑھ کر قارئین کرام اس ادیب کے بارے میں اپنی ایک مخصوص رائے قائم کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اس مصنف کی آپ بیتی میں اپنی رائے کے برعکس حالات و واقعات کو پڑھتے ہیں تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میرزا ادیب کے ایک افسانوی مجموعے کا عنوان "حسرتِ تعمیر" ہے۔ ان افسانوں کے مختلف کرداروں میں ان افراد کی جھلک بہت نمایاں ہے، جنہیں مصنف نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ ان کرداروں کو تحریر کرتے ہوئے ایک دن مصنف کے

ذہن میں ایک سوال اُبھرا کہ ان افسانوی کرداروں کے مشاہدات کو قلم بند کرنے والے کردار (میرزا ادیب) کی کہانی کو بھی منظر عام پر لانا چاہیے۔ مصنف جب قلم لے کر آپ بیتی تحریر کرنے بیٹھے تو ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچپن کے دو منزلہ مکان کی تصویر اُبھری، پھر بازاروں میں آوارہ گردی اور کھیل کود کا زمانہ، پرائمری سکول کی تعلیم، اساتذہ کے کرخت چہرے، والدہ کی ایثار بھری ممتا، والد کا محرومیوں سے بھرا سخت لہجہ، احباب کا محبت آمیز سلوک، شباب کی منزل کے مشاہدات اور بھرپور ادبی سفر کے نشیب و فراز کی تصویر دکھائی دینے لگی۔ مصنف اپنی خودنوشت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''مٹی کا دیا، میرزا ادیب سے زیادہ اس دلاور علی کی سوانح عمری ہے جو ۱۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ میرزا ادیب بننے تک اس شخص نے لاہور کی گلیوں، کوچوں، بازاروں، باغوں اور درس گاہوں میں جو جو کچھ دیکھا تھا، جو جو کچھ محسوس کیا تھا۔ جو جو خوشیاں غم حسرتیں اور خواب اُس کے حصے میں آئے تھے......جس جس انداز سے اس نے اپنے روز و شب بتائے تھے...... یہ سب کچھ بلاکم و کاست اس کتاب کے صفحات پر معرضِ تحریر میں آ گیا ہے۔''(۶۰)

مصنف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی بھی آپ بیتی تحریر کرنے والا اپنی زندگی کے تمام حالات و واقعات کو مکمل طور پر لکھنے سے قاصر رہتا ہے اور داستانِ حیات میں قابلِ ذکر قسم کے مشاہدات کو ہی آپ بیتی کا حصہ بناتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے اپنے بارے میں لکھنے کا آغاز کیا تو انہیں ماضی کے اندھیرے راستوں پر یادوں کے کئی جگنو جا بجا چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے مگر جب مصنف ان سب کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے تو کئی جگنو یکبارگی چمک کر آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتے تھے اور بہت سے جگنو بآسانی ہاتھ میں آ جاتے تھے۔ ان آسانی سے میسر آنے والے یادوں کے جگنوؤں کی روشنی میں مصنف نے اپنی یادداشتوں کو صفحات کی زینت بنا دیا ہے۔ مصنف اپنی آپ بیتی کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے مصرعے ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے مصداق کارِ تخلیق کو کارِ جہاں کا حصہ خیال کرتے ہیں چونکہ کارِ جہاں بہت طویل ہے اور انسانی زندگی بہت قلیل ہے، اس لیے اضافہ جات کے باوجود ان کی آپ بیتی ابھی تکمیل کے مراحل طے کرے گی۔ مگر تکمیل کی منزل حاصل نہیں کر سکے گی۔ آپ بیتی کے بارے میں مصنف اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میں نے مٹی کا دیا اپنے پسینے اور لہو سے جلایا ہے۔ اور مجھے پورا پورا اعتماد ہے کہ یہ دیر تک جلتا رہے گا۔ دیر تک اپنی روشنی بکھیرتا رہے گا۔ کیونکہ ایک دیا وہ مٹی ہی کا کیوں نہ ہو جب اس میں جگر کا لہو جلایا جاتا ہے تو اس کی لو وقت کے جھونکوں کے سامنے لرز تو سکتی ہے، کبھی بجھتی نہیں ہے۔''(۶۱)

میرزا ادیب لکھتے ہیں کہ آپ بیتی کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا کوئی بھی انسان تحریر کر سکتا ہے شرط یہی ہے کہ اس میں دلچسپ امور بھی شامل ہوں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے شرط والی کسی بات کا خیال نہیں رکھا۔ کیونکہ اگر وہ ان باتوں کی طرف دھیان دیتے تو شاید ان کی آپ بیتی کبھی نہ چھپتی۔ مصنف کے بقول ان کے قارئین سرگزشت میں اس انسان کی تلاش ضرور کریں گے جو اپنے آپ کو مٹی کا دیا کہتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وہ بھی اسی انسان کے تعاقب میں ہیں، لیکن انہیں کبھی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شخص کسی سایہ میں تحلیل ہو چکا ہے۔

میرزا ادیب نے آپ بیتی میں جن سیاسی، سماجی، ادبی شخصیات اور احباب کا تذکرہ کیا ہے، ان میں غلام عباس، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کنیا لال کپور، خدیجہ مستور، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ، آغا شورش کاشمیری، محمد عبداللہ قریشی، مرزا محمد منور، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر، حفیظ تائب، شفیق الرحمٰن، لطیف کاشمیری، علامہ محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، حافظ محمود شیرانی، آغا حشر کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبدالرحمٰن چغتائی اور ایوب سرور شامل ہیں۔

آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' اپنے دل کش اسلوب اور لسانی صفات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جیتی جاگتی تہذیب و ثقافت کی مکمل تصویر معلوم ہوتی ہے۔ انہی خصوصیات کی بدولت میرزا ادیب کی یہ داستانِ حیات اردو آپ بیتیوں کی روایت میں ایک اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔ (۶۲) مصنف آپ بیتی میں تاریخ اور سماج سے جڑے واقعات کو اپنے اندر سمو کر خود کو اظہار کا ایک نیا وسیلہ بناتا ہے۔ مرزا ادیب نے بھی آپ بیتی میں اسی بنیادی اصول کو استعمال کرنے کی کاوش کی ہے۔ (۶۳)

''گردِ راہ'' از اختر حسین رائے پوری

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۱۲ جون ۱۹۱۲ء کو رائے پور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم رائے پور اور الیف۔اے کلکتہ سے پاس کیا۔ علی گڑھ سے ایم۔اے تاریخ کرنے کے بعد پیرس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے افسانہ نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ افسانوں کے دو مجموعے ''محبت اور نفرت'' اور ''زندگی کا میلہ'' تحریر کیے۔ تنقید کی دو کتب ''ادب اور انقلاب'' اور ''روشن مینار'' تصنیف کیں۔ بھرپور ادبی زندگی گزارنے کے بعد آپ ۲ جون ۱۹۹۳ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''گردِ راہ'' ۱۹۸۴ء میں مکتبہ افکار کراچی کے زیرِ اہتمام چھپ کر اپنے قارئین تک پہنچی۔ آپ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ایک معروف افسانہ نگار، شاعر اور نقاد تھے۔ آپ بیتی بلاشبہ اشتراکی اور ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامے کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ آپ بیتی حرفِ آغاز کے بعد ۲۰ درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے، ان میں ''زندگی کے ابتدائی سال''، ''کلکتہ کی یادیں''، ''علم و ادب کی سمتیں''، ''حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی''، ''یورپ کا پہلا سفر''، ''یورپ سے واپسی کے بعد''، ''پاکستان ناگزیر تھا''، ''دنیا بدل گئی''، ''سیرِ عالم''، ''ایران میں چار سال''، ''فلسطین میں چند ہفتے''، ''اسپین کی جھلکیاں''، ''اطالوی تاریخ وفن کے نقوش''، ''امریکہ کے چند تاثرات''، ''جاپان کی دلآویزی''، ''چند دیگر ممالک کی بھولی بسری یادیں''، ''ادب کا ماضی وحال''، ''حسن کی تلاش''، ''حقیقت کی تلاش'' اور حرفِ آخر'' شامل ہیں۔

آپ بیتی کے آغاز میں مصنف لکھتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں علم کے حصول کے لیے اپنے گھر کو خیر باد کہہ کر کلکتہ کی طرف عازمِ سفر ہوا۔ کلکتہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ اور پھر فرانس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے۔ مصنف اپنی عملی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے ۳۰ سال تعلیمی عملی مشاغل میں صرف ہوئے۔ اس کا دورانیہ ۱۹۴۲ء ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں شعبۂ تدریس سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء تک کا ہے، جب آپ یونیسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری معاشی لحاظ سے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اکبر حسین کا تعلق پٹنہ کے ایک صاحبِ حیثیت خاندان سے تھا۔ وہ علی گڑھ کالج اور ٹام سن انجینئرنگ کالج سے تعلیم حاصل کر کے محکمہ آب پاشی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے رائے پور میں معزز خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی زیب النساء سے شادی کی۔ مصنف کی والدہ ۲۶ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ آپ کی والدہ کی وفات کے وقت آپ کے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم کی عمر چھ

سال اور مصنف کی عمر تین سال تھی۔ دونوں بچوں کی پرورش کی ذمہ داری پیرن بی آپا نے نبھائی۔

دستور کے مطابق مصنف کو پہلے مکتب میں داخل کروایا گیا، جہاں بغدادی قاعدہ ازبر ہونے پر قرآن مجید کا درس دیا جانے لگا۔ آپ نے مکتب کے مولوی صاحب سے قرآن مجید کی عربی عبارت کا ترجمہ بھی پڑھانے پر اصرار کیا تو وہ سیخ پا ہوئے۔ مصنف چونکہ حساس تھے اور قرآن مجید کی عبارت کو ترجمہ اور معانی کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا چاہتے تھے اس لیے جلد ہی مکتب میں مزید پڑھائی ترک کر دی۔ تمام شہر میں اس بات کا چرچا کچھ یوں ہوا کہ بیٹا بچپن ہی سے اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے لگا ہے۔ آپ کے والد نے اس واقعے کے ردِعمل میں آپ کو ایک ہندی زبان کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔

مصنف کے زمانہ طالب علمی میں تعلیمی نظام پختہ ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں پرائمری کی تعلیم پانچ درجوں پر مشتمل تھی۔ پانچویں جماعت سے انگریزی زبان پڑھائے جانے کا آغاز کیا جاتا تھا۔ آپ کو بچپن سے ہی مطالعہ کتب کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ آپ نے جلد ہی ہندی زبان کی کتب پڑھنا شروع کر دیں اور ساتھ ہی ہندی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ مطالعہ کتب کا مصنف کو اس قدر اشتیاق رہا کہ آپ نے لائبریری میں موجود ہندی کی تمام کتابیں پڑھ لیں۔ پرائمری جماعتوں کی تعلیم کے بعد آپ نے انگریزی اور اردو زبانوں میں تحریر شدہ کتب کے مطالعہ کی عادت اپنا لی۔ سکول کی تعلیم مکمل ہونے تک مطالعہ کتب کی عادت کی بدولت آپ کو اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری آپ بیتی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کی سیاسی وسماجی صورت حال کو بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں باقاعدہ جنگ کی فتح یابی کے جشن منائے گئے۔ انگریزوں کے وفاداروں کو ان کی وفاداری پر انعامات سے خوب نوازا گیا۔ قیدیوں کو جیلوں سے رہا کیا گیا اور شہروں کو خوب سجا کر چراغاں کیا گیا۔ سکولوں کے بچوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ سیاسی وسماجی پسماندگی کے اس دور میں کانگریس پارٹی نے آزادی کے حصول کے لیے تحریک ترک موالات اور مسلمانانِ ہند نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا۔ ان تحاریک سے ہندوستان کی تمام اقوام کے اندر سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہونا شروع ہو گیا اور اہل ہندوستان کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کرنے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ ملک کے طول وعرض میں جلسے جلوسوں میں نہ صرف ولایتی مال بلکہ سرکاری دفاتر اور سکولوں کا بھی بائیکاٹ کر دیا گیا۔

مصنف بھی ان دنوں طلباء کے اس گروپ میں شامل ہو گئے جو کانگریس یا تحریک خلافت کے خواتین کے منعقدہ جلسوں میں سوراج یا خلافت کے سیاسی نوعیت کے پیغامات کو سنا کر بعد میں چندہ اگاہتے تھے۔ مصنف کو اپنے والد کی طرح سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ آپ کے والد سرکاری ملازمت کے باوجود ذہنی طور پر قومی سیاست سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کے والد باقاعدگی سے، ''الہلال'' اور ''کامریڈ'' اخبارات پڑھتے اور روزانہ شام کو ملکی سیاسی معاملات پر اپنے دوستوں سے بحث

ومباحثہ کرتے۔ ایک دفعہ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے ناگ پور میں منعقدہ جلسے میں آپ کے والد نے شرکت کی۔ مخبری ہونے پر حکام نے جواب طلبی کی تو معاملہ بگڑ گیا۔ جس پر آپ کے والد کی ترقی روک دی گئی۔ بعد میں انہوں نے احتجاجاً قبل از وقت ملازمت سے پنشن لے لی۔ جس کے باعث آپ کے گھریلو مالی حالات خراب ہو گئے تھے۔ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کے دوران ہندوستانی اقوام کے لاکھوں لوگوں کو جیلوں میں ڈالا اور ہزاروں کو قتل کروایا گیا۔ عدم تشدد کی ان تحریکوں کے دوران ''چوراچوری کے واقعہ'' کے بعد جب تحریک خلافت عروج پر تھی تو اچانک گاندھی نے روایتی عیاری دکھاتے ہوئے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان محض اس بنیاد پر کیا کہ عدم تشدد کی تحریک میں تشدد کا آغاز ہو گیا ہے، اس لیے تحریک کو ختم کیا جا رہا ہے۔ مسلمانانِ ہند کو تحریکِ خلافت کے یکدم اختتام کے اعلان کی بدولت ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن اس ہندوانہ ذہنیت کی عکاس شاطرانہ چال نے ہندو مسلم اتحاد کا پول کھول کر رکھ دیا۔

تحریکِ خلاف اور ترک موالات کے اثرات پر اگر بات کی جائے تو شاید مطلوبہ سیاسی مقاصد کے حصول میں ان تحاریک کی بدولت اہل ہندوستان خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے، لیکن ان تحریکوں کے مثبت سیاسی و سماجی اثرات یوں مرتب ہوئے کہ عام آدمی کا شعور بیدار ہو گیا۔ معاشرے میں نئی اقدار نے جنم لینا شروع کر دیا۔

آپ بیتی میں مصنف ۱۹۲۰ء کے بعد ہندوستان کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہیں کہ ان دنوں چھوٹے شہروں میں سینما یا تھیٹر نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ کھیل تماشا کرنے والے یا قصہ گو سٹیج پر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چند برس کے بعد ٹاکی فلموں کو دکھایا جانے لگا۔ فلموں کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی فلموں کی شہرت ہونے لگی اور فلم بینی کا عوام میں شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ فلم بینی سے قبل ہندوستانی لوگ عموماً مرغ، تیتر، بٹیر اور کبوتر بازی کا شوق رکھتے تھے۔ ہندوستانی اقوام کے درمیان سماجی اور مذہبی ہم آہنگی بھی پائی جاتی تھی، خصوصاً ماہ رمضان میں سحری اور افطاری کے اوقات میں مسلمانوں میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ محرم کا مہینہ اہل دکن کی روایات کے مطابق منایا جاتا تھا۔ تعزیے کے جلوسوں میں ہندو بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ہندو ہولی اور دیوالی کے تہوار بڑے جوش و خروش سے منایا کرتے تھے۔

گاندھی کی طرف سے تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کو یک بیک ختم کر دینے سے ہندوستانی اقوام کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، حالانکہ ان تحریکوں کے دوران ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے بھی بلند ہوتے رہے لیکن ان تحاریک کے اختتام پر ہندو مسلم نفاق کی ایسی ہوا چلی کہ ہندوستان کا امن و سکون اڑا کر لے گئی۔ ہندوؤں نے آریہ سماج، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے ذریعے مسلمانوں کی تضحیک پر اتر آئے یعنی مسجدوں کے سامنے باجماعت نماز کے اوقات میں بینڈ باجے اور ڈھول بجائے جانے لگے۔ گاؤ کشی پر مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا۔ مصنف کے نزدیک دو مختلف مذاہب کی اقوام کے درمیان اختلافات کے کئی پہلو تھے، جن کی جڑیں صدیوں سے پختہ ہو چکی تھیں۔ انگریز حکومت نے انہی اختلافات کو ہوا دی اور اپنا اقتدار مضبوط سے

مضبوط تر بناتے چلے گئے۔

ہندوستان کی سیاست میں ایک نئی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی نے دوبارہ عملی سیاست کی شروعات کی اور کانگریس نے ان کی راہنمائی میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا تاکہ انگریز حکومت کو اہلِ ہندوستان کے لیے آئینی مراعات فراہم کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں آئینی اصلاحات کے لیے لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا اور بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو منظور کروایا گیا۔

مصنف نے آپ بیتی میں عالمی سیاسی معاملات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے وقت مصنف پیرس میں قیام فرما تھے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ہٹلر پولینڈ پر حملے کی منصوبہ بندی مکمل کر چکا تھا اور جرمن وزیرِ خارجہ نے روس جا کر باہمی معاہدہ کر لیا تھا۔ ادھر اتحادی ممالک جرمنی کو روس سے جنگ کروانے کے منصوبے میں یہ بات بھول گئے تھے کہ سیاست میں نہ کوئی مستقل دوست ہوتا ہے اور نہ ہی دشمن۔ ہٹلر نے روس سے معاہدے کے بعد پولینڈ پر حملے کی تیاری مکمل کر لی اور دوسری طرف اتحادی ممالک پولینڈ کی سلامتی کی ضمانت دے چکے تھے۔ بالآخر جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تو انگلینڈ اور فرانس نے جوابی کارروائی میں جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ جنگ کا نقارہ بجتے ہی فرانس میں بلیک آؤٹ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہاں باقاعدہ فوجی قانون کو نافذ کر دیا گیا۔ اکیس سے پچاس سال تک کی عمر کے مردوں کو جنگ کے لیے مورچوں پر بھیج دیا گیا۔ جرمن افواج کی ممکنہ ہوائی بمباری کے پیش نظر اہل فرانس نے بڑے پیمانے پر شہروں سے دیہات کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ چند ہفتوں میں شہروں کے شہر خالی ہو گئے تھے۔ مصنف فروری ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی کامیاب تکمیل کے بعد وطن واپس تشریف لائے۔ اس دور میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں:

> ''جب میں مارچ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان لوٹا تو وہاں کی زندگی جنگ عظیم سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس کا نزلہ سیاست پر یوں گرا کہ کانگریس نے یہ کہہ کر صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا کہ فاشزم کی مخالفت کے باوجود وہ مرکزی حکومت میں فیصلہ کن شرکت کے بغیر برطانیہ سے تعاون نہیں کر سکتی۔''(۶۴)

کانگریسی وزارتوں نے بلاشبہ تین سال تک مسلم رائے عامہ کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ مسلم لیگ کے باقاعدہ حلقہ بگوش ہو گئے اور ان کانگریسی وزارتوں کے ختم ہونے پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانانِ ہند نے یومِ نجات منایا تھا۔ ان دنوں اکثریت اور اقلیت سے بات بڑھ کر قومیت تک پہنچ چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاس کر لی جسے ہندوستان کی کانگریسی قیادت نے قراردادِ پاکستان کا نام دیا تھا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اپنی آپ بیتی کے ساتویں باب بعنوان ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں عالمی سیاسی معاملات پر تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے مئی ۱۹۴۵ء میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ امریکی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی بدولت جاپان نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ مغربی سامراجی نظام کے حصے بخرے ہونا ناگزیر ہو چکا تھا۔ وہ دور گزر چکا تھا، جس میں یورپی ممالک فوجی اور صنعتی ترقی کے بل بوتے پر دنیا میں اپنا اقتدار وسیع تر اور مختلف اقوام کو سامراجیت کے پنجوں میں جکڑتے چلے جاتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد برطانوی حکومت نے بڑی عقل مندی سے برصغیر اور افریقہ کی محکوم ریاستوں کو آزادی دینے کا اعلان کیا، کیونکہ انگریز حکمرانوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد اس بات کا مکمل ادراک ہو چکا تھا کہ وہ اتنی بڑی سلطنت پر اپنا تسلط طویل عرصے تک قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ انگریز حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان کو بحیثیت مجموعی آزادی دی جائے اور ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی لیبر پارٹی نے ہندوستان میں عام انتخابات کروائے جس میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے اور کانگریس کو محض ہندو قوم کی حمایت حاصل ہے۔

انتخابات کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزیراعظم نے کابینہ مشن ہندوستان بھیجا، جن کی ذمہ داری یہ لگائی گئی تھی کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کو اس نکتے پر آمادہ کرے کہ ہندوستان میں قانون ساز اسمبلی ایک آزاد ملک کا آئین باہمی رضامندی سے تیار کر کے مخلوط حکومت قائم کرے۔ لیبر پارٹی درپردہ نو آبادیاتی نظام کی مخالفت کرتی تھی اور ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ کانگریس کی ہمنوا بھی تھی۔ گاندھی کا قریبی دوست کرشنا مینن لندن میں قیام پذیر تھا اور لیبر پارٹی کا سرگرم کارکن تھا۔ گاندھی کے لیبر پارٹی کے راہنما سٹیفورڈ کرپس سے اچھے تعلقات بھی تھے۔ کانگریس کے قائدین کو ان دیرینہ مراسم پر بہت زیادہ مان تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان تعلقات کی بنیاد پر اپنے من پسند فیصلے برطانوی حکومت سے منوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مصنف کیبنٹ مشن کی تجاویز کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرکز کے اختیارات صرف اور صرف دفاع، خارجہ اور رسل و رسائل تک رہیں گے جبکہ اس کے علاوہ تمام اختیارات صوبوں کے پاس رہیں گے، جن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ پہلے حصے میں بنگال اور آسام، دوسرے حصے میں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور تیسرے حصے میں ہندو اکثریتی علاقے شامل ہوں گے۔ مرکز کی عبوری حکومت میں بارہ نشستوں پر مسلم لیگ اور کانگریس کو مساوی انداز میں نمائندگی کا حق دیا جائے۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو منظور کر لیا تھا۔ وائسرائے نے روایتی کانگریس پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے طے شدہ تجاویز سے انحراف کرتے ہوئے مسلم لیگ کو نشستوں کی مقرر کردہ تعداد کو چھ سے کم کر کے پانچ کر دیا، جس پر مسلم لیگ نے احتجاجاً کابینہ مشن منصوبے کی منظوری کو منسوخ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد برطانوی حکومت نے لارڈ ویول کو سبک دوش کر کے ان کی

جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے ہند مقرر کر دیا۔ جس سے نہرو نے جلد اچھے مراسم پیدا کر لیے تھے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کی پہلی دستاویز قائداعظم اور نہرو کو پڑھا کر برطانوی حکومت سے منظوری کے لیے بھیج دی تھی۔ دستاویز جب ترمیم کے ساتھ واپس آ گئی تو وائسرائے نے اس دستاویز کو نہرو کو دکھایا جبکہ قائداعظم کو اس بارے میں مطلع نہ کیا گیا۔ نہرو کے اعتراضات کو خاموش سے مسودہ کا حصہ بنایا گیا جس مسودہ کے تحت ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے دورانِ مہاجرین کی صورت حال کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں:

> ''اس اعلان کے ساتھ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لاکھوں تو اکالی سکھوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے اور چالیس پچاس لاکھ لٹ پٹ کر پاکستان کی سرحد میں دھکیل دیئے گئے۔۔۔۔ اس تباہ کاری کے ساتھ ہندوستان نے جوناگڑھ پر یہ کہہ کر فوج کشی کر دی کہ پاکستان سے الحاق کا جو فیصلہ نواب نے کیا ہے، وہ اس کی ہندو رعایا کو منظور نہیں اور کشمیر پر یہ کہہ کر حملہ کیا کہ وہاں کے مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے۔''(۶۵)

مصنف پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد کے وسائل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہندوستان نے اثاثہ جات کی مد میں پاکستان کو پچھتر کروڑ روپے کی نقد رقم واجب الادا تھی، جس کی پہلی قسط بیس کروڑ روپے دینے کے بعد بقایا واجب الادا رقم دینے سے بھارت نے صاف جواب دے دیا تو گاندھی نے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا جس پر مجبوراً بھارت نے بقایا رقم ادا کر دی۔ اس رقم کی ادائیگی کی گاندھی کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی کیونکہ ان کی مسلمانوں سے اس ہمدردی کے جرم میں ہندو انتہا پسند تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ نے گاندھی کو قتل کروا دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد پہلا سیاسی بحران قائداعظم کی وفات کے بعد شروع ہوا، یہ ایک ایسا سیاسی خلا تھا جو کہ کبھی پُر نہیں ہو سکا۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ایک اور سیاسی بحران پیدا ہوا جو کہ بیس سال بعد پاکستان کے ایک حصے کو نگل گیا تھا۔ بعد میں بیوروکریسی اور آمریت کے گٹھ جوڑ نے پاکستانی سیاست کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ لیاقت علی خان کے عہد حکمرانی میں اگر پاکستان کا آئین بنالیا جاتا تو شاید ہم سیاسی انحطاط کا شکار ہی نہ ہوتے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ملکی اقتدار پر چند مفاد پرستوں کی پکڑ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دی جانے لگی۔ صوبائی عصبیت کو ہوا دی گئی، قومی اتحاد و یکجہتی پر کاری ضرب لگائی جانے لگی۔

آپ بیتی میں مصنف قرونِ وسطیٰ کے سیاسی حالات کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں ایمان کو عقل کے ساتھ ملا کر نہیں پرکھا جا سکتا تھا یعنی ایمان اور عقل ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ اس دور میں کلیسا کی گرفت عوام اور حکمرانوں پر

بہت مضبوط تھی۔ آہستہ آہستہ ایک مسلسل ذہنی شعور بیدار ہوتے صدیوں کا وقت صرف ہوا تو کلیسا کی پکڑ حکومتوں پر کمزور پڑنے لگی، تب علوم وفنون کی مدد سے انسان نے ترقی کی راہ اختیار کی۔ اسلامی تہذیب میں بھی اوائل میں مذہب اور علم کے درمیان زیادہ اختلافات نہیں تھے لیکن پھر عباسی خلافت کے اختتام کے بعد فروعی اختلافات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جس نے اب تک ختم ہونے کا نام نہیں لیا۔ انیسویں صدی عیسوی تک اگر تاریخ کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علم تک رسائی صرف امراء اور حکمرانوں تک ہی محدود رہی تھی۔ عام لوگوں کی تعلیم کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب اقوامِ مغرب میں صنعتی انقلاب آیا اور ان میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہمارے مزدور ان پڑھ رہے تو وہ کس طرح مشینری کا استعمال کریں گے۔ اس لیے انہوں نے صرف اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے عام آدمی کو تعلیم فراہم کرنے کا ارادہ باندھا۔

پاکستان میں تعلیم وتربیت کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہاں اب تک حالات مخدوش ہیں۔ بڑے زمیندار، نواب، سردار اور جاگیرداروں نے جان بوجھ کر اپنے علاقوں میں عوام کو تعلیم سے دور رکھا ہے، کیونکہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ اگر ان کی رعایا میں تعلیم عام ہوگئی تو کہیں ان کا شعور بیدار نہ ہو جائے۔ اگر عام عوام کا شعور بیدار ہوگیا تو ان کی زمینوں پر کام کاج کرنے والے مزارعے انہیں کیسے دستیاب ہوسکیں گے۔

مصنف انیسویں صدی عیسوی کے برصغیر کی سیاسی وسماجی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند نے سیاسی اقتدار کی تبدیلی کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم قوم انگریز کے نظامِ حکومت اور تعلیم سے باغی دکھائی دیتی رہی، اس سوچ نے انہیں اپنے ہی وطن میں ایک بے وطنی اور ذہنی فرار کی کیفیات سے دوچار رکھا تھا۔ اس بات کی ظاہری وجہ یہی تھی کہ جس زمین پر ان کے آباؤ اجداد نے صدیوں حکمرانی کی تھی، وہ اسی دھرتی پر محکوم رعایا کی حیثیت سے زندگی نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ مغربی سامراجیت نے برصغیر پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کی خاطر جو ظلم وستم روا رکھے تھے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی تھی۔ ہندوستان کے چند اہل عقل وفہم نے یہاں کے لوگوں میں اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی ایسی لگن پیدا کردی، جس کے سبب مغربی استعمار کے یہاں دن گنے جاچکے تھے۔ مسلم اکابرین کی عملی مساعی بالآخر بارآور ثابت ہوئی اور مسلمانوں کو ایک آزاد ریاست نصیب ہوئی۔ برصغیر کی تقسیم کے دوران ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ مہاجرین کی ہجرت عمل میں آئی۔ اس تاریخی ہجرت کی بنا پر آبادکاری اور روزگار کی فراہمی کے مسائل نے جنم لیا۔ بعد میں قومی یکجہتی، فروعی اور لسانی مسائل نے سر اُٹھایا جن پر آزادی کے ابتدائی ادوارِ حکومت میں وقتی طور پر قابو پالیا گیا لیکن بعد میں یہ مسائل پھر سے نمایاں انداز میں سامنے آنے لگے تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''گردِراہ'' گزشتہ صدی کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور سامراجی نظام کے اہم خدوخال کو واضح کرنے کے ساتھ علمی وادبی، سیاسی وسماجی شخصیات سے بھی متعارف کرواتی ہے۔ ان اہم شخصیات میں

مہاتما گاندھی، علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولوی عبدالحق، سر عبدالقادر، منشی پریم چند، حفیظ جالندھری، پکاسو، ترودا، پطرس بخاری، چراغ حسن حسرت، ن۔م راشد، مجازؔ، آغا حشر، جگرؔ، اصغرؔ، خالدہ ادیب خانم، پروفیسر حبیب، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور ڈاکٹر اقبال شیدائی شامل ہیں۔ آپ بیتی میں دنیا کی مشہور شخصیات کے افکار کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔ ان میں گوتم بدھ، نیوٹن، کارل مارکس، ہیگل، ٹالسٹائی، سارتر، آسکر وائلڈ، فردوسی، حافظ، رومی، ڈیگال، مسولینی، ہٹلر اور نپولین اہم ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف نے اپنے اسفار کا احوال بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز سے لے کر اختتام تک اسفار کی تفصیل کی بدولت ''گردِ راہ'' ایک سفرنامے کی شکل اختیار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے قاری مصنف کے روز و شب کی داستان کے ساتھ ساتھ سفرنامے کا لطف بھی حاصل کرتا جاتا ہے۔ مصنف نے جن اسفار کا ذکر کیا ہے ان میں اپنی دادی کے گاؤں پٹنہ، والدہ کے گاؤں پرستی کا دورہ، دریائے نربدا کے پاس سادھوؤں کے آشرم میں قیام، کلکتہ، علی گڑھ، حیدرآباد، اورنگ آباد، دہلی، شملہ، لاہور، کشمیر، کراچی، یورپ کے سفر کا احوال، ایران، فلسطین، سپین، امریکہ، جاپان اور افریقی ممالک کے اسفار کی سرگزشت شامل ہے۔

آپ بیتی میں مصنف نے اپنی زندگی کی داستان کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے رسوم و رواج، عالمی تحریکوں کے پس منظر اور پیش منظر اور بین الاقوامی تنازعات پر تجزیات کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ یہ صرف خودنوشت ہی نہیں بلکہ یہ زمانے کی روداد بھی بیان کرتی ہے۔(۶۶) آپ بیتی پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ راز و نیاز کا ایک نمونہ ہے۔(۶۷) آپ بیتی کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذاتی مشاہدات اور یادوں کا مرقع ہے۔(۶۸) مصنف نے اپنے حالات و واقعات کو سادہ معروضی انداز میں خودنمائی سے پرہیز کرتے ہوئے آپ بیتی کے پرلطف اسلوب میں پیش کیا ہے جو ناول کی کہانی سے زیادہ حقیقت پر مبنی ہے۔(۶۹)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی بلاشبہ اپنے دور کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کی آئینہ دار ہے۔ خودنوشت میں سوانحی واقعات اور مشاہدات کو منفرد اسلوب میں سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''گردِ راہ'' ایک فرد کی ذاتی زندگی کی کہانی نہیں ہے بلکہ مختلف اقوام کی داستان ہے۔ مصنف کی تحریر میں فکر و آگہی کی روانی کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے جو قاری کے فہم کے نئے دریچے کھول دیتی ہے۔

''شہاب نامہ'' از قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب ۱۹۱۷ء میں گلگت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ریاست جموں و کشمیر اور موضع چمکور صاحب ضلع انبالہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے انگلش کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ آپ ایک عمدہ نثر نگار اور ادیب بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ''یاخدا''، ''نفسانے''، ''ماں جی'' اور ان کی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' قابل ذکر ہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد میں وفات پائی۔

اردو ادب میں آپ بیتی کی صنف میں ایک اہم آپ بیتی ''شہاب نامہ'' ہے۔ درحقیقت یہ قدرت اللہ شہاب کے قلم سے نکلا ایسا شاہکار ہے جس میں پاکستان کے ماضی اور حال کے آئینے میں مستقبل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں پاکستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی صورت حال کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا۔ مصنف کا اسلوب بیان اتنا شاندار ہے کہ قاری آپ بیتی پڑھتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر آپ بیتی کے صفحات میں گم ہو جاتا ہے۔ راقم کو آپ بیتی پڑھتے ہوئے اکثر یہ گمان ہوا کہ وہ حالات و واقعات کو گویا اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور یہ تمام مشاہدات قدرت اللہ شہاب کے نہیں ہیں بلکہ میرے ذاتی مشاہدات ہیں۔

شہاب نامہ ۸۴۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم اور مسلم الثبوت آپ بیتی ہے۔ جس کو مصنف نے ۹ جون ۱۹۳۸ء کو تحریر کرنا شروع کیا۔ آپ بیتی کے ابتدائیہ میں ایک باب ''اقبالِ جرم'' ہے جس میں مصنف ابن انشاء کے سوال کہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی نصیب ہو تو اسے کس طرح گزارنا چاہو گے؟ کے جواب میں کہتے ہیں کہ میں خطاکاریوں اور غفلتوں کی اصلاح کر کے دوسری زندگی بھی ویسے ہی گزارنا چاہوں گا جیسے کہ موجودہ زندگی گزار رہا ہوں۔

وہ مذہب کے معاملے میں کبھی بھی کسی شک یا وہم کا شکار بالکل نہیں ہوئے کیونکہ مذہب کے بارے میں ان کے محدود علم کے باوجود خدا نے انہیں اسلام کی اصل روح کے بہت قریب رکھا اور وہ دین اسلام کی نعمتوں سے بھرپور انداز میں فیض یاب ہوتے رہے۔ مصنف اس بات پر بھی خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ وہ ایک دور دراز، دیہاتی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب و کامران رہے۔ دورانِ ملازمت انہوں نے کبھی اچھی جگہ تبادلہ کروانے یا من پسند عہدہ لینے کے لیے کسی کی سفارش نہیں کروائی اور نہ ہی سفارش سے کام لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے نوکری کے دوران کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کوئی سرکاری اراضی یا پلاٹ حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ صدر پاکستان کی طرف سے آٹھ مربع زمین انعام دینے کی پیش کش کو بھی لینا گوارا نہیں کیا۔ آپ نے اپنے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں خلوصِ نیت اور صدقِ دل سے کام لیا۔ حالانکہ دورانِ ملازمت ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ آپ نے چار مرتبہ استعفیٰ دینے

کے بارے میں سوچا۔ چوتھی دفعہ ان کا استعفیٰ منظور کر تو لیا گیا لیکن پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ کو جان بوجھ کر تین سال تک روک کر رکھا گیا۔ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنے خلاف تنقید یا الزام تراشی کو برداشت کرنا سیکھا ہے اور اس کے جواب میں تضحیک یا تردید کرنے سے گریز کیا ہے۔''(۷۰)

درج بالا اقتباس میں قدرت اللہ شہاب نے آپ بیتی کے آغاز میں اپنی زندگی کے طرزِ عمل اور حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے دورانِ ملازمت پیش آنے والی مشکلات کا بھی اختصار سے جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنی اوائل عمری کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانے میں جموں میں پلیگ کی وباء پھیل گئی تھی۔ اس وقت وہ چوتھی جماعت کے طالب علم تھے اور اکبر ہائی سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ سکول میں مولوی عبدالحنان جو دینیات اور اُردو کے استاد تھے ان کی بیوی صادقہ بیگم کو پلیگ ہوا تو آپ نے ان کے گھر جا کر ان کی خدمت کی۔ مولوی صاحب کی بیگم سے انس اور لگاؤ کا پیدا ہونا اس بات کا غماز ہے کہ مصنف کم عمری سے ہی بہت حساس اور خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ جب صادقہ بیگم کا پلیگ کی بیماری سے انتقال ہوا اور آپ نے تجہیز و تکفین میں جس طرح حصہ لیا وہ آپ کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جموں میں پلیگ اور سری نگر میں کولرہ کی وجہ سے ان کے اہلِ خانہ نے چمکور صاحب میں جائے سکونت اختیار کی۔

کشمیر سے ترکِ سکونت کے بعد مصنف چمکور صاحب میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس علاقے کی سماجی اور تاریخی حیثیت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ اس وقت یہاں سکھوں کے گردواروں کے علاوہ ایک خانقاہ بھی موجود تھی۔ ان گردواروں میں سب سے اونچا بادشاہ گردوارہ تھا۔ سکھوں کا ماننا تھا کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک صوبے دار نے کسی وجہ سے گرو کے دو بیٹوں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تھا۔ انہی کے نام کی مناسبت سے یہاں ایک ہائی سکول بھی قائم کیا گیا تھا، جس کا نام بابا اجیت سنگھ جھجاہری خالصہ ہائی سکول رکھا گیا۔

مصنف کو چمکور صاحب کے بابا اجیت سنگھ جھجاہری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہاں داخلہ کروایا جائے کیونکہ چمکور صاحب کے گرد و نواح میں دور دور تک کوئی کالج نہیں تھا۔ بالآخر آپ کو جموں واپس لوٹنا پڑا اور وہاں پرنس آف ویلز کالج میں داخل کروا دیا گیا۔

خالصہ ہائی سکول کے بعد کالج کی تعلیم کے حصول کے لیے داخلہ تو مل گیا لیکن ایک چھوٹے سے گاؤں کے دیہاتی ماحول سے نکل کر جموں شہر کے کالج میں پہنچا تو چند روز نئے پہناوے کوٹ، پتلون اور ٹائی کی وجہ سے سڑکوں پر چلتے ہوئے مصنف کو یوں محسوس ہوتا جیسے کپڑوں کے بغیر ننگا ہی گھوم پھر رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ کچھ عرصے بعد یہ احساس ختم ہوا۔

ہائی سکول کے زمانے میں انہیں اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا لیکن کالج میں پہنچ کر انہوں نے انگریزی زبان کو اپنا تختہ مشق بنایا اور کالج کی لائبریری میں جتنی انگریزی کی کتابیں تھیں اس کا مطالعہ کر ڈالا۔ آپ کے والد کو بھی انگریزی زبان پر کافی دسترس حاصل تھی۔ اکثر انہیں پاس بٹھا کر درخواست یا دیگر مضامین ڈرافٹ کرواتے رہتے تھے۔ روزانہ کی محنت شاقہ اپنا رنگ لا کر رہی۔ انہیں بھی آہستہ آہستہ انگریزی پر دسترس حاصل ہو گئی۔ اس زمانے میں انہیں بین الاقوامی مضمون نویسی میں پہلا انعام ملا تھا جس کا خاص چرچا ہوا اور کئی جگہات سے انہیں مبارک بادیں اور انعامات ملتے رہے۔

پرنس آف ویلز کالج کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں پہنچ کر آپ کو احساس ہوا کہ میں کسی زمرے میں شامل نہیں ہوں۔ اپنی کم مائیگی کے احساس نے مصنف کو سب سے علیحدہ رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں ان کی ملاقات چندراوتی سے ہوتی ہے جو لیڈی میکلیگن کالج کی سٹوڈنٹ تھی اور موہنی روڈ پر ہندو لڑکیوں کے ایک آشرم میں رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس سے قربت پیدا ہوتی گئی اور پھر دونوں سائیکل پر بیٹھ کر گھومنے پھرنے لگے۔ مصنف چندراوتی کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> ''چندراوتی کو لاہور میں رہتے کافی عرصہ ہو چلا تھا لیکن اب تک اس نے نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا تھا، نہ نور جہاں کے مزار پر گئی تھی، نہ شالیمار باغ کی سیر کی تھی۔ اتوار کے اتوار میں ایک بائیسکل کرائے پر لیتا تھا اور اسے کیریر پر بٹھا کے تاریخی مقامات کی سیر کرالاتا تھا۔''(۷۱)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کو چندراوتی سے والہانہ محبت ہونے لگی۔ وہ چندراوتی کے قریب ہونا چاہتے تھے لیکن وہ اتنا ہی ان سے دور ہوتی جاتی تھی۔ اس نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر مصنف چندراوتی سے لڑتے رہتے تھے۔ چندراوتی کو بھی جانے کس طرح ان سے محبت ہو گئی تھی لیکن وہ اپنی حرکات وسکنات سے اس کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی۔ چندراوتی کو آپ بے لوث محبت کے جذبات سے چاہتے تھے اور آپ کے ذہن پر جس طرح وہ چھائی ہوئی تھی اس کی موت نے آپ کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا کر دیا۔ اسی غم والم کے جذبات میں ڈوب کر مصنف نے ''چندراوتی'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جسے اختر شیرانی نے ''رومان'' میں شائع کیا تھا۔ مصنف جب کلاس روم میں بیٹھ کر افسانہ لکھ رہے تھے تو پروفیسر ڈکنسن نے ان سے کہا تھا:

> "Hello, roosting alone? where is your golden girl?"
>
> میری آواز مچھلی کے کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گئی اور میں نے سسکیاں لے کر کہا:
>
> "Sir, she reverted to the gold mine."(72)

آپ نے اپنے والد کی خواہش پر انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے داخلہ بھیجا تھا کیونکہ آپ کی دادی اماں نے آپ کے والد کو آئی۔سی۔ایس کا امتحان دینے کے بیے سات سمندر پار جانے سے روک دیا تھا۔اس لیے آپ کے والد کے دل میں ایک احساس محرومی کا روگ اندر ہی اندر خون کے کینسر کی طرح پھیلتا رہا اور انہوں نے اپنے خواب کی تعبیر یعنی مصنف کے انڈین سول سروس کے امتحان میں کامیابی سے امید لگا رکھی تھی۔ حالانکہ جب آپ دہلی میں امتحان دینے گئے تو آپ کا دل چاہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ لیکن اپنے والد کے خواب کو چکنا چور نہیں کر سکتے تھے۔آپ نے آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شامل ہونے والے دوسرے امیدواروں کے بارے بیان کیا ہے کہ برصغیر کے تمام صوبہ جات سے ساڑھے سات سو امیدواران امتحان میں شرکت کر رہے تھے۔ امیدواران میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ ان میں یونی ورسٹیوں کے پوزیشن ہولڈر، مقررین، کھلاڑی، انگریزی زبان کے ماہر، امیر بارعب سنجیدہ، ذہین و فطین، خوش پوشاک، خوش گفتار، نوجوانوں کے ہجوم تھے۔ لیکن مصنف سے کسی کو بھی شناسائی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف متکاف ہاؤس دہلی میں یہ سب ماحول دیکھ کر پریشان سے ہو گئے کہ ان سب کے درمیان میرا کیا مستقبل ہوگا۔

قدرت اللہ شہاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں کامیاب ہونے والے واحد مسلم امیدوار تھے۔ اس وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ بڑے بڑے لوگوں کی طرف سے مبارک بادیں آنے لگیں۔ آئی۔سی۔ایس کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد انہیں بطور اسسٹنٹ کمشنر بھاگل پور میں تعینات کر دیا گیا۔اس زمانے میں بھاگل پور میں وقفہ وقفہ سے فرقہ وارانہ فسادات ہوا کرتے تھے۔ اس دور کی آنکھوں دیکھی سیاسی وسماجی صورت حال کی نقشہ آرائی مصنف نے واضح انداز میں یوں کی ہے:

> ''جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے پردے میں سیاست کا جال پھیلایا، تو اس کے جلو میں ملازمین کا ایک لاؤ لشکر بھی اس خطہ ارض پر ٹڈی دل کی طرح اُمڈ آیا۔''(۷۳)

ان ملازمین میں عموماً ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے دوست احباب، بیٹے، بھتیجے، بھانجے شامل تھے۔جن کو ہندوستان میں ۵ پاؤنڈ ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ انہیں ذاتی کاروبار کرنے کی بھی مکمل اجازت تھی۔ چنانچہ ان میں سے اکثر و بیشتر ملازمین کمپنی کے کام کم اور اپنے ذاتی کاروبار کی طرف زیادہ راغب تھے۔ان ملازمین میں ایک رجحان یہ بھی تھا کہ وہ مقامی نوابوں، راجوں، زمین داروں اور رئیسوں سے تحفے اور نذرانے وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین چند برس میں کئی لاکھ کا مال واسباب اکٹھا کر کے اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے۔انگلستان پہنچ کر قیمتی جائیدادیں خرید کر اپنی بقیہ زندگی عیش وعشرت سے گزارتے تھے۔

مصنف نے اپنی آپ بیتی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کے لیے بھرتی کرنے والے ڈائریکٹر صاحبان جو کہ رشوت اور سفارش کے بدلے نوکریاں دیتے تھے ان کا پول کھول دیا ہے اور قاری کو انگریز حکومت کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے وسائل کو دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا۔ انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں کمپنی کے لیے بھرتی کرنے والے ڈائریکٹر حضرات نے اسامیاں فراخت کرنا شروع کر دیں۔ ہندوستان میں بآسانی مال و دولت کے حصول کے لیے انگریزوں نے جوق در جوق اسامیں خریدنا شروع کر دیں۔ ڈائریکٹر حضرات ایک ایک اسامی پر ملازم بھرتی کرنے کے لیے دو سے تین ہزار پاؤنڈ باقاعدہ رشوت وصول کرنے لگے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انگریز ملازمین کو اسامی رشوت سے ملی ہو یا سفارش سے ان کا اوّلین مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کر کے اپنے وطن انگلستان واپس جا کر عیش وعشرت کی زندگی گزاری جائے۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی انگریز ملازم ہندوستان پہنچ کر بحری جہاز سے نیچے اترتا تو سب سے پہلے خوش آمدید کے لیے ہندو بنیا پہنچ جایا کرتا تھا۔ لالچی ہندو بنیا ہر وقت انگریز ملازمین کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اپنے مفادات کی خاطر انگریزوں کے ذاتی کاروبار کے لیے سرمایہ تک ہندو فراہم کرتے، ٹیکس چوری کرنے کے طریقے، سمگلنگ کے سامان کی آمد و رفت کے راستے، گھروں کی آرائش و زیبائش کا سامان، کچن کے لیے سودا سلف، گھریلو ملازمین کا انتخاب، تحفے اور نذرانے حاصل کرنے کے لیے علاقے کے امراء کے ناموں کی نشان دہی اور انگریزوں کی جنسی بھوک مٹانے تک کی ذمہ داریاں ان ہندوؤں پر عائد ہوتی تھیں۔ ہندو بنیا ان تمام امور کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ انگریز ملازمین سے اپنے تمام قسم کے جائز اور ناجائز کام نکلواتا رہتا تھا۔

مصنف نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی رشوت خوری اور ہندو بنیا کے طرزِ عمل کو بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے ہر سماجی حد کو بآسانی پار کر سکتا ہے۔ بھاگل پور کے فسادات کو مصنف نے اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس دور کے متعصب ہندو اور انگریز افسران کی قلعی کھول دی۔ اس دور کے ہندو مسلم سماج میں سماجی بدنظمی اور معاشرے میں نفرت کا بیج بونے والوں پر وضاحت سے تحریر کیا ہے۔ بھاگل پور سے انہیں ضلع گیا میں ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے۔ مصنف نے وہاں کا نظم ونسق سنبھالنے کے بعد ان سے پہلے جو افسران کام کر چکے تھے ان کے کاموں کا بغور جائزہ لیا۔ یہاں بھی انہیں وہی چیزیں دکھائی دیں جن کا وہ پہلے مشاہدہ کر چکے تھے۔ انگریزوں کا صرف ایک مقصد تھا کہ جس طرح بھی ہو زیادہ سے زیادہ مال کمایا جائے اور اپنے ملک جا کر عیش وعشرت کی زندگی گزاری جائے۔

مصنف فطری طور پر کھلے دل کے مالک تھے اور عوام الناس کے بیے کام کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ معاشرے میں تمام برائیوں، ظلم اور زیادتی کو دیکھ کر بہت بے چین ہو جاتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کا زمانہ Quit India Movement کا دور تھا۔

انگریز حکومت سخت سے سخت قوانین نافذ کر رہی تھی۔ اس دور میں بنگال میں شدید قحط پھیل گیا۔ بھوک سے سسک سسک کر جان دینے والوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ خدمت خلق کے جذبے کے تحت آپ نے حکومت سے بنگال جانے کی اجازت لی اور کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر آپ نے افلاس زدہ لوگوں کو مصائب سے نکالنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ اس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں حکومت کی بے رحمی اور سنگ دلی کو مصنف نے آپ بیتی میں جابجا اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے بنگال کے قحط کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے ہر دردمند دل کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ درج ذیل اقتباس سے سماجی ناانصافی کی صورت حال واضح ہوتی ہے:

> ''بنی نوع انسان نے موت کا ذائقہ جن جن طریقوں سے چکھا ہے، ان میں بھوک کی موت سب سے زیادہ پر عذاب، کربناک اور اذیت دہ ہے۔ اس میں طائر روح ایک جست میں قفس عنصری سے پرواز نہیں کرتا بلکہ زندگی کا جوہر رگ رگ اور نس نس سے کشید ہو کر بدن کے پور پور، مسام مسام، روئیں روئیں سے قطرہ قطرہ دنوں اور ہفتوں ٹپکتا رہتا ہے۔''(۷۴)

آپ بیتی میں بنگال کی قحط سالی، حکومتی بے توجہی اور سماجی صورت حال کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس دور کے حالات اور کیفیات کا پورا علم ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہندوستان سے پہلے ان کی آخری پوسٹنگ اڑیسہ میں تھی۔ انہوں نے اڑیسہ کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کو بھی بیان کیا ہے۔ اڑیسہ میں جب آپ ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اسی زمانے میں تقسیم ملک کا زور تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کی ریشہ دوانیوں بالخصوص گاندھی اور نہرو کی سیاسی چالوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں انہوں نے کانگریس کو ایک ہندو پرست جماعت قرار دیا ہے۔ تقسیم ملک کے معاملے میں انگریزوں نے جس طرح ہندوؤں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے ساتھ سیاسی ناانصافیاں کیں، بالخصوص ریڈکلف کا غیر منصفانہ اور یک طرفہ فیصلہ جس کو مصنف نے طشت ازبام کرنے کی کوشش کی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کو منسٹری آف کامرس میں امپورٹ ایکسپورٹ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ آپ نے بڑی تندہی اور ایمانداری سے اس کام کو نبھایا۔ بہت سی مشکلات اور دشواریوں کو آپ نے بخوبی سلجھانے کی کوشش کی۔ قیام پاکستان کے بعد دنیا کی سب سے بڑی ہجرت دیکھنے میں آئی، اس وجہ سے مسلمانوں کو بہت بڑے مصائب سے بار بار گزرنا پڑا۔ مصنف نے ان تمام قسم کے آلام اور اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔

مصنف نے آپ بیتی میں ایک باب کا عنوان ''آزاد کشمیر'' رکھا ہے۔ اس باب میں انہوں نے کشمیر کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند تک جو کشمیر کے حوالے سے سیاسی معاملات گزرے ان کی تفصیل بیان کی ہے۔ اپنی تحریر میں

انہوں نے بتایا کہ کس طرح کشمیریوں کے ساتھ وعدے اور عہد نامے کیے گئے اور کس طرح ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کیا جاتا رہا۔ آر۔ ایس۔ ایس اور اس کے غنڈوں نے کس طرح کشمیری مسلمانوں پر مظالم ڈھائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی مکاری اور عیاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس مجرمانہ مکاری، دغا، فریب اور سازشانہ جارحیت کے ذریعے بھارت نے کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا، اس کی حقیقت ساری دنیا پر اظہر من الشمس تھی۔"(۷۵)

مسئلہ کشمیر کی سیاسی صورت حال کو مصنف نے واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ کس طرح بھارت نے سازشی ہتھکنڈوں اور جارحیت کا سہارا لے کر کشمیر کے عوام کو زیرِ عتاب رکھا ہوا ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے جن حقائق کو پیش کیا ہے وہ بلاشبہ تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ انہوں نے آنکھوں دیکھی وہ تمام باتیں پیش کر دی ہیں جس سے کسی تاریخ کے طالب علم کو اچھا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد آپ بہت اہم مناصب پر فائز رہے۔ آپ کو وزراءِ اعظم اور صدور کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔

آپ نے گورنر جنرل ملک غلام محمد، میجر جنرل سکندر مرزا اور ایوب خان کے دورِ حکومت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ بالخصوص صدر ایوب خان کی اصلاحات اور بیوروکریسی میں انہوں نے جو اہم تبدیلیاں کی تھیں ان سب کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ہم یہ کہیں کہ انہوں نے صدر ایوب خان کے دورِ حکومت پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے صدر ایوب کے حوالے سے مختلف عنوانات کے تحت اپنی آپ بیتی میں بحث کی ہے جیسے "جنرل ایوب خان کی اٹھان"، "صدر ایوب، اصلاحات اور بیوروکریسی"، "صدر ایوب اور ادیب"، "صدر ایوب اور صحافت"، "ایوب خان اور معاشیات"، "صدر ایوب اور سیاستدان"، "صدر ایوب اور طلباء"، "صدر ایوب اور پاکستان کی خارجہ پالیسی" اور "صدر ایوب کا زوال" شامل ہیں۔

ایک باب میں مصنف نے صدر ایوب کے زوال کی کہانی بیان کرنے کے لیے اس کا عنوان ہی "صدر ایوب کا زوال" تجویز کیا ہے۔ اس باب میں صدر ایوب کے زوال اور پاکستان کی سیاست میں چیرہ دستیوں پر مشتمل فیصلے جو صدر ایوب کے دورِ حکومت میں لیے گئے ان پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"صدارتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اُٹھایا۔۔۔۔صدر ایوب کے حواریوں نے مس فاطمہ جناح کو نیچا دکھانے کے لیے حسبِ توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استحصال کیا۔"(۷۶)

صدر ایوب خان کے زوال کے سیاسی محرکات تو بہت زیادہ مصنف نے تحریر کیے ہیں لیکن راقم نے یہاں چند ایک

نہایت اہم محرکات کا انتخاب کیا ہے۔ ایوب خان کے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی خاطر کونشن مسلم لیگ کے اختیار میں اس وقت کروڑوں روپے کے الیکشن فنڈز دیئے گئے۔ ان کروڑوں کے حساب سے جمع کردہ فنڈز کے لیے تمام قسم کے ناجائز طریقے استعمال کیے جاتے رہے۔ ان میں کئی کاروباری حضرات کو درآمدی لائسنس کے حصول کے لیے الیکشن فنڈ میں بھاری رقوم جمع کروانے کے لیے کہا گیا۔ چند لائسنس جعلی ناموں کے ساتھ جاری کروا کر من چاہی قیمت پر مختلف تاجر اور صنعت کار حضرات کو بیچ دیئے جاتے رہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے مالکان سے چندے لے کر جمع کیے جاتے تھے۔ کونشن مسلم لیگ کے کئی کارکنان اس سیاسی رشوت اور چندوں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ صدارتی الیکشن کی مہم میں کھلے بندوں دولت کی لین دین نے اور مفادات کی سیاسی جنگ نے جمہوری روایات کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔

صدر ایوب کے زوال میں جنرل یحییٰ خان کی سازشی چالوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ انہی سازشی چالوں کی وجہ سے مصنف جنرل یحییٰ خان سے بہت بدظن ہوئے اس لیے جنرل یحییٰ کے اقتدار میں آتے ہی مصنف نے سول سروس آف پاکستان سے استعفیٰ دے دیا۔ یحییٰ خان کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننے کے بعد انہوں نے کیوں استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ”لیکن جب یحییٰ خاں اپنے بے ضمیر باطن کی اندھیر نگری سے چوپٹ راجہ بن کر ارض پاک پر نازل ہوا تو میرے اندر کسی دبے ہوئے جنون نے بھی کروٹ لی۔ اس شخص کو میں مدت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بے برکتی اور بدتوفیقی کی ایک واضح مہر ثبت تھی۔“(۷۷)

مصنف نے جنرل یحییٰ کے کردار اور طرزِ عمل پر بھی مفصل انداز میں اپنے مشاہدات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے جنرل یحییٰ خان کی رنگین مزاجی کے بارے اس زمانے کا ایک واقعہ آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ جن دنوں پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا جا رہا تھا۔ مارشل لاء کے دن تھے۔ پنڈی کلب میں ایک زبردست پارٹی منعقد کی گئی۔ اس میں سول اور فوجی افسران نے اعلیٰ قیادت کو خوشامد سے راضی کرنے کے لیے بھرپور زور لگایا۔ اس کارِ خیر میں بعض افسران کی بیگمات نے اپنے شوہروں کا ساتھ دینے کے لیے خود کو گلدستوں کی طرح تیار کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ محفل میں جنرل یحییٰ خان روایتی طریقوں سے شراب پی کر بیگمات پر گرتا سنبھلتا رہا۔ پھر ایک خوبصورت خاتون کو بہلا پھسلا کر باہر لان میں لے جا کر بوس و کنار شروع کر دیا۔ اس طرح کی کئی محافلِ ناؤ نوش وقفے وقفے سے منعقد کی جاتی تھیں اور وہاں مغربی تہذیب کی روایات کی مکمل پاسداری کی جاتی تھی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں کا ایسا طرزِ عمل پڑھ کر عجیب طرح کی کوفت ہوتی ہے کہ قوم کے وسائل کو اس طرح لٹایا جاتا رہا ہے۔ محض اپنی ذاتی تسکین اور عیش پسندی کی خاطر قومی

مفادات کو پس پشت ڈال کر ذاتی مفادات کے حصول کے لیے بے ضمیری اور منافقانہ سوچ کا سیاسی کھیل جاری رکھا گیا۔

قدرت اللہ شہاب نے یحییٰ خان کے دور میں اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور پاکستان سے رخت سفر باندھا کیونکہ یحییٰ خاں سے ان کی مخالفت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان دنوں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے ممبران کا انتخاب ان کی ذاتی حیثیت میں ہوتا تھا اس لیے مصنف کو یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے جب آپ تیار ہونے لگے تو میجر جنرل پیرزادہ جو کہ جنرل یحییٰ کے دست راست تھے نے بہت روڑے اٹکائے لیکن ان کی ہر کوشش ناکام رہی۔ استعفیٰ دینے کے بعد مصنف کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ کھڑا کیا گیا کہ تین سال تک پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ کو بند کر دیا گیا۔ آپ کو اس وقت پنشن ملنا شروع ہوئی جب جنرل یحییٰ خان ملک کا بیڑا غرق کر کے تباہی کے بالکل قریب لے آیا۔ مصنف کے لیے یہ تین برس کا عرصہ مصائب سے بھرپور تھا۔ اس عرصے میں آپ نے انگلینڈ کے کئی دیہات میں رہائش اختیار کر کے اپنی گزربسر کی لیکن اپنے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ چونکہ مصنف یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے، اس لیے وہ ہر سال اپریل سے اکتوبر تک پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے جو کہ چار سے پانچ ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ وہاں پر مصنف روزانہ الاؤنس میں سے جیسے تیسے ہاتھ کھینچ کر گزارہ کر کے کچھ رقم بچا کر لاتے تھے، جس سے ان کے گھر کے اگلے چھ ماہ کے اخراجات کو پورا کیے جانے کا تحرک کیا جاتا تھا۔ پاکستان میں ملازمت سے استعفیٰ کے بعد آپ نے شدید مالی مصائب کا مردانہ وار ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔

زیرنظر آپ بیتی میں پاکستان کی سیاست کو بھی خصوصی طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ روایتی سیاسی پارٹیوں میں ایک جدید رجحان کی طرف مصنف نے قارئین کی توجہ مبذول کروانے کے لیے بیان کیا ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے ریٹائرڈ حضرات کو بطور خاص سیاسی جماعتوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس صورت حال کو مصنف یوں بیان کرتا ہے:

> ''کچھ عرصہ سے یہ فیشن بھی عام ہو رہا ہے کہ سول اور فوجی اعلیٰ افسر اپنی اپنی ملازمتیں پوری کرنے کے بعد خاصی تعداد میں بعض سیاسی جماعتوں میں نمایاں مقامات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سیاست اور جماعتوں دونوں کی بدقسمتی ہے۔''(۷۸)

پاکستان کی ۷۲ سالہ سیاسی تاریخ کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر واضح ہو گی کہ بہت سے اعلیٰ سول اور فوجی افسران کی وفاداریاں ملک اور قوم کے ساتھ ہونے کی بجائے ملازمت سے ریٹائر ہونے سے بہت پہلے من پسند سیاسی جماعتوں کے قائدین کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یہ افسران ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے سیاسی جماعتوں اور پریشر گروپس کا بطور خاص حصہ بن جاتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے لیے ایسے چلے ہوئے کارتوسوں کو اپنی جماعت

میں نمایاں مقام و مرتبہ دینا مجبوری بن جاتا ہے۔ اسی لیے ریٹائرڈ افسران کو سیاسی جماعتوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ سیاسی راہنما ان افسران کی مدد سے عوام کو بہتر انداز میں الّو بنانے میں اپنے تمام زندگی کے تجربات کو خوب آزماتے رہتے ہیں۔ یہ افسران ساری زندگی سرکاری عہدوں پر اختیارات کے مزے لیتے رہتے ہیں اور پھر زندگی کے آخری حصے میں باقاعدہ سیاست میں داخل ہو کر اقتدار کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے اعزہ و اقربا کے لیے مال و جائیدادوں کو اکٹھا کرتے کرتے قبروں میں اتر جاتے ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف نے ریٹائرڈ سول اور فوجی افسران کے سیاست میں وارد ہونے کو سخت الفاظ میں ہدف تنقید بنایا ہے کہ کس طرح ہمارے ہاں ان ریٹائرڈ افسروں نے ملکی سیاست کو داغدار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آپ بیتی میں آپ نے اپنی بیوی کے بارے میں والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے یونیسکو میں سرانجام دی جانے والی خدمات اور اسرائیل میں بھیس بدل کر یہودیوں کے جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کے ساتھ ساتھ اس خفیہ مشن کو سرانجام دینے کو اپنے لیے توشہ آخرت سمجھا ہے۔ آپ بیتی کا اختتام قرآنی آیات اور دعائے کن فیکون پر ہوتا ہے۔

''شہاب نامہ'' کے بارے میں ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں واقعات، مشاہدات اور تجزیات کا بڑا دل کش مرقع ماضی اور حال کے آئینے میں پاکستان کے مستقبل کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بس آپ بیتی میں کہیں ہمیں عام آدمی کی مایوسیوں بھری سوچ ملتی ہے، کہیں حکمرانوں کا ظلم و ستم، سیاست دانوں کی بے ایمانیاں، سرکاری ملازمین کی ہیرا پھیریاں، نوکر شاہی کی من مانیاں اور جی حضوریاں، انتظامیہ کی دھاندلیوں، امراء کی بے مروتیوں اور مذہب کے نام نہاد ٹھیکے داروں کی دوغلی پالیسیوں کی یہ آپ بیتی بے لاگ داستان سناتی دکھائی دیتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے معاشرے میں بسنے والے ایک عام قاری کو ماضی کے حکمرانوں کی تصویروں کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غرض تمام عوامل کو تحریر کرتے ہوئے آپ نے حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بے باک انداز میں اپنی داستانِ حیات کو بیان کر دیا ہے۔

’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ از شہرت بخاری

شہرت بخاری ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء شہرت بخاری ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سیّد محمد انور تھا۔ شہرت بخاری کی داستانِ حیات ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ کو ۱۲ ابواب میں تقسیم کیا گیا جبکہ آپ بیتی کے صفحات کی تعداد ۴۵۲ ہے آپ بیتی کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے۔ مصنف کی شعری تصانیف میں ’’طاق ابرو‘‘، ’’دیوار گریہ‘‘ اور ’’شب آئینہ‘‘ شامل ہیں۔

آپ بیتی کی پہلی اور دوسری فصل میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی سکونت، ہجرت، معاشی و معاشرتی حالات، خاندان کی سماجی صورت حال، راجستھان، بہاول پور اور دِلّی کے تہذیبی اثرات، مذہبی گھرانے کی روایات کی پاس داری اور ننھیال کا مختصر احوال بیان کیا ہے۔ آپ کے والد کا نام سیّد محمد اشرف تھا، جو کہ ریلوے کے کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کی مسلسل محنت کی بناء پر انہیں بعد میں ترقی دے دی گئی تھی۔ مصنف کی نانی، صاحب دیوان شاعر میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی کی بیٹی تھیں۔ آپ اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے۔ مصنف کی پیدائش کے دن اتفاق سے آپ کی بڑی بہن کھڑکی سے نیچے بازار میں گر گئیں۔ والدہ کو جب پتہ چلا تو وہ بغیر یہ سوچے وہ زچہ سے ہیں فوراً سیڑھیوں سے نیچے اتریں، آپ کی ہمشیرہ کو معجزانہ طور پر چوٹ نہ لگی لیکن ان کی والدہ اس دن کے بعد سے لے کر سات برس تک بستر پر علیل رہیں۔ مصنف کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کی عمر بیس برس تھی اور خوب صحت مند، گندمی رنگت، درمیانہ قد، خوبصورت ناک، کم گو اور شوہر پرست بیوی تھیں۔

آپ کی والدہ کی خواہش تھی کہ مصنف قرآن مجید حفظ کریں۔ اس غرض سے ابتدائی طور پر آپ کے چچا سید محمد اصغر کے پاس قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا رہا۔ آپ نے پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ مکمل کر لیا تھا۔ مصنف کی والدہ کی وفات کے بعد آپ لوگ اپنے آبائی گھر یکی دروازے سے دِلّی دروازے منتقل ہو گئے۔ والدہ کی سات سالہ علالت کے بعد وفات سے مصنف کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا، سکول سے واپس آ کر سارا وقت کھیل کود میں صرف کر کے جب چچا کے گھر پڑھنے کے لیے جاتے تو وہاں بھی اپنے کھلنڈرے پن کی بنا پر خوب پٹائی کی جاتی تھی۔ سکول میں سبق نہ یاد کرنے پر ماسٹروں سے اور چچا کے گھر پر اکثر و بیشتر پٹائی سے مصنف میں ایک چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اس صورت حال پر ان کے والد انہیں اکثر سمجھاتے تھے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست میں انگریزوں کے خلاف احتجاج کی کئی تحاریک زور پکڑ رہی تھیں۔ ان دنوں دِلّی دروازہ لاہور سیاسی جلسے، جلوسوں کا مرکز تھا۔ آپ کے والد کو سیاست سے خاص دل چسپی تھی لیکن صرف تقاریر سننے کی حد

تک، انہیں سیاسی تحریکوں یا جماعتوں سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ جو کوئی اچھا خطیب یا مقرر ہوتا اور آپ کے والد کی نظر میں ہیرو ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا غلام مرشد، مولانا داؤد غزنوی، مولانا احمد علی اور حافظ کفایت اللہ سے مصنف کے والد کو خاص عقیدت تھی۔ اس دور کا ہندوستانی مسلمان مسلم کش پالیسیوں کی بدولت انگریزوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ کوٹ، پتلون اور ٹائی پہننے والے کو معیوب سمجھا جاتا اور اسے ''ٹوڈی بچہ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو اس بات کا احساس تھا کہ انگریز اپنی بود و باش، سماجی زندگی اور مذہبی و لسانی تفاوت کی بنا پر ہندوستان میں صرف اپنی ملازمت کے ایام گزارنے کے بعد یہاں سے جانے والے ہیں۔ انگریز اپنا جو نظامِ حکومت یہاں چھوڑ کر جائیں گے، وہ پارلیمانی ہوگا۔ پارلیمانی نظام حکومت میں چونکہ عوام کی اکثریت کی رائے کو ہی مقدم جانا جاتا ہے، اس لیے ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے اختتام پر ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی اور مسلمان قوم غلام در غلام رہ جاتی۔ تعصب پسندی میں ہندو قوم انگریزوں سے بھی کہیں بڑھ کر تھی، اس لیے ہندو، انگریز سے بھی بڑھ کر ظالم حکمران ثابت ہوتے۔

تحریک خلافت کے دورانِ گاندھی کے منافقانہ کردار کی وجہ سے مسلمان آل انڈیا کانگریس سے سخت بددل اور متنفر ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم اختلافات، ہندو انتہا پسندوں کی شردھا نند تحریک کے بعد بہت عروج پر پہنچ چکے تھے۔ ان دنوں مسلمانوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کو جان بوجھ کر ایک سیاسی حکمت عملی کے تحت بھڑکایا گیا۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی، بریلوی کے درمیان فروعی اختلافات کو ہوا دی گئی۔ ان اختلافات کا براہِ راست فائدہ ہندوؤں اور انگریز حکومت کو ہوتا تھا۔ اس دور میں تفرقہ پرستی سے نقصان صرف مسلمانوں کا ہوتا، جو کہ دوسری اقوام کی نسبت مزید کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہندو مسلم منافرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ رہائشی محلے اور تعلیمی ادارے تک الگ الگ قائم کر دیئے گئے تھے۔ عام مسلمان اپنے بچوں کو حمایت اسلام سکولوں اور کالجوں میں جبکہ ہندو اپنے بچوں کو ڈی۔اے۔وی ہائی سکول یا سناتن دھرم سکول میں داخل کرواتے تھے۔ ان دنوں عام تاثر یہ تھا کہ انگریز پرستوں اور دولت مند لوگوں کے بچے سنٹرل ماڈل سکول، ایف۔سی کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کروائے جاتے تھے۔ دیال سنگھ سکول اور کالج ان دنوں فرقہ پرستی سے بچا ہوا تھا، کیونکہ یہ ادارہ ٹرسٹ کے زیر انتظام تھا لیکن ٹرسٹ میں کسی مسلمان کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں ہندو اساتذہ کی اکثریت تھی، صرف چند مسلمان استاد تھے۔ ان میں شمس العلماء علامہ مولانا احسان اللہ خان، تاجور نجیب آبادی، اور سید عابد علی عابد شامل تھے۔

شہرت بخاری نے آپ بیتی میں غازی علم الدین شہید عاشق رسول کا ذکر مفصل انداز میں کیا ہے۔ اس دور میں راج پال نام کا ایک ہندو تاجر کتب تھا، جو کہ نعوذ باللہ ''رنگیلا رسول'' نامی کتاب شائع کروا کر توہین رسالت کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس توہین آمیز کتاب کا چھپنا تھا کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا اضطراب آسمان کو چھونے لگا۔ ان دنوں دِلّی دروازے کے باغ

میں مسلمانوں کا ایک فقید المثال جلسہ منعقد کروایا گیا جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے حرمتِ رسول ﷺ پر ایک پُر اثر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر سن کر علم الدین نے مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور وہاں سے سیدھا تاجر کتب ملعون راج پال کی دکان پر پہنچ کر اسے جہنم واصل کر دیا۔ تمام ہندوستانی مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، مسلمانوں کی تمام مذہبی، سیاسی اور سماجی جماعتیں اختلافات بھلا کر یک جان ہوگئی تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح بمبئی سے لاہور تشریف لائے اور جیل میں علم الدین سے اصرار کیا کہ ایک دفعہ جج کے سامنے یہ کہہ دیں کہ انہوں نے قتل نہیں کیا لیکن غازی علم الدین تو حرمت رسول ﷺ پر اپنی جان نچھاور کر دینے کا آرزومند تھے۔ بالآخر غازی علم الدین کو عدالت کی طرف سے پھانسی کی سزا کا حکم ہوا اور علم الدین غازی سے شہید کے مرتبہ پر فائز ہو گئے۔

آپ بیتی کے تیسرے باب میں مصنف نے ''مسجد شہید گنج'' کے مسئلے کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کو الفاظ کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ لاہور میں نولکھا بازار کے پاس پندرہویں صدی کے ایک بزرگ شاہ کاکو چشتی کا مزار تھا، جسے بعد میں بہادر ظفر جنگ کے بیٹے نے دارا شکوہ مغل شہزادے کے دور میں یہاں پر ایک مسجد تعمیر کروائی تھی، اس مسجد کا نام ''مسجد شہید گنج'' رکھا گیا تھا۔ بعد میں سکھوں کے عہد میں راجا شیر سنگھ نے مزار اور مسجد شہید گنج پر قبضہ کر کے اس کا نام ''گوردوارہ شہید گنج'' رکھ دیا کیونکہ اس مقام پر مغل دور حکومت کے دوران بہت سے باغی سکھوں کو قتل کیا گیا تھا۔ انگریز حکومت کے دوران بھی مسجد کی جگہ پر سکھوں کا قبضہ بدستور برقرار رہا۔ ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے مسجد کو مسمار کر کے یہاں باقاعدہ نئے سرے سے گوردوارہ تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر لی۔ مولانا ظفر علی خان کی پرجوش تقاریر نے مسلمانوں کے جذبات کو مزید بڑھا دیا۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خان کو گرفتار کر لیا گیا تو مولانا کے بیٹے مولانا اختر علی خان کی تقریر کے بعد ایک بڑا جلوس بادشاہی مسجد سے مسجد شہید گنج کی طرف بڑھا۔ دِلّی دروازے کے باہر انگریز فوج سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو کئی مسلمان گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد سکھ یہاں پر گوردوارہ تعمیر نہ کر سکے۔

شہرت بخاری نے آپ بیتی میں قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۶ء کی سیاسی صورت حال کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان دنوں تحریک پاکستان جاری و ساری تھی، ملک خضر حیات خان ٹوانہ کی حکومت کے خلاف مسلم لیگ تحریک چلا رہی تھی۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی دفعہ مرد حضرات کے شانہ بشانہ خواتین نے بھی جلوسوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس دور میں یونینسٹ جماعت ہندو اور سکھ حمایت کے باوجود مسلمانوں کے پرجوش مظاہروں، جلسے اور جلوسوں کی تاب نہ لا سکی۔ یکم مارچ ۱۹۴۶ء کو ملک خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض کے مسلمانوں میں حکومت کے خاتمے کی خبر نے خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ان دنوں عام مسلمانوں میں بھی اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وہ قائداعظم کے جلسوں میں بطور خاص شامل ہوا کرتے

اور جب قائد انگریزی زبان میں اپنی گرج دار آواز کے ساتھ خود اعتمادی سے تقریر کا آغاز کرتے تو حاضرین محفل بڑے انہماک سے ان کی تقریر کو سنا کرتے تھے۔ اکثر یہ دعا کی جاتی تھی کہ کاش کوئی معجزہ ہو جائے اور مولانا آزاد بھی قائداعظم کے ہمنوا بن جائیں۔ تحریک پاکستان کے جلسوں میں قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر اور عوامی جوش وخروش کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''قائداعظم بارہا لاہور آئے...... کئی بار اسلامیہ کالج میں گئے۔ یہیں دو مرتبہ میں نے قریب سے انہیں دیکھا۔ میں ایسی روشنی کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ جو میں نے ان کے چہرے پر بچی ہوئی دیکھی تھی۔ ان کا لاہور میں آنا واقعہ ہوتا تھا۔ لوگ ان کی آواز کے شیدائی تھے۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپتے تھے۔ انہیں نجات دہندہ جانتے تھے۔''(۷۹)

مسلمانانِ ہند پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ اگر انگریز حکومت کے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے مسلمان اپنا حق آزادی حاصل کر سکے تو پھر ہندوؤں کے زیر تسلط مسلمانانِ ہند کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔ بالآخر مسلم قائدین کی مساعی بارآور ثابت ہوئی مسلمانانِ ہند کی قربانیاں رنگ لے آئیں اور ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر نیا اسلامی ملک اُبھرا۔ آزادی کے حصول سے پہلے اور بعد میں توحید پرستوں کی جانوں نے جانے کتنی مرتبہ خون کی ندیاں بہا کر آزادی کی قیمت ادا کی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا ناممکن امر ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ماسٹر تارا سنگھ اور ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کے قتل و غارت کا جو بازار گرم کیا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مصنف آپ بیتی میں قیام پاکستان کے دن کے دل دہلا دینے والے ظلم وستم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ماسٹر تارا سنگھ کی لگائی ہوئی آگ پورے پنجاب میں پھیل چکی تھی۔ مگر مسلمان پر جوش تھا۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کے طلوع کے ساتھ مشرقی پنجاب دِلّی اور آس پاس سے مہاجرین کے قافلے لاہور میں داخل ہونا شروع ہوئے...... یہاں عالم یہ تھا کہ مردوں عورتوں اور بچوں کے کٹے ہوئے اعضا زیادہ تھے۔ سالم مرد یا عورت یا بچہ خال خال تھا...... گاڑی کے ڈبے بندوقوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کا خون ڈبوں سے باہر بہہ رہا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار نے اس منظر کو اور بھی کرب ناک بنا دیا تھا۔''(۸۰)

قیام پاکستان کے وقت مصنف دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کے عینی شاہد تھے۔ اس لیے انہوں نے ریلوے اسٹیشن

لاہور پلیٹ فارم نمبر۲ پر جو مناظر دیکھے وہ کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ رضا کار بڑی تعداد میں اس روز مہاجرین کی لاشوں کو ریل گاڑی کے ڈبوں سے نکال رہے تھے۔ ایک عورت کو جب باہر نکالا گیا تو اس کے دونوں بازو، ناک اور سینہ کٹا ہوا اور جسم بے لباس تھا لیکن وہ اس وقت تک سانسیں لے رہی تھی۔ دوسرے ڈبے سے ایک مرد کو نکالا گیا جس کی دونوں ٹانگیں اور عضو تناسل کو کاٹ دیا گیا تھا۔ مصنف نے والٹن لاہور میں قائم کردہ مہاجرین کے کیمپ کی بھی آنکھوں دیکھی صورت حال کو آپ بیتی میں بیان کیا ہے کہ ریلوے سٹیشن لاہور کے مناظر سے ملتی جلتی صورت حال والٹن کیمپ میں بھی انہیں دکھائی دی تھی۔ مہاجرین کے لیے اہل لاہور کا جذبہ دیدنی تھا، لوگ اپنے گھروں سے عام استعمال کی چیزیں، بستر اور کھانے اپنے ساتھ لاتے اور مہاجرین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ مصنف قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی سیاسی صورت حال کو بیان کرتے ہیں:

> ”اک قیامت عظمیٰ کے باوجود مہاجرین اور مقامی لوگوں کو پاکستان کی تخلیق پر ایک خاص قسم کی مسرت بھی تھی۔ وہ ان مصائب کو عارضی سمجھ رہے تھے اور پاکستان کو دائمی، قائداعظم سے محبت اور شیفتگی اور بڑھ گئی تھی...... پاکستان کے حامیوں کی آوازیں دھیمی ہونے لگیں اور مخالفین کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتے گئیں۔“(۸۱)

قیامِ پاکستان کے بعد اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے دوقومی نظریے کے خلاف معاشرے میں ایسا زہر گھولنا شروع کیا، جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس زہر کو چہار اطراف پھیلانے میں دانشور لوگ زیادہ تعداد میں تھے، جو پہلے ہی سمجھتے رہے کہ پاکستان کی ریاست سرے سے وجود میں ہی نہیں آ سکتی۔ اگر وجود میں آ بھی گئی تو بہت جلد اس کے حصے بخرے کر دیئے جائیں گے۔ ایسے مسلمان دانشوروں کے بارے میں قائداعظم محمد علی جناح نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنی ایک تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ دنیا کے ممالک کی اقوام میں حوصلہ اور بہادری پیدا کرنا دانشوروں کا ہی کام ہے لیکن پاکستان میں ایسے لوگ ابھی تک خوابِ غفلت میں پڑے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہب کو شاید پسند نہیں کرتے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بعض اخبارات میں آزادی کو بڑے طنزیہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب و اثرات اور بھارت کی ریشہ دوانیوں کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان پر جب ہندوستانی افواج نے حملہ کیا تو وہاں پر دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔ مصنف یہی سمجھتے تھے کہ محمد بن قاسم سے لے کر افواجِ پاکستان کے سامنے دشمن چاہے تعداد اور ہتھیاروں میں جتنی بھی سبقت رکھتا ہو مسلمانوں کے جذبہ ایمانی، بہادری، دلیری اور جوانمردی کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا لیکن اس دفعہ حالات مختلف تھے۔ مصنف کی طرح بہت سے لوگ امریکی فوجی امداد اور ساتویں بحری بیڑے کے منتظر رہے، ادھر پاکستان کی نوے ہزار فوج نے بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ پاکستانیوں کو ابھی تک ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے دوران ہندوؤں اور

سکھوں کے مظالم نہیں بھولے تھے، پرانے زخم پھر سے تازہ ہونے لگے تھے۔ بالآخر دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا، پاکستان کا ایک بازو کاٹ دیا گیا اور مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔

آپ بیتی میں مصنف پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کو ملکی درپیش مسائل کے تناظر میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ مصنف ذوالفقار علی بھٹو کی کرشماتی شخصیت اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> ''ذوالفقار علی بھٹو محض سیاسی رہ نما نہیں ہے۔ اس نے ہمیں دوبارہ جنم دیا تھا۔ اس نے ایک نیا پاکستان تعمیر کیا تھا اور اپنی تمام انسانی فطری کمزوریوں کے باوجود وہ پاکستان کی علامت ہے اور جب کسی قوم کی علامت اس سے چھین لی جائے تو اس قوم کو اپنے منطقی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔''(۸۲)

آپ بیتی میں مصنف ذوالفقار علی بھٹو کی مثبت پالیسیوں کو سراہتے ہوئے، ان کے ناقدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بھٹو کا قصور کیا تھا، جس کی اسے اتنی بڑی سزا دی گئی تھی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ بھٹو ہی تھا جس نے ''ناقابلِ تسخیر پاکستان'' کا نعرہ بلند کیا، جمہوریت کو بحال کرایا، اسلامی کانفرنس منعقد کروائی، ری پراسیسنگ پلانٹ کا قیام، زرعی اصلاحات اور پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کا آغاز کیا تھا۔

آپ بیتی میں مصنف نے جن احباب کا ذکر بار بار کیا ہے، ان میں ناصر کاظمی، احسان دانش، خواجہ حسن نظامی، سیّد عابد علی عابد، فراق گورکھ پوری، ڈاکٹر وحید قریشی، میرا جی، پطرس بخاری، باقی صدیقی، بقا نقوی، سجاد باقر رضوی، یوسف ظفر، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، حفیظ ہوشیار پوری، ڈاکٹر تاثیر، احسان اللہ خان، تاجور نجیب آبادی، مختار صدیقی، یوسف جمال انصاری اور ڈاکٹر احرار نقوی شامل ہیں۔ سیاسی شخصیات میں علامہ اقبال، قائداعظم اور ذوالفقار علی بھٹو کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا ہے۔ ان شخصیات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''ان میں سے اقبال، قائداعظم، پروفیسر سیّد عابد علی عابد، یوسف ظفر، ناصر کاظمی، بقا نقوی کے تذکرے سے فی الحال میں اپنی روح کے زخموں پر پھاہا رکھ رہا ہوں۔''(۸۳)

شہرت بخاری نے آپ بیتی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں سیاسی و سماجی صورت حال کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں مسجد شہید گنج کے واقعہ کے اسباب و اثرات، غازی علم دین شہید کے حالات واقعات، قراردادِ پاکستان کے جلسے منعقدہ منٹو پارک لاہور کے مشاہدات کا تفصیلی تذکرہ، قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال اور اس کے بعد کے سیاسی انحطاط کا مکمل احوال اور پاکستان کی سیاست پر مارشل لاء کے اسباب و اثرات کا مکمل جائزہ اپنے مخصوص جذباتی اندازِ فکر میں کیا ہے۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر مصنف نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اعلان تاشقند کے بعد پاکستان کے حالات یکسر بدل

گئے، مصنف نے بھٹو کو پھانسی لگائے جانے پر انہیں شہید قرار دیا اور اس دکھ میں اپنا گھر تک لٹا دیا۔''(۸۴)

آپ بیتی میں شہرت بخاری نے فن خاکہ نگاری کو بھی کمال انداز میں استعمال کیا ہے۔ شخصی خاکہ، مرقع یا سکیچ ایک ہی صنف کے مختلف نام ہیں۔ شخصی خاکہ نگاری کوئی آسان فن نہیں کیونکہ اس میں بیک وقت کئی امور کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ خاکوں میں تمام حقائق کو اپنی درست شکل اور انداز میں تحریر کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کا فن ایسا فن ہے جس میں موضوع بحث شخصیت وضاحت طلب عوامل کے ساتھ ساتھ اختصار کے پہلو کو خاص طور پر سامنے رکھا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری وہ عمل ہے جس میں مصنف فرد کی نقشہ آرائی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ اس شخصیت کے کردار کے اہم ترین خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ اس فرد کے عادات واطوار سے خوب آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ موضوع بحث شخصیت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جن سے فرد کی شخصیت کے پوشیدہ پرت کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ غیر اہم اور غیر ضروری واقعات کو خاکہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ شہرت بخاری نے اپنی آپ بیتی میں خاکہ نگاری کے قواعد کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ عمدہ خاکہ بہترین قوت مشاہدہ کی عملی تصویر ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کو کسی فرد کی شخصیت کے تعارف کے لیے طویل تمہید کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی، حقیقت کو سامنے لانے کے لیے بہت زیادہ تگ و دو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مطلوبہ مواد خاکہ تحریر کرنے والے کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ وہ مشاہدات کو من وعن بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے تخلیقی جوہر کے ذریعے وہ ان حقائق سے جو نتائج برآمد کرتا ہے، انہیں اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

آپ بیتی میں مختلف شخصیات کے خاکوں کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف خاکہ کے ذریعے قاری کی آنکھوں کے سامنے فرد کی ایسی حلیہ نگاری پیش کرتے ہیں کہ ایک مکمل تصویر بنتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ یوسف ظفر کے خاکہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس کا قد کسی حد تک چھوٹا تھا۔ دبلا ڈیل، گول چہرہ، ابھرے ابھرے ہونٹ، برائے نام مونچھیں، سر پر چھوٹے چھوٹے کھڑے ہوئے بال جن میں نہایت خفیف سی مانگ، تنگ ماتھا۔ چھوٹی سی گول سی ناک اس پر بڑے بڑے شیشوں والی عینک، زردی مائل رنگ، منہ میں پان جسے ہونٹ بند کیے ہوئے چباتا رہتا۔''(۸۵)

آپ بیتی میں مصنف نے عالمی سیاسی تحریکوں، بین الاقوامی سیاسی معاملات، اقتصادیات کے مسائل، انگریز حکومت کی پالیسیوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کی بجائے پاکستان کے سیاسی وسماجی تناظرات، سماج وسیاست سے جڑی شخصیات، تحریک پاکستان کے کارکنان، اپنے دوست احباب سے تعلقات، دکھوں اور غموں کو بیان کیا ہے۔ مصنف نے اپنی داستانِ حیات کو حقیقت پسندی سے اپنے جذبات اور احساسات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شہرت بخاری سچے اور پکے قسم کے روایت پسند

شاعر تھے۔ روایت پسندی کے بہت قائل تھے، ادب یا زندگی میں جب بھی کوئی نئی بات کا آغاز ہوتا تو غصے میں آ جاتے۔(۸۶)

آپ بیتی میں جہاں لاہور کی سماجی زندگی کی جھلک ملتی ہے وہاں پر ادبی سرگرمیوں میں پاک ٹی ہاؤس کے کردار کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ بلاشبہ آپ بیتی میں ان کی ذات کے علاوہ ان سے میل ملاقات رکھنے والی ہستیوں کے افعال و اعمال کو بھرپور انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہرت بخاری کی آپ بیتی بیسویں صدی کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کو واضح کرتی دکھائی دیتی ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' از اختر الایمان

اختر الایمان ضلع بجنور اتر پردیش میں ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں آپ کے والدین نے آپ کا نام راؤ فتح محمد رکھا تھا۔ آپ کا بچپن مختلف دیہات میں گزرا کیونکہ آپ کے والد مساجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس لیے کسی گاؤں میں چند سال گزارنے کے بعد کسی دوسرے گاؤں میں جا کر رہائش پذیر ہو جاتے تھے۔ مصنف اپنے بچپن کے دور کے بارے میں اپنی سرگزشت میں بیان کرتے ہیں کہ آپ اور آپ کے دوست مل کر دیہات کے قریبی باغات اور جنگلوں میں اکثر اوقات گھوما کرتے تھے۔ دور دراز دیہات میں جا کر میلوں اور عرسوں پر جا کر نوٹنکی بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔

مصنف کے والد چونکہ خود مسجد میں امامت کے پیشے سے منسلک تھے۔ اس لیے وہ آپ کو بھی قرآن مجید حفظ کروانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ کو قرآن ناظرہ کے لیے مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا۔ آپ کو قرآن ناظرہ پڑھ لینے کے بعد حفظ قرآن کی جماعت میں داخل کروا دیا گیا تھا لیکن جلد یہ تعلیمی سلسلہ رک گیا کیونکہ آپ کے والد کی مستقل سکونت نہ ہونے کے سبب مسائل سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان مسائل کے ساتھ آپ کے ماموں چاہتے تھے کہ مصنف کو انگریزی تعلیم دی جانی چاہیے۔ جبکہ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے اور اپنے بچے کو مذہبی تعلیم دلوا کر ایک دینی عالم بنانا چاہتے تھے۔ اس تعلیمی کش مکش میں مصنف کو کبھی مدرسے میں قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے داخل کروایا جاتا تو کبھی سکول میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ میرے والد کے ذہن میں شاید ان کے لیے مستقبل کا پیشہ سکول کا استاد یا مسجد کا امام ہی تھا۔ آپ کے والد اور چچا دونوں ہی امام مسجد تھے۔ اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے والد اور چچا آپ کو پیش امام یا سکول کا استاد ہی بنانا چاہتے ہوں۔ کیونکہ دیہاتی پس منظر میں اس دور میں یہی پیشے باعزت پیشے سمجھے جاتے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں مصنف ''ادب لطیف''، ''ہمایوں نامہ''، ''ادبی دنیا'' اور ''ساقی'' میں اپنے افسانے بھیجا کرتے تھے۔ اس دور میں مصنف کی تخلیقی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان دنوں آپ زیادہ تر افسانے تحریر کرتے تھے

جو کہ ہندوستان کے مشہور جرائد و رسائل میں چھپا کرتے تھے۔ اختر الایمان ترقی پسند ادیب تھے۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ ترقی پسندیت سے تعلق رکھنے والے شعرا اور ادیب حضرات اشتراکیت کے حامی تھے لیکن بعض آزاد خیال قسم کے ادیبوں نے صرف اشتراکیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مصنف کے خیال میں ترقی پسندیت میں وہ تصانیف آتی ہیں جو کہ اشتراکی انداز فکر سے لکھی گئی ہوں۔ حلقہ اربابِ ذوق کے نقطہ نظر کو بیان کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ ان کے پاس سرے سے کوئی نعرہ نہیں رہا۔ وہ صرف اور صرف یہ چاہتے تھے کہ ہر ادبی تخلیق کو سب سے پہلے ادبی ہونا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک کے حامی شعرا اور ادیبوں نے ہمیشہ حلقہ ارباب ذوق والوں کو قدیم نظریات کے حامل گردانا لیکن حلقہ ارباب ذوق نے اس کے جواب میں کبھی مزاحمتی نعرہ بلند نہیں کیا۔

مصنف بمبئی کی فلم انڈسٹری سے منسلک ہونے سے پہلے بطور شاعر ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ روزگار کی تلاش میں بھی سرگرداں تھے۔ اختر الایمان نے فلمی دنیا میں گیت نگاری کی بجائے فلموں کے مکالمے لکھنا شروع کر دیئے، یہاں حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک اچھی شہرت رکھنے والا شاعر فلموں میں نغمہ نگاری کی بجائے مکالمہ نگاری کی طرف راغب ہو گیا تھا۔ مصنف نے کم و بیش سو فلموں کے مکالمے لکھے اور خود کو کامیاب شاعر کے ساتھ ایک ماہر مکالمہ نگار بھی ثابت کیا۔ مصنف نے آپ بیتی میں اپنے دور کی اہل ادب شخصیات کے بارے میں مفصل انداز میں لکھا ہے۔ علی گڑھ کے قیام کے ایام میں مصنف کی رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اکثر اوقات شام کے وقت جب رشید احمد صدیقی کے گھر میں ادبی نشست ہوتی تھی تو مصنف بھی نشست کا حصہ بنتے تھے۔ انہیں ادبی محافل میں مصنف کی ملاقات جگر مراد آبادی اور حسرت موہانی سے بھی ہوتی رہتی تھی جن ادیب حضرات سے مصنف متاثر ہوئے ان میں اہم سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، بیدی، اوپندر ناتھ اشک، ن۔م راشد، شاہد احمد دہلوی اور میرا جی شامل ہیں۔

مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ ادبی اور فلمی لحاظ سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کے دور میں انہوں نے کئی شعری مجموعے شائع کروائے۔ ان میں پہلا شعری مجموعہ ''یادیں'' ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آیا جسے بعد میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کی تحریر ''گرداب'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے بعد ''تاریک سیارہ'' اور ''آب جو'' بالترتیب مکتبہ اُردو لاہور اور مکتبہ جدید سے شائع ہوئی تھیں۔ ان کتب کے بعد ''سب رنگ''، ''بنت لمحات''، ''نیا آہنگ''، ''سروسامان'' اور ''زمین'' منظرِ عام پر آئی تھیں۔ ان کتب کی اشاعت پر آپ کو مختلف ادبی انعامات سے بھی نوازا جاتا رہا۔ انعامات دینے والوں میں اُردو اکادمی لکھنؤ، میر اکادمی لکھنؤ، غالب اکادمی دہلی، اُردو اکادمی دہلی، مہاراشٹر اکادمی اور مدھیہ پردیش اُردو اکادمی سرفہرست ہیں۔

اختر الایمان آپ بیتی میں تقسیم ہند کے بعد قتل و غارت گری کے دل دہلا دینے والے واقعات کے بارے میں لکھتے

ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں ہندوستان کے حالات دِگرگوں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے چھوٹے بڑے شہروں سے فسادات کی خبریں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ مسلمانانِ ہند پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا تھا:

> ''تقسیم ملک کے فوراً بعد دِلّی اس دور سے گزر رہا تھا جو اس نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا۔ جسے ہندوستان کی تاریخ میں غدر کا نام دیا گیا تھا۔''(۸۷)

مصنف نے اپنی سرگزشت حیات میں ہندوستان کی تقسیم کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی وسماجی حالات کو اختصار سے قلم بند کیا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی اپنے آزاد اور خودمختار وطن کی طرف ہجرت کے دوران مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی۔ بلوائیوں نے مسلم گھرانوں کا مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے ساتھ بھی ناروا سلوک کیا۔ قافلوں کے قافلے اور ریل گاڑیوں کو زبردستی روک کر قتل عام کیا جاتا تھا۔

اختر الایمان جوشؔ ملیح آبادی کے دوست تھے اور اکثر ان کی آپس میں ملاقات رہتی تھی۔ جوشؔ ملیح آبادی اپنے آباؤ اجداد کے متعلق قصے بڑے فخر سے سنایا کرتے تھے۔ ایک روز جوشؔ اپنے دادا جان کے بارے میں مصنف کو بتاتے ہیں کہ ان کے دادا کی چار منکوحہ بیویاں تھیں .ں کے علاوہ باندیاں، کنیزیں اور بہت سی ادھر اُدھر سے آنے جانے والی خواتین میں سے ان کے ایک سو بارہ بیٹے تھے۔ بوجہ کثرت اولاد جوشؔ کے دادا اپنی اولاد کو اکثر پہچاننے سے قاصر رہتے تھے۔ جوشؔ کے دادا کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''تیس بتیس بیویوں میں سے کسی کا بچہ ان کے پاس آنے سے انکار کردیتا تھا یا انہیں نہیں پہچان سکتا تھا تو اس زور سے طمانچہ مارتے تھے کہ بچے کا دم نکل جاتا تھا کئی ایسے واقعات ہونے کے بعد ان کی داشتہ عورتیں اپنے بچے ان کے سامنے لاتے ہوئے گھبرانے لگی تھیں۔ اگر کبھی سامنا ہو جاتا اور وہ پوچھتے تھے۔ ''یہ بچہ کس کا ہے؟'' تو ''میاں آپ کا ہے'' کہہ کر بھاگ کھڑی ہوتی تھیں۔''(۸۸)

آپ بیتی میں مصنف تحریر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جوشؔ اپنے بارے میں یک واقعہ بیان کر رہے تھے کہ ایک روز وہ گاؤں کے کنویں پر کسی کو مار رہے تھے کہ ان کے دادا جان نے انہیں اپنے گھر بلوا کر گلے میں ہار ڈالے اور علاقے میں مٹھائی تقسیم کی اور جوشؔ کے والد سے کہا کہ تمہارا بیٹا بہت بہادر ہے۔ مصنف جوشؔ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ جوشؔ پیدائشی طور پر شیعہ مسلک سے وابستہ نہیں تھے بلکہ لکھنؤ شہر کے ماحول کے زیر اثر اور دوسرا شیعہ خواتین سے عشق کے سبب انہوں نے شیعہ مسلک اختیار کرلیا تھا۔ آپ کے والد کو جب پتہ چلا کہ جوشؔ نے شیعیت اختیار کرلی ہے تو آپ کے والد نے آپ کو جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ عاق کرنے کے باوجود جوشؔ شیعہ مسلک سے جڑے رہے۔ جس پر بعد میں آپ کے والد نے اپنے بیٹے کو

معاف کر دیا اور اپنی جائیداد کا وارث ٹھہرایا۔

مصنف اپنی داستانِ حیات کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ''اس آباد خرابے'' میں وہی کچھ تحریر کیا ہے جو کہ جس طرح ان کی زندگی میں گزرا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی بتا دی ہے کہ آپ بیتی میں حالات و واقعات لکھنے میں آگے پیچھے ہو گئے ہیں، یعنی واقعات کی زمانی ترتیب کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس صورت حال کے ساتھ ساتھ مصنف اس بات کا بھی اقرار کر رہے ہیں کہ آپ بیتی میں بہت سے واقعات اور مشاہدات ایسے ہیں جو کہ انہوں نے اپنی سرگزشت کا حصہ نہیں بنائے۔ اسی طرح ان کی زندگی میں کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں جن کا تذکرہ کرنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔

حوالہ جات

۱۔ تھانیسری، مولانا محمد جعفر، کالا پانی، فیصل آباد: طارق اکیڈمی، ص:۷۳

۲۔ ایضاً، ص:۱۴۲۔۱۴۳

۳۔ سالکؔ، علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ: نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۶۴ء، ص:۵۴

۴۔ جگن ناتھ آزاد، میرے گزشتہ روز و شب، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۶۵ء، ص:۳۴۔۳۵

۵۔ ایضاً، ص:۴۹

۶۔ نظیر صدیقی، جان پہچان، لاہور: کاروانِ ادب، ۱۹۹۱ء، ص:۳۵

۷۔ قدرت اللہ شہزاد، آپ بیتی کے توانا لہجے، بہاولپور: ستلج پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص:۱۴

۸۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، کراچی: شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۱۱

۹۔ بخاری، ذوالفقار علی، سرگزشت، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۱۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۶

۱۱۔ ایضاً، ص:۹۔۱۰

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۹۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۲۰۷

۱۴۔ ایضاً، ص:۲۹۳

۱۵۔ محمد اسماعیل صدیقی، بریگیڈیئر، کرنل محمد خان، فن اور شخصیت، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص:۲۱۰

۱۶۔ محمد خان، کرنل بجنگ آمد، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۳۹

۱۷۔ ایضاً، ص:۶۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۳

۱۹۔ ایضاً، ص:۶۵

۲۰۔ ایضاً، ص:۷۷

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۳۱

۲۴۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۲۵۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۲۶۔ محمد خالد اختر، بجنگ آمد، مشمولہ: سہ ماہی آج، کراچی: شمارہ نمبر۵۲، فروری ۲۰۰۵ء، ص:۱۹۳

۲۷۔ ایضاً،ص:۱۹۶

۲۸۔ محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، ص:۱۰

۲۹۔ جوشؔ ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور: مکتبہ شعروادب چودھری کیڈمی سمن آباد، ۱۹۷۵ء، ص:۲۱

۳۰۔ ایضاً،ص:۳۰

۳۱۔ ایضاً،ص:۱۳۔۱۴

۳۲۔ ایضاً،ص:۱۹۲

۳۳۔ ایضاً،ص:۱۸۰

۳۴۔ ایضاً،ص:۶۴۰

۳۵۔ ایضاً،ص:۶۳۸

۳۶۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۳۷۔ ایضاً،ص:۵۳۷

۳۸۔ ایضاً،ص:۵۶۹

۳۹۔ گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، دہلی: مکتبہ تحریک، ۱۹۷۱ء، ص:۱۵۸

۴۰۔ صدیقی، ڈاکٹر رشید احمد، آشفتہ بیانی میری، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء، ص:۱۸۔۱۹

۴۱۔ خواجہ غلام السیدین، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں، نئی دہلی: سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر، ۱۹۷۴ء، ص:۱۸

۴۲۔ احسان دانش، جہانِ دانش، لاہور: خزینہ علم وادب، ۲۰۰۲ء، ص:۱۱

۴۳۔ ایضاً،ص:۱۴۰

۴۴۔ ایضاً،ص:۲۰۹

۴۵۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، مشمولہ: علامت، لاہور، جلد۹، جولائی ۱۹۹۸ء، ص:۳۸

۴۶۔ احسان دانش، جہانِ دانش، ص:۳۶

۴۷۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۷ء، ص:۳۳۱

۴۸۔ احسان دانش، جہانِ دانش، ص:۲۳۱

۴۹۔ ایضاً،ص:۴۸۹

۵۰۔ ایضاً،ص:۵۹۵

۵۱۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب۔شناخت کی نصف صدی، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص:۲۸۷

۵۲۔ احسان دانش، جہانِ دانش،ص:۱۳

۵۳۔ کلیم الدین احمد، اپنی تلاش میں، گیا: کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۵ء،ص:۱۹۱۔۱۹۲

۵۴۔ دریابادی،مولانا عبدالماجد، آپ بیتی، کراچی: فضل ربی ندوی مجلس نشریات اسلام،۱۹۸۳ء،ص:۱۲

۵۵۔ ایضاً،ص:۱۹۵

۵۶۔ ایضاً،ص:۲۶۰۔۲۶۱

۵۷۔ ایضاً،ص:۳۵۸

۵۸۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۶ء،ص:۲۱۴

۵۹۔ ایضاً،ص:۲۱۸

۶۰۔ ایضاً،ص:۴۰۹

۶۱۔ ایضاً،ص:۴۱۰

۶۲۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۱۲ء،ص:۱۶۶

۶۳۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن اور تجزیہ، نئی دہلی: شعبہ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ،۱۹۸۹ء،ص:۲۴۸

۶۴۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گردِراہ، کراچی: مکتبہ افکار،۱۹۸۴ء،ص:۳۶

۶۵۔ ایضاً،ص:۱۸۳

۶۶۔ محمد خالد اختر، گردِراہ، مشمولہ: سہ ماہی آج، شمارہ ۵۲، کراچی: فروری ۲۰۰۵ء،ص:۳۲۴

۶۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نذر اختر حسین رائے پوری، مشمولہ ماہنامہ افکار، شمارہ نمبر۱۹۴، کراچی: مئی ۱۹۸۶ء،ص:۲۸۱

۶۸۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب۔شناخت کی نصف صدی، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص:۲۸۴

۶۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، گردِراہ.....ایک منفرد کتاب، مشمولہ: ماہنامہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، شمارہ نمبر۱۹۴، کراچی: مئی ۱۹۸۶ء،ص:۲۳۳

۷۰۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء،ص:۸

۷۱۔ ایضاً،ص:۸۰

۷۲۔ ایضاً،ص:۸۹

۷۳۔ ایضاً،ص:۹۹

۷۴۔ ایضاً،ص:۱۴۹

۷۵۔ ایضاً،ص:۴۵۹

۷۶۔ ایضاً،ص:۶۹۵

۷۷۔ ایضاً،ص:۷۳۵

۷۸۔ ایضاً،ص:۷۸۰

۷۹۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء،ص:۲۲۸۔۲۲۹

۸۰۔ ایضاً،ص:۲۳۰۔۲۳۱

۸۱۔ ایضاً،ص:۲۳۱۔۲۳۲

۸۲۔ ایضاً،ص:۳۱۳

۸۳۔ ایضاً،ص:۱۳

۸۴۔ انتظار حسین، شہرت بخاری مرحوم، لاہور: مشمولہ: راوی، جلد ۸۹، واحد شمارہ، ۲۰۰۲ء،ص:۱۳۲

۸۵۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو،ص.۹۲

۸۶۔ انتظار حسین، شہرت بخاری مرحوم، لاہور: مشمولہ راوی، جلد ۸۹، واحد شمارہ، ۲۰۰۲ء،ص:۱۴۱

۸۷۔ اختر الایمان، اس آباد خرابے میں، دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۶ء،ص:۱۴۷

۸۸۔ ایضاً،ص:۱۴۷

باب سوم

اُردو کی اہم آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال کا خصوصی جائزہ (۲۰۰۱ء تا حال)

باب سوم

اُردو کی اہم آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال کا خصوصی جائزہ (۲۰۰۱ء تا حال)

ہماری زندگی میں آپ بیتی کی ضرورت واہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ انسان اپنی زندگی کے بہت سے واقعات کو دہراتا رہتا ہے کبھی دوسروں کو نصیحت کرنے کے لیے اور کبھی بہتر سے بہترین راستہ تلاش کرنے کے لیے بار بار ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اس طرح ان غلطیوں اور کوتاہیوں کو دہرانے سے حتی الامکان گریز کرتا ہے۔ جن کا خمیازہ وہ ،یک مرتبہ پہلے بھگت چکا ہوتا ہے۔

''آپ بیتی'' جہاں اپنی ذات کے اظہار کا نام ہے وہاں یہ اخفا کا نام بھی ہے۔ زندگی کے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا گواہ صرف خدا ہوتا ہے۔ انسان ان واقعات کو جان بوجھ کر کسی مصلحت کے تحت مخفی رکھتا ہے۔ اس لیے جب کوئی شخصیت اپنی آپ بیتی لکھتی ہے تو بہت سے ایسے واقعات جن کے منظر عام پر آ جانے سے اس کی شخصی زندگی پر برے اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ ہوان کو معاشرے سے چھپا لیا جاتا ہے۔

انسان کی شخصیت مختلف حالات و واقعات سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں سماجی ماحول بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کی معمولی غلطی اسے پستیوں کی طرف لے جاتی ہے اور اکثر اوقات ایک اہم فیصلہ اسے بلندی اور پذیرائی سے نواز دیتا ہے۔ انسان کا شعور اور لاشعور اسے عمل کی جانب راغب کرتے ہیں اور اس کے نظریات اور افکار میں تبدیلی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ خودشناسی کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان اپنی ذات کو اچھی طرح پرکھ نہیں لیتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص خودنمائی چاہتا ہے اور اپنی ذات کے اظہار کے لیے ساری زندگی کوشش کرتا ہے۔ آپ بیتی اپنی ذات وصفات، خیالات وجذبات اور محسوسات کے اظہار کی ایک بہترین اعلانیہ صورت ہے۔ اظہار ذات کی بنیادیں سماج سے جڑی ہوئی ہیں اور سماج کا براہ راست تعلق سیاست سے استوار ہوتا ہے۔ اس لیے ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاشرے کے ادوار کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا بغور مشاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مقالہ کے اس باب میں اکیسویں صدی کی چند اہم آپ بیتیوں میں سیاسی اور سماجی صورت حال کا جائزہ پیش کیا

جائے گا۔ ان اہم بیتیوں میں ''جرمِ سیاست''، ''تمنا بے تاب''، ''اپنا گریبان چاک''، ''بلا کم و کاست''، ''نشانِ جگر سوختہ''، ''چاہِ یوسف سے صدا''، ''جالب بیتی''، ''ہاں! میں باغی ہوں'' اور ''عاشقی صبر طلب'' شامل ہیں۔

''جرمِ سیاست'' از میاں منظور احمد وٹو

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو کی آپ بیتی ۲۰۰۱ء میں احمد پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس آپ بیتی کے بعد میں اضافہ شدہ ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں۔ آپ بیتی کے تیسرے اضافہ شدہ ایڈیشن کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف ۱۴ راگست ۱۹۳۹ء کو ضلع فیروز پور کے گاؤں معظم میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے جدامجد معظم وٹو نے فیروز پور کے اس علاقے کو آباد کیا تھا۔ لہٰذا اسی مناسبت سے آپ کے گاؤں کا نام ''معظم'' رکھا گیا۔ آپ کی والدہ حوصلہ مند اور عبادت گزار خاتون تھیں جو کہ ۱۹۶۷ء میں کینسر کے موذی مرض کی وجہ سے اچانک انتقال کر گئی تھیں۔ آپ کے والد نے احمدی عقیدہ اختیار کر لیا تھا جس کی شدید مخالفت کی گئی لیکن انہوں نے آخری دم تک اپنا عقیدہ بدلنے سے انکار کر دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کے خاندان نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور اوکاڑہ میں حویلی لکھا کے قریب ایک گاؤں وساوے والا میں سکونت اختیار کی۔ مصنف نے پرائمری تک تعلیم اسی گاؤں کے سکول میں مکمل کی اور حویلی لکھا کے ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج ساہیوال سے ایف۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ آپ نے بی۔اے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے پاس۔ ایوب خان کے دور حکومت میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں مصنف نے عملی سیاست میں پہلی دفعہ حصہ لیا اور بلا مقابلہ چیئر مین یونین کونسل اور ممبر ضلع کونسل منتخب ہو گئے تھے۔

آپ بیتی کے باب دوم میں مصنف نے اپنے سیاسی سفر کے آغاز کے چند وجوہات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان دنوں تحصیل دیپال پور اور حویلی لکھا کا علاقہ تعمیر و ترقی سے محروم رکھے جانے کی بدولت بہت پسماندہ تھا۔ کچے راستے، بے روزگاری، بنیادی سہولتوں کا فقدان، نہری پانی کی عدم دستیابی، بنجر زمینیں، ساجی بدامنی، بجلی سے محروم دیہات جیسے عوامل کو دیکھ کر مصنف نے اپنے دوستوں کے اصرار پر سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آپ نے بحیثیت چیئر مین یونین کونسل علاقے کے تعمیراتی اور رفاعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یونین کونسل وساوے والا کو دوسرے دیہات سے سڑکوں کے ذریعے ملا دیا گیا۔ قبرستانوں کی حالت زار کو بہتر بنایا اور اس کے علاوہ بہت سے دیہات میں عوامی فلاحی امور کو اپنی مدد آپ کے تحت سرانجام دیا۔ دیہی ترقی کے کاموں کو سراہتے ہوئے اس دور کے کمشنر ملتان سید قاسم رضوی نے مصنف کو ضلع کے بہترین چیئر مین یونین کونسل ہونے کا اعزاز دیا تھا۔

آپ کو ۱۹۶۸ء میں بحیثیت چیئرمین یونین کونسل ''کومیلا'' مشرقی پاکستان میں ضلع ساہیوال سے نمائندگی کا موقع دیا گیا۔ ان دنوں صدر ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کی اکیڈمی کومیلا میں بنائی تھی۔ جہاں پر انہوں نے اپنے دورِ حکومت کی کامیابی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ پورے ملک میں اس سلسلے میں تقاریب کے انعقاد کے اقدامات کیے گئے۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر صدر ایوب خان کے استقبال کے لیے مصنف بھی موجود تھے۔ ایئرپورٹ پر لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ جو موجود تھے ان کے جذبات بھی آمرانہ حکومت کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ کومیلا مشرقی پاکستان میں مصنف کے میزبان کے خیالات کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ مغربی پاکستان کی ہر شعبے میں بالادستی کے خلاف تھے، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا، مشرقی پاکستان کی عوامی نمائندگی میں حق تلفی کی گئی، مشرقی اور مغربی پاکستان کو قومی اسمبلی میں برابر نشستیں دی گئیں حالانکہ مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ تھی، ون یونٹ اس لیے بنایا گیا تاکہ مشرقی پاکستان کے حقوق غصب کیے جائیں اور قرار داد لاہور پر مکمل عمل درآمد نہیں کیا گیا تھا۔

آپ بیتی میں میاں منظور احمد وٹو اپنے صوبائی اسمبلی کے پہلے الیکشن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میاں یٰسین وٹو، ایوب خان کی حکومت کے دوران سیاست میں قدم رکھ چکے تھے۔ مصنف کے ان سے اچھے تعلقات تھے۔ میاں یٰسین وٹو ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں جیت گئے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مصنف اور میاں یسین وٹو کو ٹکٹ جاری کر دیے تھے لیکن کاغذات نامزدگی داخل کروانے سے پہلے مصنف کو معلوم ہوا کہ ان کا ٹکٹ میاں غلام احمد مانیکا کو دے دیا گیا تھا۔ ان انتخابات میں آپ نے بطور آزاد امیدوار حصہ لیا لیکن حکومتی مشینری نے مصنف کو الیکشن سے دستبردار کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ آپ کے کارکنان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان انتخابات میں پی پی پی نے کامیابی سمیٹی تاہم پی این اے کی جانب سے صوبائی اسمبلی کے الیکشن کا دھاندلی کی شکایات پر مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا۔ انتخابات کے بعد میاں یٰسین وٹو کو وزارت دی گئی اور اس طرح مصنف کی ان سے دیرینہ رفاقت کا خاتمہ ہوا۔

پاکستان قومی اتحاد نے ملک گیر احتجاج کا آغاز کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پی این اے سے مذاکرات کا آغاز کر دیا تھا لیکن اسی دوران جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ بھٹو کو گرفتار کر کے جیل میں قید کر دیا گیا اور ۹۰ دنوں کے بعد دوبارہ انتخابات کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم اس وعدے کو وفا نہ کیا گیا۔ حالانکہ جنرل ضیاء الحق نے سعودی عرب جا کر وعدہ کیا تھا اور ان کے ایک نمائندے نے اقوام متحدہ کے اجلاس میں ۹۰ دن کے بعد انتخابات کروانے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا۔ مصنف بعد میں تحریک استقلال میں شامل ہوئے لیکن تحریک استقلال کے صدر ایئر مارشل اصغر خان نے لوکل باڈیز الیکشن میں حصہ لینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے مصنف ان انتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔

پنجاب کے گورنر جنرل غلام جیلانی خان نے ۱۹۸۱ء میں اوکاڑہ کو تحصیل سے ضلع بنا دیا تھا تو یہاں ضلع کونسل کے

چیئرمین اور وائس چیئرمین کے انتخابات کروائے گئے۔ مصنف اپنے احباب کے زبردست اصرار پر تحریک استقلال کے صدر اصغر خان سے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے انہیں رضامند کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ باالآخر اعصاب شکن مقابلے کے بعد میاں منظور احمد وٹو بطور چیئرمین ضلع کونسل اوکاڑہ منتخب ہو گئے۔ ۱۹۸۷ء میں آپ دوبارہ چیئرمین ضلع کونسل اوکاڑہ انتخاب جیت گئے جبکہ ۱۹۹۱ء میں آپ کے چچازاد بھائی میاں احمد شجاع وٹو چیئرمین ضلع کونسل منتخب ہوگئے تھے۔ آپ نے بطور چیئرمین ضلع کونسل بجلی کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے نئی لائنوں کا جال بچھا دیا، شہری پانی کی دستیابی، نئی سڑکیں، نئے پرائمری، مڈل، ہائی، ہائیر سیکنڈری، ڈگری کالجز اور نئے دیہی مراکز صحت کا قیام یقینی بنایا تھا۔

غیر جماعتی بنیادوں پر ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں مصنف نے میاں نواز شریف کے سیاسی گروپ کی حمایت کا اعلان کیا کیونکہ مصنف تحریک استقلال کے مرکزی جوائنٹ سیکرٹری رہ چکے تھے اور انہی دنوں میاں نواز شریف بھی تحریک استقلال میں شامل ہو چکے تھے۔ جب جنرل ضیاء الحق نے الیکشن مؤخر کر دیئے تو میاں نواز شریف مارشل لاء کے دور کی صوبائی کابینہ میں وزیر خزانہ کے طور پر حلف اُٹھا چکے تھے۔ ان عوامل کے لحاظ سے میاں منظور وٹو کی میاں نواز شریف سے وزیراعلیٰ پنجاب منتخب سے پہلے ہی کافی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ گورنر پنجاب نے اراکین صوبائی اسمبلی کی آراء کی روشنی میں جنرل ضیاء الحق کی مشاورت کے بعد میاں نواز شریف کو بطور وزیراعلیٰ پنجاب نامزد کیا۔ اراکین پنجاب اسمبلی کے اصرار پر میاں نواز شریف نے میاں منظور احمد وٹو کو بطور سپیکر اور میاں مناظر علی رانجھا کو ڈپٹی سپیکر پنجاب اسمبلی نامزد کر دیا تھ بعد میں انتخابات کے مراحل تکمیل پذیر ہوئے۔

سپیکر پنجاب اسمبلی انتخاب کے بعد مولانا منظور احمد چنیوٹی رکن پنجاب اسمبلی نے مصنف کے قادیانی کافر ہونے کا فتویٰ دے کر سپیکر کے عہدے سے فوری طور پر ہٹائے جانے کی تحریک پنجاب اسمبلی میں جمع کروا دی۔ مصنف نے مولانا سے باقاعدہ ملاقات کے بعد ان کی غلط فہمی کو دور کیا تو مولانا نے پنجاب اسمبلی میں جمع شدہ تحریک واپس لے لی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ آپ کے والد احمدیہ عقیدے کے حامل تھے اس لیے ان پر کفر کے نشتر پہلے بھی چلائے جاتے رہے تھے۔ غرض سیاست کے ہر نئے موڑ پر کفر والحاد ہی کا طعنہ سننے کو ملتا رہا حالانکہ ان کا باقی خاندان سنی العقیدہ تھا۔

وزیراعظم محمد خان جونیجو ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات میں منتخب ہوئے۔ جونیجو نے بطور صدر مسلم لیگ تمام صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی پیش کش کی تاہم کچھ اراکین قومی اسمبلی نے علیحدہ گروپ بنالیا۔ جنرل ضیاء الحق نے جب خواجہ صفدر کو سپیکر کے لیے نامزد کیا تو اس آزاد گروپ نے سید فخر امام کو بطور سپیکر قومی اسمبلی چن لیا۔ جنرل ضیاء الحق کے نامزد رکن کی قومی اسمبلی میں شکست دراصل ضیاء الحق کی پہلی شکست ثابت ہوئی۔ جونیجو نے نا صرف مسلم لیگ کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی بلکہ بہتر حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سے قابلِ تحسین اقدامات کیے جن میں سب سے اہم اپنی ہی کابینہ کے دو وزراء کو کرپشن کے الزامات پر فارغ کر دیا تھا۔ انہوں نے حزب اختلاف کے

خلاف انتقامی سرگرمیوں سے پرہیز کیا۔ افغانستان کے مسئلہ پر کل جماعتی اجلاس منعقد کروایا، مارشل لاء کے خاتمے کی کوششیں، جمہوریت پسندی کو فروغ دیا، سیاسی رواداری کا پیکر بنے، سیاسی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز کیا اور جنیوا معاہدہ کیا تھا۔

صدر ضیاء الحق ۱۹۸۸ء میں منتخب وزیراعظم محمد خان جونیجو کو آٹھویں آئینی ترمیم سے حاصل شدہ اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اسمبلیوں کو تحلیل کر کے حکومت کو ختم کر دیا۔ عبوری حکومت کے لیے سندھ میں غوث علی شاہ، بلوچستان میں ظفر اللہ جمالی، سرحد میں جنرل فضل حق اور پنجاب میں میاں نواز شریف کو وزیراعلیٰ مقرر کر دیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وزیراعظم محمد خان جونیجو پر بدعنوانی کا کوئی الزام نہیں تھا لیکن جنرل ضیاء الحق بعض سیاسی اقدامات پر ان سے ناخوش تھے جس کی وجہ سے جونیجو کو وزارت عظمیٰ سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کچھ عرصہ بعد اچانک جنرل ضیاء الحق فضائی حادثہ کا شکار ہو گئے۔ غلام اسحاق خان نے بطور صدر پاکستان عہدہ سنبھالا اور انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور مرکز کے ساتھ دو صوبوں سندھ اور سرحد میں صوبائی حکومتیں بھی بنانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ پنجاب کی صوبائی حکومت کے لیے آزاد امیدواروں کو ساتھ ملانے کے بعد صوبائی اسمبلی میں وزیراعلیٰ کے انتخاب پر میاں نواز شریف کو ۱۵۰ اور مصنف کو بطور سپیکر خفیہ رائے شماری کے بعد ۱۵۵ اراکین صوبائی اسمبلی نے ووٹ دیئے تھے۔ میاں منظور وٹو آپ بیتی میں اپنے پنجاب اسمبلی کی سپیکر شپ کے علاوہ وزارت اعلیٰ کے مختلف ادوار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”میں صوبہ پنجاب کا پانچ مرتبہ وزیراعلیٰ بنا، دو مرتبہ، منتخب ہو کر، دو مرتبہ، نگران وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اور پانچویں مرتبہ عدالت عالیہ کے فل بنچ کے فیصلے کے نتیجے میں میری حکومت بحال ہوئی۔ میری وزارت اعلیٰ کا سب سے زیادہ عرصہ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے بعد پاکستان ڈیموکریٹک فرنٹ کی مخلوط حکومت کی پنجاب میں سربراہی کا دور ہے جو اکتوبر ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء تک جاری رہا۔“[1]

میاں منظور احمد وٹو میاں محمد شریف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کی اہم سیاسی معاملات میں بھرپور مشاورت اور راہنمائی کیا کرتے تھے۔ میاں برادران اپنے والد کے فیصلوں پر من وعن عمل پیرا ہوتے تھے۔ میاں محمد شریف کا معمول تھا کہ وہ صبح جلدی اُٹھ کر تہجد کی نماز ادا کرتے پھر سیر کرنے کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر ناشتہ کر کے چھ بجے تک اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ وزارت عظمیٰ کے حصول کے بعد بھی نواز شریف کے والد پاکستان میں مسلسل اپنے کاروبار کو بڑھاتے چلے گئے تھے، حالانکہ ان کے چند خیر اندیش ساتھیوں نے انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔ مصنف آپ بیتی میں میاں محمد شریف اور میاں نواز شریف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ”نواز شریف پانچ سال صوبائی وزیر خزانہ، ۵ سال وزیراعلیٰ پنجاب اور ۲ سال

وزیراعظم رہے۔ اتنا بڑا اور لمبا اقتدار ملک میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اس میں ان کے والد صاحب کا بڑا ہاتھ رہا...... نتیجہ کے طور پر کابینہ اور پارلیمانی پارٹی سے مشاورت کم ہوتی گئی اور فیصلوں میں خاندانی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا بالآخر پارلیمانی جمہوریت شخصی فیصلوں کے تابع ہوگئی۔''(۲)

میاں محمد شریف پاکستان میں متبادل عدالتی نظام یعنی دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں کا نظام رائج کرنے کے لیے قانون سازی کروانا چاہتے تھے۔ ان خصوصی عدالتوں کے قیام کے مسئلے پر وزیراعظم میاں نواز شریف اور چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ میں اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ وزیراعلیٰ شہباز شریف نے اس مسئلے کو حل کروانے کی خاطر مجید نظامی کے ذریعے سجاد علی شاہ سے ملاقات کی اور انہیں وزیراعظم سے بالمشافہ ملوایا گیا تو وزیراعظم نے دہشت گردی کے مقدمات کا فیصلہ ایک ماہ میں اور اپیلٹ کورٹ میں دو ماہ کے اندر مقدمات کے فیصلوں کی خواہش کا اظہار کیا۔ چیف جسٹس نے ان کی بات تسلیم کر لی لیکن ساتھ ہی واضح کر دیا کہ وہ متبادل عدالتی نظام کے حق میں اس لیے نہیں ہیں کہ وہ قانونی تقاضوں کو مکمل انداز میں پورا نہیں کر سکتا اور اس طرح موجودہ عدالتی نظام پر یہ کھلم کھلا عدم اعتماد ہوگا۔ اس ملاقات میں تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے تھے لیکن بعد میں میاں محمد شریف نے متبادل عدالتی نظام کو ہی اپنانے پر زور دیا اور ملاقات میں فریقین کی تجاویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ بیتی میں اس معاملہ کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں:

''وزیراعظم اور چیف جسٹس پاکستان کا طے شدہ فیصلہ جس میں مدیر نوائے وقت اور وزیراعلیٰ شہباز شریف بھی شامل تھے، میاں محمد شریف نے توڑ دیا۔''(۳)

صدر غلام اسحاق خان نے ۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء کو چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر قومی اسمبلی کو تحلیل کر کے میاں نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ صدر کے اس اقدام سے قبل مصنف پنجاب کے وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر چکے تھے لہٰذا مسلم لیگ کے ۱۶۵/اراکین پی پی پی کے گیارہ اور جماعت اسلامی کے دو اراکین صوبائی اسمبلی کے ووٹوں کی بدولت مصنف کو وزیراعلیٰ پنجاب منتخب کر لیا گیا۔

عدالت کی طرف سے جب میاں نواز شریف کی حکومت کو بحال کر دیا گیا تو چند دن کے بعد مصنف نے محترمہ بے نظیر بھٹو سے اسلام آباد میں ملاقات کی۔ ملاقات میں بی بی نے نواز شریف کی طرف سے ہارس ٹریڈنگ کیے جانے پر شکوہ کیا اور مصنف کو پنجاب اسمبلی کو توڑ دینے کا مشورہ دیا۔ مصنف نے اپنی کابینہ اور احباب سے مشاورت کے بعد پنجاب اسمبلی کو توڑنے کے لیے گورنر پنجاب کو مشورہ دیا اور یوں پنجاب اسمبلی برخاست کر دی گئی۔ بی بی نے حسب وعدہ صدر سے کہہ کر میاں منظور احمد وٹو کو نگران وزیراعلیٰ پنجاب بنا دیا۔

میاں منظور احمد وٹو کی وزارت اعلیٰ کے دوران جن امور پر ترجیحی بنیادوں پر کام کروایا گیا۔ ان میں سرفہرست تعلیم تھی۔ فروغ تعلیم کے حصول کے لیے نا صرف سالانہ بجٹ میں اضافہ کیا گیا بلکہ جامع منصوبہ بندی کے ذریعے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے پنجاب اسمبلی سے لازمی پرائمری تعلیم کا ایکٹ پاس کروالیا گیا، تمیں ہزار دیہات میں غریب اور بے گھر لوگوں کو مالکانہ حقوق دینے کا قانون پاس کرایا گیا۔ فوری انصاف کے لیے ہر سب ڈویژن کو سیشن ڈویژن بنا دیا گیا، لوکل باڈیز آرڈیننس ۱۹۹۵ء پاس کرایا گیا، پنجاب زرعی کمیشن قائم کیا گیا۔ کسانوں کے لیے سستی بجلی کی فراہمی، اریگیشن اتھارٹی کا قیام، اسلحہ کی نمائش پر پابندی، لاؤڈ سپیکر پر پابندی، ترقیاتی کاموں میں تیزی اور کئی عوامی سکیموں کا افتتاح کیا گیا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد صدر فاروق احمد خان لغاری نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف اور قومی اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ حکومت کو برطرف کرنے کی دو بنیادی وجوہات کرپشن اور کئی ماورائے عدالت قتل کروائے جانے کو قرار دیا گیا۔ صدر کی جانب سے منتخب حکومت کو برطرف کر دیئے جانے کے چند دن بعد مصنف کی صدر فاروق احمد خان لغاری سے ملاقات ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ بڑے حوصلہ اور سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی ہی سیاسی جماعت کی حکومت کو پاکستان کے وسیع تر قومی مفاد میں برطرف کرنے کا انتہائی مشکل فیصلہ لیا ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت میں نے اس لیے ختم نہیں کی کہ پاکستان کی تقدیر نواز شریف کے سپرد کر دی جائے کیونکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ نواز شریف ان سے زیادہ کرپٹ ہے۔''(۴)

صدر کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد میاں نواز شریف انتخابات میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور حکومت بنانے کے بعد چودھویں آئینی ترمیم کر کے پارلیمنٹ کو تابع کر لیا۔ میاں نواز شریف نے پندرھویں آئینی ترمیم سے صدر کے بنیادی نوعیت کے اختیارات جن میں اسمبلی کو تحلیل کرنے، آرمی چیفس کو ہٹانے، تعینات کرنے، گورنروں کو ہٹانے اور تعینات کرنے کے اختیارات کو وزیراعظم کے سپرد کر دیا۔ جبکہ صدر کے اختیارات کو کم کر دیا گیا۔ اس دوران میاں نواز شریف نے احتساب سیل کے ذریعے اپنے سیاسی مخالفین پر احتساب کے نام پر ریفرنس دائر کروائے۔ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ نے آصف زرداری اور بی بی کو پانچ پانچ سال قید، انتخابات کے لیے نااہل اور چوالیس چوالیس کروڑ روپے جمع کروانے کے احکامات سنائے۔

میاں منظور احمد وٹو کو اگست ۱۹۹۹ء میں سپریم کورٹ نے ضمانت پر رہا کر دیا تو آپ بھی پاکستان عوامی اتحاد میں شامل ہو گئے، جس کا صرف یک نکاتی ''نواز ہٹاؤ'' مطالبہ تھا۔ اس اتحاد میں تحریک انصاف، ایم کیو ایم، نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان عوامی تحریک شامل ہوئیں۔ گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس کا پہلا اجلاس مصنف کے گھر پر منعقد کیا گیا تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو میاں نواز شریف کی حکومت کو ختم کر دیا۔ سپریم کورٹ نے تین سال تک حکومت کرنے کا اختیار دے دیا۔ احتساب کا قانون بنایا گیا۔ لوکل باڈیز کا نظام لاگو کر دیا گیا۔ ان دنوں جمہوریت کی بحالی کے نام پر ایک نیا اتحاد اے۔ آر۔ ڈی یعنی اتحاد برائے بحالی جمہوریت سامنے آیا جس میں مسلم لیگ نواز نے بھی شمولیت اختیار کر لی۔ میاں نواز شریف کو جہاز اغوا کرنے کے جرم میں عمر قید اور احتساب کے دوسرے کیس میں چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی تھی۔ میاں نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف سے سعودی شہزادوں کے ذریعے ڈیل کروائی اور سعودی عرب منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے میجر جنرل حسین مہدی جو کہ اس وقت ڈی جی رینجرز تھے، ان کو پی پی کے اراکین کا ایک فارورڈ بلاک بنانے کا ٹاسک دیا گیا۔ انہوں نے سترہ اراکین پر مشتمل ایک گروپ قائم کر لیا۔ صدر نے میر ظفر اللہ جمالی کو پاکستان کا وزیراعظم منتخب کروا دیا، کچھ عرصہ بعد صدر کے معاونین نے سابق بیوروکریٹ شوکت عزیز کو میر ظفر اللہ جمالی کی جگہ وزیراعظم بنانے کا مشورہ دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وزیراعظم جمالی سے استعفیٰ لے کر چوہدری شجاعت حسین کو وزیراعظم بنایا گیا جبکہ شوکت عزیز کو اٹک سے انتخاب جتوا کر وزیراعظم پاکستان بنا دیا گیا۔

مئی ۲۰۰۶ء میں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے مابین مینڈیٹ کے احترام پر ایک معاہدہ لندن میں طے پایا جسے میثاق جمہوریت کہا جاتا ہے۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں بی بی پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ جس میں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ اس سانحے کے بعد آصف علی زرداری نے ''پاکستان کھپے'' کا نعرہ لگایا اور ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ پی پی نے وزیراعظم کے لیے یوسف رضا گیلانی کو امیدوار نامزد کیا جنہیں قومی اسمبلی میں بلامقابلہ منتخب کیا گیا تھا۔ ۲۰۱۳ء کے عام انتخابات میں میاں محمد نواز شریف پاکستان کے تیسری دفعہ وزیراعظم منتخب ہوئے۔

میاں منظور احمد وٹو کی تحریر کردہ آپ بیتی پاکستانی سیاست کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ خودنوشت میں خاندانی پس منظر سے لے کر تعلیمی اور سیاسی زندگی کی تگ و دو کو بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ بیتی میں پاکستان کی سیاست کے نشیب و فراز کی کہانی کو ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی نظر سے دکھایا گیا ہے۔ مصنف اپنی داستان حیات کو ایک منظم انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے قاری کے ذہن کی کئی سیاسی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک کامیاب سیاست دان کی تحریر کردہ کامیاب آپ بیتی ہے۔

''تمنا بے تاب'' از ڈاکٹر رشید امجد

آپ بیتی کے مصنف ڈاکٹر رشید امجد اردو ادب کے معروف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر مقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۶۰ء میں اپنی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق، تنقید اور افسانہ نگاری کو بھی کامیابی سے جاری وساری رکھا ہوا ہے۔ آپ نامور اردو تحقیقی رسالوں ''دریافت'' اور ''تخلیقی ادب'' کے مدیر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

رشید امجد کی تحریر کردہ آپ بیتی جسے حرف اکادمی راولپنڈی نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ اس آپ بیتی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی مکمل آپ بیتی نہیں ہے بلکہ کچھ یادیں، خیالات اور تجربات ہیں۔ جن میں ان کی زندگی اور ان کا گزرا ہوا دور دونوں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ان کے تاثرات بھی موجود ہیں جن کو انہوں نے بغیر تعصب اور مبالغہ آرائی کے جو کچھ دیکھا، جیسا دیکھا، سنا اور محسوس کیا قلم بند کرتے گئے۔ آپ بیتی میں زمانی ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ جو بات، واقعہ، قصہ، خیال اور تجربہ یاد آیا بیان کرتے گئے ہیں۔

انہوں نے اپنی آپ بیتی میں ذاتی احوال اور یادداشتوں کے ساتھ بعض ایسے مباحث کا تذکرہ بھی کیا ہے جو کسی طور پر مضمون کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ آپ بیتی کی بہت سی خصوصیات گنوائی جا سکتی ہیں لیکن اس میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رشید امجد نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی عملی طور پر مساعی کی ہے۔

مصنف آپ بیتی کے آغاز میں پاکستان کی مارشل لاء زدہ سیاست کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''میری نسل کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی کا بڑا حصہ مارشل لاء میں گزارا، میں اٹھارہ سال کا تھا تو پہلا مارشل لاء لگا۔ چالیس کی دہلیز پر قدم رکھا تو دوسرا مارشل لاء لگ چکا تھا اور ساٹھ کے دائرے میں پاؤں رکھ رہا تھا تو ملک تیسرے مارشل لاء کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔''(۵)

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا المیہ یہ رہا ہے کہ جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ دراصل مارشل لاء کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ پورے سیاسی وسماجی ماحول کو اندر سے جکڑ لیتا ہے۔ ہر مارشل لاء بنیادی سیاسی ڈھانچے کو مکمل طور پر توڑ پھوڑ دیتا ہے اور جمہوری نظام کی بجائے فرد واحد ملک کے سیاہ وسفید کا مالک بن جاتا ہے۔

آپ بیتی میں مصنف نے قیامِ پاکستان سے پہلے کی سیاسی سرگرمیوں کو بھی بیان کیا کہ کس طرح ان کے گھر کے سامنے سے اکثر جلوس گزرا کرتے تھے اور سیاسی لیڈروں کے نام گونجتے تھے۔ آپ کا گھر چونکہ کشمیر میں تھا تو ان جلوسوں میں

اہم نام شیخ عبداللہ کا لیا جاتا تھا کیونکہ اس وقت ان کی سیاسی جماعت نیشنل کانگریس کافی متحرک اور فعال تھی۔ شیخ عبداللہ کے علاوہ جن سیاسی شخصیات کا ذکر انہوں نے سنا ان میں سب سے اہم نام گاندھی، نہرو اور قائداعظم کے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد رشید امجد نے پاکستان کی سیاست کا جو نقشہ کھینچا ہے اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

''قائداعظم کی رحلت کے بعد سیاسی نظام کی ابتری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ قائداعظم نے ۲۲ راگست ۱۹۴۷ء کو سرحد میں ڈاکٹر خان کی اسمبلی کو برطرف کر دیا لیکن بعد والوں نے اسے معمول بنا لیا۔''(۶)

قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنا دیئے گئے۔ وہ طبیعت کے لحاظ سے سخت آدمی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اختیارات کی مرکزیت وزیراعظم لیاقت علی خان کے ہاتھ میں آ گئی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس سیاسی صورت حال میں لیاقت علی خان نے نئے نظام میں جو سیاسی اقدار وضع کیں، وہی پاکستانیوں کا سیاسی مقدر ٹھہرائی گئیں۔ وزیراعظم نے ہی مقام اور مہاجر میں تفریق کر کے علاقائی اور لسانی عصبیت کو ہوا دی۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے ۱۹۴۹ء میں پنجاب میں نواب ممدوٹ کی وزارت کو ختم کروا کر نئی سیاسی چال چل دی۔ انہوں نے مسلم لیگ میں وزیراعظم اور صدر کے عہدے یکجا کر کے نہ صرف وزارت عظمیٰ بلکہ مسلم لیگ کی عملی سیاست پر بھی مکمل کنٹرول رکھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست میں انحطاط کا ایسا نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہوا۔ جس نے جلد لسانی اور علاقائی عصبیت کو ہوا دی۔ جس کا خمیازہ بعد میں ہم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں بھگتا تھا۔ رشید امجد آپ بیتی میں اپنے سیاسی تاثرات کا برملا اظہار کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کشمیر کے مسئلہ کے بارے میں بھی انہوں نے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے کہ جنرل گریسی نے جو پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف تھے انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستانی افواج کو کشمیر میں مداخلت سے انکار کر دیا تھا۔ کشمیر کے اہم سیاسی رہنما غلام عباس نے قائداعظم سے مل کر انہیں قائل کر لیا تھا کہ افواج پاکستان کو کشمیر میں براہِ راست مداخت کر کے سری نگر پر قبضہ کر لینا چاہیے لیکن اڑتالیس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی جب احکامات پر عمل درآمد نہ ہو سکا تو پتہ چلا کہ قائداعظم نے تو احکامات دیئے تھے لیکن درمیان میں کسی نے انہیں دبا لیا تھا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے پنڈی سازش کیس کے ردعمل میں ادبی تحریکوں پر مختلف پابندیاں عائد کر کے بنیادی انسانی حقوق کو پامال کیا۔ مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ لیاقت علی خان نے اپنے خلاف بعض الزامات کو غلط ثابت کرنے کے لیے چند اقدامات بھی کیے لیکن انہیں راولپنڈی میں جلسے کے دوران شہید کر دیا گیا۔

رشید امجد لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کے لیاقت باغ راولپنڈی میں جلسہ کے دوران شہادت کے عینی شاہد

ہیں۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال اور ان کی بہن کی عمر پانچ سال تھی۔ اس جلسہ میں لوگ جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ جب جلسہ شروع ہوا اور لیاقت علی خان کی تقریر کی باری آئی تو ابھی انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ہی کیا تھا کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ملکی سیاست کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی۔ رشید امجد نے لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پاکستان کی سیاسی صورت حال کو تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے۔

پاکستان کی سیاسی صورت حال کا جس طرح نقشہ مصنف نے کھینچا ہے۔ اس کی مثال تو شاید تاریخ پاکستان اور پاکستانی سیاسیات کی کتب میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ رشید امجد نے پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے دور سیاست، ان کی خارجہ پالیسی، امور سیاست کی جھلک، ان کی شہادت اور اس کے بعد کے سیاسی عوامل کو بطریق احسن بیان کیا ہے۔ اس وقت کے گورنر جنرل غلام محمد نے وزیراعظم ناظم الدین کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر کے قومی اسمبلی کو بھی برطرف کر دیا اور خود ملک کے سیاہ سفید کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اس دوران گورنر جنرل غلام محمد پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے ان کی زبان میں لکنت آ گئی تھی۔ ایوب خان اس دور میں کمانڈر انچیف بن چکے تھے اور جیسا چاہتے تھے گورنر جنرل غلام محمد سے کہلوا لیتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے کمانڈر انچیف ایوب خان کی امور حکومت پر گرفت مضبوط سے مضبوط ہوتی گئی اور پھر پاکستانی عوام پر مارشل لاء کو مسلط کر دیا گیا۔ پہلے مارشل لاء کے نفاذ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ”امریکی مداخلت شروع ہو چکی تھی اور سی آئی اے کی تائید سے ایوب خان مارشل لاء لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔“(۷)

آپ بیتی میں مصنف نے سیاسی صورت حال کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال کا بھی جائزہ لیا ہے۔ پاکستان میں پہلے مارشل لاء کے اثرات براہِ راست سماج پر پڑے۔ ان میں سے جو فوری طور پر اثر دیکھنے میں آیا کہ اس دور میں عموماً چیزیں راشن سے ملتی تھیں اور ان چیزوں کو بلیک کیا جاتا تھا لیکن مارشل لاء لگنے سے ذخیرہ اندوزی پر کاری ضرب لگائی گئی جس کی وجہ سے دکانوں پر لمبی لمبی لائنیں لگ گئی تھیں۔ اس دور میں کچھ عرصے کے لیے ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کا بازار گرم ہو گیا۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں اپنے گھریلو حالات، غربت و افلاس کی وجہ سے والدین کے جھگڑے، والد کی ملازمت کے مسائل اپنی معمولی خواہشات کی تکمیل کے لیے گھر سے برتن چوری کر کے بیچنا اور اس پر والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصنف کو اپنے گھر کے حالات کو بہتر کرنے کے لیے ایک کریانہ کی دکان پر تیس روپے ماہوار پر منشی کی ملازمت بھی کرنی پڑی۔ مصنف اپنے دور کے ایک عام آدمی کی سماجی صورت حال کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ”محلوں میں آنہ لائبریریاں قائم تھیں، اس کے علاوہ ٹرنک بازار میں، جواب اقبال

روڈ بن گیا ہے، کتاب گھر کے نام سے ایک بڑی لائبریری تھی، جہاں شام کو شہر بھر
کے پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تلاش میں آتے تھے۔"(۸)

رشید امجد آپ بیتی میں سماجی عوامل کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ہماری قومی تاریخ کو بغور دیکھا جائے تو بہت سی غلطیاں اور ناکامیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان غلطیوں اور ناکامیوں کا رونا تو ہم ہر وقت روتے رہتے ہیں اور ان کا آپس میں تذکرہ بھی بڑے زور و شور سے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہم نے بحیثیت ایک قوم کبھی بھی سنجیدگی اور دانش مندی سے ان کا تجزیہ کر کے انہیں معاشرے سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کی جو ان ناکامیوں کی بنیادی وجہ ہیں۔ آزادی کے ستر برس گزرنے کے بعد بھی ہمارے حکمرانوں نے ان عوامل کو تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کا آغاز تک نہیں کیا۔ اگر کچھ اصلاح احوال ہوئی بھی تو وہ محض وقتی یا لحاتی تھی۔ ہم نے دراصل ہر دور میں وقت گزارنے کی حکمت عملی کو اپنائے رکھا جس کی وجہ سے قومی مصائب نے بڑے بڑے مسائل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان مسائل میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن کا ہے جو کہ ہماری جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔

پاکستان کے سماجی مسائل میں ایک اداروں کی کرپشن ہے جس نے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ان اداروں میں مختلف حیلے بہانوں اور مخصوص طریقہ کار سے رشوت کا بازار خوب گرم ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے پولیس کی اصلاح اور بہتری کے لیے ایک اہم حل بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ہماری پولیس کا ڈھانچہ نوآبادیاتی نظام میں تیار کیا گیا تھا۔ جہاں پولیس حکمران کی
قوت کا اظہار ہوتی ہے اور اس کا کام عوام کو دبانا اور ان کی تذلیل کرنا ہوتا ہے۔"(۹)

پاکستان میں بہت سارے مسائل ملک میں مؤثر منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے بھی ہیں۔ یہاں بہت سے اداروں میں انگریز دور کے اصول وضوابط اور قوانین آج تک رائج ہیں۔ اس دور کے اپنے عصری تقاضے تھے۔ آبادی کم تھی اور انگریز اپنی مخصوص پالیسیوں کے عین مطابق ضابطے طے کرتے تھے لیکن ہمارے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہم آج بھی ان فرسودہ قوانین پر جوں کے توں عمل پیرا ہیں۔ رشید امجد آپ بیتی میں اسی فرسودہ نظام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"نظام کی خرابی کا یہ حال ہے کہ بیوروکریسی ایک ارنے بھینسے کی طرح ہر طرف دندنا
رہی ہے۔ کوئی اسے نکیل ڈالنے والا نہیں۔ کہتے ہیں ایک سیکرٹری ایک لاکھ روپے
مہینے میں پڑتا ہے۔"(۱۰)

رشید امجد نے پاکستان کے سماجی حالات کو بڑی باریک بینی سے پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آپ بیتی میں جا بجا ان حالات کو بیان کیا ہے۔ سماج کی بہتری اور اصلاح احوال کے لیے حکومتیں مختلف قسم کے قوانین بناتی رہتی ہیں لیکن ان

قوانین کو صرف بنا کر چھوڑ دینے سے مسائل بہتر نہیں ہوتے بلکہ ان قوانین کو ان کی اصل روح کے مطابق لاگو کروانا بھی حکومت کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنف چند حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہیومن رائٹس کمیشن کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت صرف سندھ میں پچیس لاکھ لوگ غلامی سے بھی نیچے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی بیویاں اور بیٹیاں جاگیرداروں اور ان کے دوستوں کی تفریح کا ذریعہ ہیں۔ بلوچستان میں چند سرداروں کی حکومت ہے جن کی ذاتی جیلیں ہیں۔''(۱۱)

پاکستان میں جاگیرداروں اور وڈیرہ شاہی کا آج بھی دور دورہ ہے۔ وہ اپنے علاقوں میں سکول، کالج یا کوئی صنعت اس لیے نہیں کھلنے دیتے کہ کل کو ہماری غلامی کون کرے گا۔ ملک میں چند سو سیاست دان جاگیردار، صنعت کار اور کاروباری حلقوں سے تعلق رکھنے والے ہیں جبکہ مذہبی جماعتوں کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔ جن کے تحفظ کے لیے وہ ہر حکومتی جماعت کے ساتھ شامل ہو کر مراعات حاصل کر کے پانچ سال گزار لیتے ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف ایک عام پاکستانی کے حوالے سے پیش آنے والی معاشی، معاشرتی اور سماجی مشکلات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ قومیں اس وقت زوال پذیر ہوتی ہیں جب وہ اپنے معاشرے میں موجود گناہ اور ظلم کے عوامل کو گناہ اور ظلم سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ رشید امجد اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

''قومیں جب اپنے زوال کو انجوائے کرنا شروع کر دیں اور اس میں لذت کے ساتھ ساتھ فخر کا پہلو تلاش کر لیں تو پھر دریاؤں کو سوکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ سو میرا سفر ختم نہیں ہوا، پھر شروع ہو رہا ہے۔''(۱۲)

آپ بیتی میں عام لوگوں کی روزمرہ سماجی زندگی کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آج عام آدمی کے حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں غریب لوگ، غریب تر اور امراء امیر سے امیر ترین ہوتے جا رہے ہیں۔ اشیاء کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ سے سفید پوش طبقہ اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ انہیں دو وقت کا اچھا کھانا کھلانے سے قاصر ہے۔ کاروباری حضرات اخراجات میں اضافہ کی وجہ سے اپنے بہت سے صنعتی یونٹ بند کرتے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے آئے روز مزدور بے روزگار ہوتے جا رہے ہیں۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں تقسیم ہندوستان سے پہلے کے مذاہب کے درمیان سماجی اور تہذیبی تعلقات کا بھی تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح مذاہب کے درمیان تصادم کروائے جاتے رہے اور عام آدمی کی زندگی پر ان کے اثرات کس طرح مرتب ہوئے۔ انگریز حکومت کا ہندوستان پر حکومت کرنے کا ایک واضح اصول تھا کہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' آپ بیتی میں مصنف

نے قیامِ پاکستان سے پہلے اور آزادی کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے۔ تقسیم ہندوستان سے پہلے مسلمانوں کے سامنے بہت سے اہداف تھے۔ مسلمانوں کو برصغیر میں اپنا باعزت وجود برقرار رکھنے کے لیے مختلف اقوام کے گروہوں سے برسرپیکار رہنا پڑتا تھا۔ یہ تہذیبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور لسانی نظریات کے ٹکراؤ کا دور تھا۔ آزادی سے پہلے مسلم قوم کو خاص طور پر اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے دوسری تہذیبوں سے متصادم ہونا پڑتا تھا لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کے درمیان یہ فکری ٹکراؤ تفرقہ بازی کی شکل میں دکھائی دینے لگا۔ مسلمان فرقہ پرستی کا اس قدر شکار ہوئے کہ آپس میں ہی دست و گریباں ہو کر دشمنوں کے آلہ کار بننے لگے۔

اس آپ بیتی میں مصنف نے مختلف سیاسی شخصیات کے بارے میں اپنے تجربات کو بیان کیا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مصنف پاکستان کی سیاسی جماعتوں، ان جماعتوں کے اغراض و مقاصد، سیاسی قائدین اور ان سیاسی جماعتوں کے منشور تک سے آگاہ تھے۔ اس طرح بہت سے پاکستان کے حکمرانوں کے طرزِ عمل سے بھی واقف تھے۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں پاکستان کے تمام اہم سیاسی رہنماؤں کے بارے میں بے لاگ تبصرے کیے ہیں جو کہ پاکستانی سیاسی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مصنف کی آپ بیتی میں سیاسی حکمرانوں کے ادوارِ حکومت پر بھی مؤثر تنقید پڑھنے کو ملتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی معاشرت میں منافقت کے رویے ضیاء الحق کے دور میں شروع ہوئے۔ اس کی اپنی زندگی میں بھی تضاد تھا، موصوف سیاسی جماعتوں، خصوصاً پیپلز پارٹی کو قابو میں کرنے کے لیے مسجدوں کے نیم خواندہ اور نیم سیاسی تربیت یافتہ لوگوں میں مقبول ہونے کے لیے مذہب کو بطور نعرہ استعمال کر کے اس کی کچی پکی تفسیر کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔''(۱۳)

رشید امجد اپنی آپ بیتی میں پیپلز پارٹی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی دور کو ان کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو کی طرزِ حکومت اور سیاست سے موازنہ کر کے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جس سے پیپلز پارٹی کے دونوں رہنماؤں کی سیاسی سوچ اور فکر کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''عام لوگ بھٹو کی شخصیت سے عشق کرتے تھے اس حوالے سے پیپلز پارٹی بھی ان کی محبوبہ تھی۔ بھٹو کو اس کا احساس تھا اور کسی حد تک وہ عوام کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے لیکن بے نظیر نے عوام کے عشق کو ان کی مجبوری سمجھا۔''(۱۴)

پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسیوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے، رشید امجد کا کہنا ہے کہ بھٹو کی ذاتی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر انہوں نے نہ صرف پاکستانی سیاست میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا بلکہ تیسری دنیا میں ان کی سیاست قابل ذکر مقام کی حامل ہے۔ رشید امجد نے آپ بیتی میں خود کو ذوالفقار علی بھٹو کا حامی ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے۔ آپ بیتی میں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت ان کی سیاست اور ان کی حکمت عملیوں کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ایک امید سی بندھ گئی کہ شاید اب زوال کی دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ بھٹو کا یہ کریڈٹ تو اپنی جگہ کہ انہوں نے ۷۳ء کا آئین بنا دیا لیکن ان کے جاگیردارانہ مزاج نے جمہوریت کی روح کو قبول نہیں کیا۔''(۱۵)

مصنف کا کہنا ہے کہ اصولی طور پر میں ذوالفقار علی بھٹو کا حامی ہوں لیکن جب کراچی میں مزدوروں کا مسئلہ پیدا ہوا تو مصنف نے مزدوروں کے مسائل پر ایک افسانہ ''بے پانی کی بارش'' تحریر کر دیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے دوست ان سے سخت ناراض ہوئے اور انہیں قومی مزدور محاذ کا سٹڈی سرکل بھی نہ چاہتے ہوئے چھوڑنا پڑا۔ مصنف کی نظر میں بھٹو کے منفی پہلوؤں کو اگر دیکھا جائے تو وہ مثبت پہلوؤں سے نسبتاً کم تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دو بہت بڑے کام، جن میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا آغاز اور اسلامی ممالک کو باہم یکجا کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے نظریات اور اندازِ حکمرانی کے بارے میں رشید امجد نے اپنے تاثرات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے اپنے ادوار حکومت کو طول دینے کے لیے کیسی کیسی سیاسی حکمت عملیوں کا سہارا لیا۔ مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''بھٹو کا نعرہ چونکہ روٹی کپڑا اور مکان اور اسلامی سوشلزم تھا اس لیے مارشل لاء نے اسلام کا نعرہ بلند کیا۔ بھٹو اپنے نعرے کے ساتھ مخلص نہیں تھا، ضیاء اسلام کے نفاذ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ سوشلزم آیا نہ اسلام۔''(۱۶)

پاکستان میں کمیونزم اور سوشلزم کی دلدادہ عوام مغرب زدہ ماڈرن ازم کو ہی سوشل ازم سمجھ کر اس کے حق میں نعرے بلند کرتی رہی ہے۔ عوام کو لگتا ہے کہ معاشرے کی اوپر کی سطح پر ہی تبدیلی کافی ہے جبکہ اس کے مخالف جو کہ قبائلی نظام یا ظاہری رسوم کی بجا آوری کو اسلام سمجھ کر جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق نے بھی مکمل اسلامی نظام حیات یعنی شریعت کو نافذ کرنے کی

بجائے ظاہری اسلامی عوامل پر زور دیا حالانکہ جیسا موقع انہیں ملا تھا وہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ کر دینے کی طاقت رکھتے تھے۔ ضیاء الحق نے بھی نظریہ ضرورت اور بھٹو کی پالیسیوں کو رد کرنے کے لیے ظاہری سطح کے اسلام سے مصلحت پسندی کے تحت وقت گزار لیا۔

رشید امجد نے آپ بیتی میں پاکستان کے سیاسی منظر نامے کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ ملک میں بار بار لگنے والے مارشل لاء کو ملکی ترقی، خوش حالی اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے نہایت خطرناک قرار دیا ہے۔ مجموعی طور پر ملک میں لگنے والے مارشل لاء کے بارے میں اپنے تاثرات درج ذیل اقتباس میں پیش کرتے ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

''پہلے مارشل لاء (۱۹۵۸ء) میں تو اکثر لوگ اس نام ہی سے واقف نہ تھے لیکن دس سالہ آمریت کا مزہ چکھ کر اور پھر دوسرے مارشل لاء (۱۹۶۹ء) میں آدھا ملک گنوا کر سب کو مارشل لاء کی نام نہاد افادیت کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ جب تیسرا مارشل لاء لگا تو اکثریت نے اسے پسند نہیں کیا۔''(۱۷)

پاکستان کے عوام یکے بعد دیگرے مارشل لاء سے اکتا چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ عوام کی اکثریت مارشل لاء کے خلاف تھی۔ مصنف کا کہنا ہے چند سیاسی جماعتیں جن کو الیکشن میں صرف چار یا پانچ فی صد ووٹ ملتے ہیں، وہ ہمیشہ مارشل لاء کو بہت اچھا سمجھتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مارشل لاء کے ذریعے وہ بھی بآسانی حکومتی ایوانوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ چھوٹی سیاسی جماعتوں کے لیے مارشل لاء جیسا چور دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، جس کے ذریعے وہ جلد اقتدار کی کرسی حاصل کر کے حکومت کے مزے لے سکتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے خلاف جہاں عوامی ردِعمل واضح تھا، وہاں ادیب حضرات کی بھی ایک مزاحمتی تحریک دیکھنے میں آئی۔

آپ بیتی میں مصنف نے پاکستان میں مارشل لاء لگائے جانے کے اسباب و محرکات اور اس کی وجہ سے قوم کو اُٹھائے جانے والے ناقابل تلافی نقصانات کا بھرپور انداز میں اعادہ کیا ہے۔ خاص طور پر آپ بیتی میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی کھل کر مخالفت کی ہے بلکہ اسے زبردست انداز میں ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس دور میں اہل قلم پر لگائی جانے والی پابندیوں پر بھی بھرپور احتجاج کیا ہے۔ آپ بیتی میں جنرل ضیاء الحق اور بھٹو کی سیاست کا تقابل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بھٹو اور ضیاء الحق کا تقابل انہی اصولوں پر کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو نے کچھ اندرونی غلطیوں کے باوجود ملک کو کیا کچھ دیا اور ضیاء الحق نے مذہب کو ذاتی اقتدار کے لیے

استعمال کر کے کس طرح ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کیا اور وہ کچھ ہو گیا جس کی فصلیں آئندہ کئی نسلیں کاٹتی رہیں گی۔"(۱۸)

آپ بیتی میں مصنف نے ضیاء الحق کی سیاسی پالیسیوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ضیاء الحق اگر امریکیوں کی خواہش پر اردن میں فلسطینیوں کے خلاف آپریشن کا حصہ نہ بنتا تو شاید آج ایک مضبوط جمہوری فلسطینی ریاست قائم ہو چکی ہوتی۔ اب تک اسرائیلی ریاست پھیلنے کی بجائے سکڑ رہی ہوتی۔ مصنف کے نزدیک ضیاء الحق نے اپنے مفادات اور اقتدار کے دوام کے لیے اسلام کو استعمال کیا تھا کیونکہ اس کی نجی زندگی اس بات کی صداقت کا کھلا ثبوت پیش کرتی ہے۔ بھٹو کی ظاہری زندگی کے برعکس اگر اس کے نظریات اور تصورات کو پرکھا جائے تو ہمیں واضح انداز میں بآسانی یہ جاننے کو ملتا ہے کہ بھٹو مسلمانانِ عالم کو متحد کر کے ایک نئی قوت اور طاقت بنانا چاہتے تھے، لیکن ضیاء الحق نے امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کی خاطر ایک اسلامی نظریہ اور فکر رکھنے والی ہر دل عزیز سیاسی شخصیت کو اقتدار سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا۔

رشید امجد نے "تمنا بے تاب" میں سیاسی ایوانوں کی ایماء پر ادبی اداروں کو یرغمال بنانے کے طرزِ عمل کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ آپ بیتی میں انہوں نے مارشل لاء کے چلن کے اہم منفی نوعیت کے پہلوؤں کو اپنے احساسات اور جذبات کے ساتھ مکمل صداقت سے پیش کیا ہے۔ پاکستان کے سیاسی نظام میں پائے جانے والی خامیوں کا تذکرہ بڑے تفصیلی انداز میں کیا ہے۔ رشید امجد کا آپ بیتی میں خصوصاً ملکی سیاسی معاملات کو بیان کرتے ہوئے انداز تجزیاتی رہا ہے۔ رشید امجد کی اس آپ بیتی میں انہوں نے پاکستان کو درپیش مسائل کو بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان مسائل کے حل کی طرف ہماری مکمل رہنمائی بھی کی ہے۔ آپ بیتی میں انہوں نے جہاں قیامِ پاکستان کے پہلے کے سیاسی وسماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ قیام پاکستان کے بعد ملک کی سیاسی اور سماجی صورت حال کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔

آپ بیتی میں انہوں نے بحیثیت ایک ماہر تعلیم پاکستان کے تعلیمی نظام میں موجود نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے ان خامیوں کو دور کرنے کی تدابیر بھی بتائی ہیں۔ ان تدابیر پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنے نظام تعلیم کو بھی مؤثر بنا سکتے ہیں۔

''اپنا گریبان چاک'' از جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال

پاکستان کے مشہور قانون دان اور ادیب، حکیم الامت علامہ اقبال کے فرزند، جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال ۵/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد انگریزی اور فلسفہ میں ایم۔اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی اور بار ایٹ لا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور ۱۹۷۱ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہائیکورٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک دانشور کی حیثیت سے سرگرم رہے۔ آپ ۳/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی اہم اردو تصانیف میں ''مئے لالہ فام''، ''زندہ رُود''، ''افکارِ اقبال''، ''جہانِ جاوید''، ''خطبات اقبال'' اور ان کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں۔ جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' کے عنوان سے تحریر کی گئی ۳۰۱ صفحات پر مشتمل ۲۰ ابواب میں منقسم اس آپ بیتی کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۲ء میں پہلی دفعہ شائع کیا۔ ۲۰۰۲ء کے بعد سے اس آپ بیتی کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال آپ بیتی کے پیش لفظ میں اپنا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''میں عمر میں پاکستان سے بڑا ہوں۔ میرے والد علامہ محمد اقبال، ایک عظیم شاعر فلسفی اور تصورِ پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا کیونکہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔''(۱۹)

مصنف کا کہنا ہے کہ مفکر پاکستان کا فرزند ہونا ان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن زندگی میں جوانی کے بعد جب انھوں نے اپنی ذاتی محنت اور کاوش سے مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ اس مقام کو حاصل کر لینے کے بعد بھی جب انہیں باپ کے حوالے سے ہی پہچانا گیا تب انہیں اچھا نہیں لگا کیونکہ یہ بات ان کی ''انا'' کی نشوونما کے خلاف تھی۔ مصنف چاہتے تھے کہ ان کی اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت بھی ہونی چاہیے تھی۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے انہوں نے ایک بڑے درخت کے نیچے ایک چھوٹے پودے کی مثال بھی پیش کی ہے کیونکہ قد آور درخت کے نیچے اگنے والا پودا چاہے کتنا ہی پھل پھول جائے، وہ

ہمیشہ قد آور درخت کے ذریعے ہی پہچانا جاتا رہے گا۔

آپ بیتی میں مصنف نے سیاسی و سماجی صورت حال کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔تحریک پاکستان کے حوالے سے حالات و واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جیسے جیسے تحریک پاکستان مجموئی طور پر متحرک ہوتی گئی ویسے ویسے انگریز حکومت کی مخالفت بھی بڑھتے لگی۔ پنجاب میں بہت سے مسلم لیگی کارکنان کو گرفتار کر لیا گیا۔ان مسلم لیگی نوجوان کارکنان کی گرفتاری کی خبر پھیلتے ہی پورے ہندوستان میں ایک سیاسی جوش اور ولولے کی لہر اُٹھی۔مصنف آپ بیتی میں قراردادِ پاکستان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۰ء میں لاہور کے منٹو پارک میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو میری عمر تقریباً سولہ برس تھی اور میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔''(۴۰)

قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہندوستان میں بین المذاہب نفرت، انتشار اور فسادات کی آگ کو جان بوجھ کر سلگایا گیا۔اس آگ نے بہت جلد ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۱۹۴۶ء کے آخر میں ہونے والے فسادات کے بارے میں آپ بیتی میں مصنف نے لکھا ہے:

> ''۱۹۴۶ء کے اواخر ہی سے ہندو مسلم یا سکھ مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔لاہور میں ہر شام کرفیو لگتا اور قتل عموماً کرفیو لگنے سے چند منٹ قبل ہوتے۔''(۴۱)

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۴ء میں مصنف کا تحقیقی مقالہ مکمل ہوا اور آپ نے کیمبرج سے پاکستان کے لیے رخت سفر باندھا۔وطن واپس آ کر آپ نے جاوید منزل پر اپنی رہائش رکھی۔آپ کی بہن منیرہ اور ان کا خاندان بھی جاوید منزل پر قیام پذیر ہوا۔اسی دوران انہیں اس دور کے صدر پاکستان سکندر مرزا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔آپ بیتی میں مصنف نے سکندر مرزا کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''آخر میں وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا نے آئین ختم کر دیا۔اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں۔ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔''(۴۲)

پاکستان کے پہلے مارشل لاء کے بارے میں مصنف نے مکمل تفصیل سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے کہ کن وجوہات کی بنا پر حکومت کو ختم کر کے آمریت کا آغاز ہوا۔پہلی وجہ جو مصنف نے بیان کی ہے وہ ملکی سیاست میں سیاست دانوں کی آپس کی لڑائیاں تھیں۔ہر دور حکومت کی طرح اس وقت بھی بدعنوانی عروج پر تھی عوامی مفادات کے تحفظ کی بجائے حکمران اپنے ذاتی مفادات کی نہ ختم ہونے والی جنگ لڑ رہے ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف سماج پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے معاملات کے بارے میں مصنف اپنے مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔ انہی نظریات کی بنا پر وہ آپ بیتی میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کو ملنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع نہیں دیتا۔ پرانے دور کی بات کرتے ہیں کہ اس وقت لڑکیوں کو ان دیکھے لڑکوں کو شوہروں کے طور پر قبول کرتے ہوئے اپنی تمام زندگی ان کے ساتھ گزارنی پڑتی تھی۔ مصنف آپ بیتی میں مغربی اور مشرقی سماج کی صورت حال کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دراصل میں شادی کرنے سے ڈرتا تھا اور میرے خوف کی ایک وجہ یہ تھی کہ طبیعتوں میں یکجہتی نہ ہونے کے سبب کہیں طلاق تک معاملہ نہ جا پہنچے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں یورپی خواتین سے ملنے جلنے میں تو کوئی دقت محسوس نہ کرتا لیکن مجھے پاکستانی لڑکیوں سے گفتگو کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔''(۲۳)

قائداعظم کی وفات کے بعد مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح عملی طور پر سیاست سے کنارہ کش ہو چکی تھیں لیکن جنرل ایوب خان کے مقابلے میں کوئی معتبر سیاسی شخصیت کو الیکشن میں کھڑا کرنے کی تجویز بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے دی گئی۔ بالآخر محترمہ فاطمہ جناح کو جنرل ایوب کے خلاف الیکشن میں کھڑے ہونے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔

آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' میں مصنف کی تحریر کردہ ہر باب میں ان کی سوچ اور فکر کی داستان جدا جدا محسوس ہوتی ہے آپ بیتی کے ساتویں باب میں مصنف نے ایک اہم سیاسی واقعے کو بیان کیا ہے جس میں صدارتی انتخاب کے لیے ووٹ بنیادی جمہوریتوں کے منتخب نمائندوں نے ڈالنے تھے۔ اس وقت مادرِ ملت فاطمہ جناح کا صدارتی انتخاب کے لیے جنرل ایوب خان سے مقابلہ ہونا تھا۔ اس بارے میں مصنف رقم طراز ہیں:

> ''مادرِ ملت کونسل مسلم لیگ کی طرف سے اور جنرل ایوب خان کونشن لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ جنرل ایوب خان غالباً واحد پاکستانی صدر ہو گزرے ہیں جو اسلام کے بارے میں علماء کے روایتی تصورات کی بجائے دانشوروں کے جدید لبرل نظریات کے حامی تھے بلکہ انہیں قانونی طور پر پاکستان میں نافذ بھی کرنا چاہتے تھے لیکن جمہوریت اور سیاستدانوں کے متعلق ان کے خیالات کے سبب میرا دل ان سے اُٹھ گیا۔''(۲۴)

مصنف نے آپ بیتی میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں اپنے تاثرات کو تجزیاتی انداز میں بیان کیا

ہے کہ کس طرح بھارتی افواج بغیر اعلان یا الٹی میٹم کے پاکستان پر پوری فوجی قوت سے حملہ کر دیا تھا۔ یہ جنگ آزاد کشمیر کی مشرقی سرحدوں اور لاہور کی سرحد پر شدت سے دیکھنے میں آئی۔ جنگ کے دوران شہری علاقوں میں موجود لوگوں کو کن مصائب اور مشکلات سے گزرنا پڑا ان سب کا احوال قلم بند کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی تحریر میں ۱۹۶۵ء کی جنگ اور اس کے تناظر میں پیدا شدہ ملکی اور عالمی سیاسی صورت حال کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں صدر کینڈی کی بات مانتے ہوئے کشمیر پر حملہ نہ کر کے ایک اچھا موقع ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ تب امریکہ نے چین کا مقابلہ کرنے کی خاطر جو ہتھیار بھارت کو عطا کیے ان کی تفصیل بھی وعدہ کے باوجود پاکستان کو مہیا نہ کی گئی۔''(۲۵)

آپ بیتی میں مصنف پاکستان کی سیاسی صورت حال کو مختلف ادوار کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ قیام پاکستان سے ملک کے معاشی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی عوامل کو مصنف نے خاص جگہ دی ہے۔ پاکستان میں مختلف سربراہانِ مملکت اور حکومت کے بارے میں اپنے تاثرات کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔

جنرل ایوب خان نے جب بھٹو کو اپنی کابینہ سے باہر نکال دیا تو وہ سیاسی طور پر زیادہ فعال اور متحرک ہو گئے۔ اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایک دفعہ گول باغ میں دھواں دار تقریر کی۔ ان پر پتھراؤ کیا گیا اور ان کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس زمانے میں جنرل ایوب خان کے خلاف بھی ملک گیر احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے اقتدار کو بہت سے خطرات لاحق ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس دوران بھٹو نے اقتدار کے لیے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہ نعرہ بہت کارگر ثابت ہوا۔

مصنف نے آپ بیتی میں بہت سے حقائق سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کہ کس طرح پاکستانی تاریخ میں مختلف سیاستدانوں نے اقتدار کے حصول کے لیے نئے نئے نعرے دیے اور اپنی قوم کو بے وقوف بنا کر اقتدار حاصل کر کے عوام کی خبر گیری کا نام تک نہ لیا۔ یہاں مصنف نے ذوالفقار علی بھٹو کے اسلامی سوشلزم کے نعرے کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔

جنرل ایوب خان نے اس دور میں حالات کی سنگینی دیکھ کر اپنے ہی بنائے ہوئے آئین پاکستان سے انحراف کرتے ہوئے اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کو تفویض کرنے کی بجائے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ جنرل یحییٰ خان نے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء کے آئین کو معطل کر کے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا:

> ''یہ انتخابات بھی اپنی نوعیت کے تھے۔ مغربی پاکستان میں مضبوط پارٹی صرف بھٹو کی پیپلز پارٹی تھی جس نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کر کے ایک طرح کی آندھی چلا دی تھی، اس پارٹی کا مشرقی پاکستان میں کوئی زور نہ تھا۔''(۲۶)

مصنف آپ بیتی میں پاکستان کے سیاسی حالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دور میں یحییٰ خان چاہتے تھے کہ تمام مسلم لیگوں کا اتحاد ہو جائے لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ عام انتخابات میں مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو نے اکثریت حاصل کی جبکہ مشرقی پاکستان سے مجیب الرحمٰن نے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ اس دور میں پاکستان بہت ہی نازک وقت سے گزر رہا تھا۔ اس دور کے خراب حالات کا تذکرہ آپ بیتی میں مصنف نے اس انداز میں کیا ہے:

> ''لیکن پاکستان اور خصوصی طور پر مشرقی پاکستان کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ مجیب الرحمٰن سے مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کی گفت و شنید ناکام ہونے کے بعد وہاں ملٹری ایکشن کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔''(۲۷)

جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال اپنی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک'' میں پاکستان کی سیاسی وسماجی تاریخ کو بڑے مدلل انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ کس طرح ذوالفقار علی بھٹو عام انتخابات میں شکست کھا کر بھی شکست کو تسلیم نہیں کرتے اور مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان آنا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان عوامل کے نتیجہ میں پاکستان کا دولخت ہونا ناگزیر تھا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ بھٹو نے پاکستان کی تعمیر وترقی میں مؤثر انداز میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ ان کی ملک وقوم کے لیے خدمات کو ہم بھلا نہیں سکتے۔ انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کشمیر کے مسئلے کو خاص اہمیت دی اور پاکستانی فوجیوں کو جنہیں بھارت نے جنگی قیدیوں کے طور پر مشرقی پاکستان میں رکھا ہوا تھا انہیں آزاد کروایا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کو بعد میں گرانے کی کوششوں کا آغاز اپوزیشن کی جماعتوں کی طرف سے کیا گیا۔ بھٹو کی مخالف سیاسی جماعتوں نے بہت سے مذہبی مطالبات حکومت کے سامنے رکھے۔ بھٹو نے وہ تمام مذہبی مطالبات کو تسلیم کر لیا تھا۔ مصنف آپ بیتی میں بھٹو کے قابل قدر اقدامات کا تذکرہ کرتے ہوئے ملک میں بار بار مارشل لاء کی وجہ بھی تلاش کرنا چاہتے ہیں:

> ''میرے لیے یہ بات سمجھ سکنا قدرے مشکل ہے کہ جب پاکستان میں فوج مداخلت کرتی ہے تو کیا وہ اپوزیشن کے سیاستدانوں کی ایما پر کرتی ہے یا کسی بیرونی طاقت کی شہ پر؟''(۲۸)

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے تحریر کرتے ہوئے مصنف کا خیال ہے کہ بحیثیت مجموعی بھٹو کی اپنے وطن کے لیے خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا کیونکہ انہوں نے پہلی دفعہ بھرپور انداز میں کشمیر کے مسئلہ کو اُٹھایا اور ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے پاکستان آج ایک نیوکلیئر پاور بن گیا ہے۔

بھٹو کے بعد بالآخر جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۳ء کے آئین کو معلق کر دیا۔ اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں۔ بھٹو کی نافذ کردہ اسلامی اصلاحات میں مزید بہتری لائی گئی جس میں توہین رسالت کا قانون بنایا گیا۔ شریعت کورٹ قائم ہوئے اور حدود

آرڈیننس نافذ کیا گیا۔ پھر محمد خان جونیجو کی حکومت کا دور شروع ہوا اور جسے بعد میں جنرل ضیاء الحق نے بطور صدر پہلی مرتبہ اپنا اختیار دستور کے آرٹیکل ۵۸ (۲) (ب) کو استعمال کرتے ہوئے محمد خان جونیجو کی منتخب حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اسمبلیوں کو تحلیل کر دیا گیا۔ آپ بیتی میں مصنف نے جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت کا بحیثیت ایک جج تجزیہ پیش کیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''ضیاء دور استبداد میں عدلیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اب تک تو اس کے زوال اقتدار کا مسئلہ پاکستان کا داخلی مسئلہ تھا مگر اس عہد میں بین الاقوامی معاشرے میں بھی اس کی آزادی ضمیر پر نکتہ چینی کی گئی اور عام تاثر جو مہذب دنیا میں پھیلا وہ یہی تھا کہ یہاں کی عدلیہ انتظامیہ کی گود میں بیٹھ کر فیصلے صادر کرتی ہے۔''(۲۹)

مصنف جنرل ضیاء الحق دور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے عدلیہ کو خصوصی طور پر زیرِ عتاب رکھا اور جج صاحبان کو اپنے من پسند فیصلے صادر کروانے پر کس کس طرح مجبور کیا جاتا رہا۔ مہذب اقوام میں یہی تاثر پھیلا کہ انتظامیہ عدلیہ سے اپنی مرضی کے فیصلے کرواتی ہے۔

آپ بیتی میں مصنف نواز شریف، شہباز شریف اور ان کے والد میاں محمد شریف کے بارے میں کہتے ہیں کہ نواز اور شہباز سے ان کی کوئی براہِ راست ملاقات نہیں تھی لیکن ان کے والد میاں محمد شریف نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ان کی بہت امداد کی تھی۔ اس وجہ سے مصنف ان کی عزت کرتے تھے۔ میاں نواز شریف کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''میں نہیں جانتا کہ میاں نواز شریف سیاست میں کس طرح آئے، انہوں نے مسلم لیگ سے کب وابستگی پیدا کی یا ان کے تعلقات جنرل ضیاء الحق سے کیونکر استوار ہوئے، البتہ وہ پاکستان کا وزیراعظم بننے سے پیشتر پنجاب کے وزیر خزانہ اور بعد میں وزیراعلیٰ رہ چکے تھے۔''(۳۰)

جسٹس جاوید اقبال ''اپنا گریبان چاک'' آپ بیتی میں ایک اور مقام پر نواز شریف کی ۱۹۹۷ء کی حکومت اور پیپلز پارٹی کی شکست کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۹۷ء کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اسی سال الیکشن میں میاں نواز شریف کی مسلم لیگ نے پاکستان بھر میں بھاری مینڈیٹ کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور پیپلز پارٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔''(۳۱)

مصنف نے آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی صورت حال کو مثالوں اور ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے جو کہ ان کی حقیقت پسندی اور دوراندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فاروق لغاری کے دورِ صدارت میں وزیراعظم نواز شریف نے آئین کی

دفعہ ۵۸(۲)(ب) میں ترمیم کو ایوان سے اتفاق رائے سے منظور کروایا۔ آپ بیتی میں مصنف نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> ''وزیراعظم نواز شریف نے پاکستان میں ''طاقت کی تکون'' کو قابو کرنے کی خاطر سب سے پہلا قدم دستور میں اس ترمیم کے ذریعے اُٹھایا جس کے آرٹیکل ۵۸(۲)(ب) کو ختم کر دیا گیا۔''(۳۲)

جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال پاکستان میں بار بار مارشل لاء اور بھارت میں مارشل لاء نہ لگائے جانے کی ایک ٹھوس وجہ بیان کر رہے ہیں۔ مصنف کے سیاسی تجزیات بے مثال ہیں اور یہ تجزیات ان کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ بیتی میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت میں ایک بحران اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ان کے خلاف چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے کسی کیس میں وزیراعظم میاں نواز شریف کو عدالت میں طلب کیا اور وہ سپریم کورٹ میں پیش نہیں ہوئے تھے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ سجاد علی شاہ نے وزیراعظم میاں نواز شریف کو ذاتی طور پر عدالت میں پیش نہ ہونے پر ان کے خلاف توہین عدالت کا کیس بنا کر کارروائی شروع کر دی تھی اور وزیراعظم کو جیل کی سزا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز نہ رہ سکیں۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ کے طرزِ عمل کے خلاف وزیراعظم نواز شریف نے بہت سخت ردِعمل پیش کیا اور سپریم کورٹ پر حملہ کروا دیا۔

وزیراعظم میاں نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت میں صدر فاروق احمد لغاری کے خلاف امپیچمنٹ کی حکمت عملی اپنانے کا ارادہ کیا گیا کیونکہ اس وقت مسلم لیگی ارکان کی تعداد اتنی تھی کہ یہ حکمت عملی کامیاب ہو سکتی تھی اور اس کے ساتھ پیپلز پارٹی کے اراکین بھی شاید حکومتی پارٹی کا ساتھ دیتے کیونکہ صدر فاروق احمد لغاری نے سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو آئین کی دفعہ ۵۸(۲)(ب) کا استعمال کرتے ہوئے عہدے سے فارغ کر دیا تھا۔ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کے دوسرے دور کے اہم سیاسی حالات کو جسٹس جاوید اقبال نے آپ بیتی میں یوں لکھا ہے:

> ''وزیراعظم نواز شریف کی قسمت کے ستارے ان کے حق میں گردش کر رہے تھے۔ صدر پاکستان خود ہی استعفیٰ دے کر چلے گئے اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ان کے رفقائے کار نے بالآخر سپریم کورٹ سے نکال باہر کیا۔''(۳۳)

صدر فاروق احمد لغاری کے استعفیٰ دینے کے بعد وزیراعظم میاں محمد نواز شریف پاکستان کی صدارت کے لیے کسی انتہائی قابل اعتبار شخصیت کی تلاش میں تھے جو انہیں مستقبل میں کسی مصیبت میں نہ ڈالے۔ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کو اس وقت یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر انہوں نے پاکستان کی صدارت کی کرسی کے لیے جلد بازی میں کسی غیر موزوں شخصیت کا انتخاب کر

لیا تو کہیں ان کی وزارتِ عظمٰی کے لیے آنے والے وقت میں کسی قسم کی مشکلات میں اضافہ نہ ہو سکے۔ یہی وجہ تھی کہ نواز شریف نے صدر کے لیے جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ کو چن لیا۔ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کے دورِ حکومت میں اہم واقعہ ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے تھا۔ اس بارے میں مصنف نے اپنے تاثرات کو درج ذیل انداز میں لکھا ہے:

> ''اسی طرح ایٹمی دھماکہ کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں بھی وزیر اعظم نواز شریف پر مختلف اطراف سے شدید ''پریشر'' تھا۔ وزیر اعظم واجپائی نے بھارت میں دھماکہ کر کے پاکستان کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔''(۳۴)

وزیر اعظم نواز شریف اپنی وزارت عظمٰی کے دوسرے دور میں طالبان طرز کا اسلام پاکستان میں بھی رائج کرنا چاہتے تھے ان کے خیال کے مطابق شاید طالبان طرز کے اسلام سے پاکستان کے بہت سے سیاسی و سماجی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کے اس قسم کے تصورات پر جسٹس (ر) جاوید اقبال نے آپ بیتی میں اپنا تجزیہ جس انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۹۸ء میں پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت اپنے پورے جوبن پر تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر کے خلاف بدعنوانی کے مقدمات دائر تھے۔ اپنی حکومت کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو نے میاں نواز شریف، ان کے والد میاں محمد شریف اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں، ان کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔ ''پریذیڈنسی'' اور ''عدلیہ'' تابع کیے جا چکے تھے۔ افغانستان کے ''وارلارڈز'' میں خانہ جنگی کو ختم کرانے کے لیے وزیر اعظم نواز شریف نے بڑی کوششیں کیں۔''(۳۵)

مصنف آپ بیتی میں ملکی نوعیت کے سیاسی و سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ درج بالا اقتباس میں انہوں نے افغانستان کی سیاسی صورت حال کا بہترین انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ آپ بیتی میں جسٹس (ر) جاوید اقبال نے پاکستان کے سیاسی حالات کو بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اپنے دوسرے دورِ حکومت میں شریعت بل کو پارلیمنٹ سے منظور کروا کر بھاری مینڈیٹ کی بنیاد پر اختیارات اسلام یعنی شریعت کے بل کے ذریعے امیر المومنین بننا چاہتے تھے۔ اس شریعت بل کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''عملی قدم کے طور پر میاں صاحب نے ایک ایسے شریعت بل کو پارلیمنٹ میں منظور کرانا چاہا جو دستور سے بھی ''سوپرا'' یا ماورا قوت کا حامل تھا۔''(۳۶)

نواز شریف کے امیر المومنین کے خواب کی حقیقت کو واضح کرنے کے بعد، کارگل کی جنگ کے بارے میں مصنف مخمصے

کا ابھی تک شکار نظر آتے ہیں۔ ان کو اس حقیقت کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ کیا یہ جنگ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کے کہنے پر شروع کی گئی تھی یا کشمیری مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کی حمایت میں ہماری افواج نے اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔ کارگل جنگ، پاک بھارت تعلقات میں سخت کشیدگی اور نیوکلیئر جنگ کے خدشات کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں ''کارگل آپریشن'' سے متعلق ہمیں بریفنگ بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) قریشی نے دی۔ انہوں نے نقشوں کی مدد سے ہمیں آگاہ کیا کہ کس طرح بھارتی فوج ''لائن آف کنٹرول'' پر اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی خاطر وقتاً فوقتاً اہم پہاڑی چوٹیوں پر اپنا قبضہ جماتی رہی ہے اور ہم خاموش بیٹھے دیکھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے سیاچن جیسی مثالیں بھی دیں۔'' (۳۷)

آپ بیتی میں ۱۲/۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کا احوال بھی مصنف نے قلم بند کیا ہے کہ کس طرح انہیں ملک پر فوج کے قابض ہونے کا پتہ چلا۔ مصنف ان دنوں لاہور میں موجود تھے اور لاہور میں وزیراعظم نواز شریف کے گرفتار ہونے کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ رات کو تین چار بجے جب جنرل پرویز مشرف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا تو سب کو پتہ چلا کہ ملک پر فوج قابض ہو چکی ہے۔ آئین پاکستان کو معطل کر دیا گیا۔ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف، میاں شہباز شریف اور اہم وفاقی وزراء کو گرفتار کر لیا گیا۔

مصنف نے اس وقت جب وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کی حکومت کو ختم کر دیا گیا اور پرویز مشرف کی حکومت کا آغاز ہوا، ان تمام معاملات کو اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ دراصل مصنف کے خیال کے مطابق جب جنرل جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دے دیا تو اس وقت سے ہی فوج چوکنا ہو گئی تھی اور وہ میاں نواز شریف کے احکامات کو سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی کیونکہ صدر اور عدلیہ کو میاں نواز شریف رام کر چکے تھے اب صرف فوج پر قابو پانا باقی تھا۔ اس بارے میں مصنف رقم طراز ہیں:

> ''جب تک ستارے میاں صاحب کے حق میں گردش کرتے رہے ''پریذیڈنسی'' کا مسئلہ ان کی منشاء کے مطابق طے ہو گیا اور اسی طرح ''عدلیہ'' کے سرکش چیف جسٹس بھی فارغ کر دیئے گئے۔ اب صرف ''فوج'' پر حاوی ہونا باقی رہ گیا تھا اور شاید اسی ضمن میں مغل شہنشاہوں کی پیروی کرتے ہوئے وہ ''انوکھا'' اور ''نادر'' قدم اُٹھایا گیا جو صحیح مقام پر پڑنے کی بجائے غلط مقام پر پڑ گیا اور اس بھڑ کے چھتے کو بلا وجہ چھیڑ

کر میاں صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔''(۳۸)

آپ بیتی میں مصنف نے تمام حالات و واقعات کو بڑی صداقت اور غیر جانبداری سے بیان کیا ہے کہ کس طرح نواز شریف کو اقتدار سے فارغ کیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف چیف ایگزیکٹو بن گئے اور مسلم لیگ زیر عتاب رہی۔ سپریم کورٹ نے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو تین سال تک حکومت کرنے کے حق کو تسلیم اس شرط پر کیا کہ وہ شفاف الیکشن کروائیں گے۔ اس کے ساتھ عدالت عالیہ نے پرویز مشرف کو آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے دیا تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے کچھ عرصہ بعد میاں نواز شریف کے انتخاب کردہ صدر جسٹس (ر) رفیق تارڑ کو نکال دیا اور خود پاکستان کے صدر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا اور اپنی منتخب کردہ کابینہ کے ذریعہ حکومت کرنے لگے۔ جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے خدوخال کے بارے میں جسٹس (ر) جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

> ''جنرل پرویز مشرف نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی بین الاقوامی کمیونٹی کے سامنے پاکستان کا ''لبرل'' یا میانہ رو امیج پیش کرنے کی کوشش کی۔ کبھی تو انہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیا، کبھی بغلوں میں کتے والی تصویریں کھنچوا کر میڈیا میں تقسیم کیں۔''(۳۹)

آپ بیتی میں مصنف ''یانا ناری پبلک'' کے عنوان سے باب میں بیان کرتے ہیں کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری سے استعفیٰ طلب کیا۔ استعفیٰ کے محرکات کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ چیف جسٹس نے پرویز مشرف کی انتظامیہ کی مالی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی رہائی کے احکامات جاری کرنا، جنھیں امریکہ کے کہنے پر دہشت گرد قرار دیتے ہوئے پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے غائب کر دیا تھا۔ یہ ایسے عوامل تھے جن کی وجہ سے جنرل پرویز مشرف کو چیف جسٹس سپریم کورٹ افتخار محمد چودھری ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مصنف نے اس قضیے کے بارے میں لکھا ہے:

> ''۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو جنرل پرویز مشرف اور ان کے سٹاف نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو آرمی ہاؤس بلوا کر استعفیٰ دینے کے لیے کہا۔''(۴۰)

آپ بیتی کے آخری باب میں جس کا عنوان مصنف نے ''اے روح اقبال!'' تحریر کیا ہے اس میں وہ علامہ اقبال کی روح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ پاکستان کو تو آپ نے ایک جدید اسلامی ریاست اور قائداعظم کی طرح اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا خواب دیکھا تھا لیکن مصنف افسوس کے ساتھ اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ ہم نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے خوابوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ ہمیں ہماری منزل کا ہی پتہ نہیں

چل رہا۔ مصنف اس باب میں پاکستان کے موجودہ بنیادی مسائل کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''پاکستان کو اب کئی مشکلات کا سامنا ہے۔ لوگ بے روزگاری اور مہنگائی کے باعث خودکشیاں کر رہے ہیں۔ مائیں بچے بیچ رہی ہیں۔ نہ بجلی ہے، نہ پانی، نہ آٹا، بدامنی اور افراتفری پھیلتی جا رہی ہے۔''(۴۱)

آپ بیتی کے تمام ابواب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر باب میں مصنف نے عنوان کے مطابق سیر حاصل تفصیلات کو بے باک انداز میں سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چاہے وہ ملکی سیاسی صورت حال ہو یا بین الاقوامی سیاست انہوں نے اپنے بے لاگ تاثرات کو برملا تحریر کیا ہے۔ قومی اور انٹرنیشنل سیاسی معاملات کو مصنف نے انتہائی باریک بینی سے پیش کیا ہے اسی طرح انہوں نے ملک کے سماجی عوامل کو بھی بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

''بلا کم و کاست'' از مہدی علی صدیقی

مہدی علی صدیقی ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ کی داستانِ حیات ''بلا کم و کاست'' ۲۰۰۲ء میں کراچی سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنف آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ ڈائری کبھی تحریر نہیں کی بلکہ وہ جو کچھ بھی اپنی سرگزشت میں تحریر کر چکے ہیں وہ انہوں نے اپنی ذاتی یادداشت کے بل بوتے پر کیا ہے۔ مصنف آپ بیتی کے آغاز میں اپنے خاندان کے پس منظر کے بارے میں اور اپنے بچپن کے حالات و واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ کے والد بہت مہمان نواز انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں اکثر مہمان قیام کرتے تھے اور کئی عہدے دار جو کہ قلیل مدت کے لیے حکومت وقت کی طرف سے اورنگ آباد تعینات کیے جاتے تھے، مصنف کے مکان میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ مصنف نے آپ بیتی میں سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات کے خاکوں کو بھی بطور خاص شامل کیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی تحریکِ آزادیِ وطن کے حوالے سے سیاسی خدمات کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

''مولانا حسرت موہانی، ان قومی لیڈروں میں تھے جن کے اصابت کردار سے خود حکومت ہند متاثر تھی۔ احکام سرکار کی خلاف ورزی، قوم اور ملک کی آزادی کی بے پناہ تڑپ، تقاریر کی بے باکی، شخصی خطرات کی طرف سے بے پرواہی، لباس اور رکھ رکھاؤ سے بے نیازی ان کی درویشانہ زندگی کی عکاس تھی۔''(۴۲)

مصنف نے اپنی سرگزشت میں مسلم سیاسی رہنماؤں کی تحریکِ آزادیِ وطن کے بارے میں عملی مساعی کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی و سماجی شخصیت کے متعلق اہم حقائق بھی قلم بند کیا ہیں۔ آپ بیتی میں قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے اہم سیاسی

معاملات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد پیدا شدہ مسائل اور مختلف ادوار میں حکمرانوں کے طرزِ عمل کو بھی لبطور خاص اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ مصنف نے جنرل ایوب خان کے عروج و زوال کی داستان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی حکمت عملیوں اور ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں اہم انکشافات کو تحریر کیا ہے۔ مصنف کے خیال میں چند سیاسی معاملات میں بلاشبہ بھٹو کا کردار تعریف کے قابل رہا تھا۔ ان کی خوداعتمادی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ ان کی خوداعتمادی غرور کی حد کو چھونے لگتی تھی اور وہ اپنے آپ کو قوانین سے بالا خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بااعتماد ساتھی بھی ذوالفقار علی بھٹو کی دیکھا دیکھی خود کو قوانین سے بالاتر سمجھتے تھے جس کی بدولت بعض اوقات نئے مسائل جنم لینے لگتے تھے۔

آپ بیتی میں مصنف ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کے خاتمے اور جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت کے آغاز، بھٹو کی پھانسی، افغانستان پر روسی افواج کے باقاعدہ حملوں کے بعد کی صورت حال، پاکستان افغان پالیسی کے خدوخال، روس کے خلاف امریکہ کی پیش قدمی، پاکستان کی خارجہ پالیسی کے عوامل اور حکومتِ پاکستان کے اہم اقدامات کو بھی اپنی داستانِ حیات میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصنف اپنی سرگزشت میں ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر مدلل انداز میں اپنے تجزیات کرتے ہیں۔ مصنف نے بالآخر پاکستان کے دگرگوں حالات سے دلبرداشتہ ہو کر امریکہ کے شہر نیویارک کے لیے رختِ سفر باندھا اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ امریکہ میں قیام کے دوران انہیں مغربی تہذیب و تمدن کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انہوں نے سماجی لحاظ سے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ یہاں پر جنسی لذت کا بازار تو گرم رہتا ہے مگر یہاں لوگ رفاہِ عامہ کے لیے بھی ہر دم تیار رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ معاشرہ عذاب الٰہی سے ابھی تک بچا ہوا ہے اور غریب، بے گھر اور لاوارث لوگوں کی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ امریکہ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں رفاہی ادارے قائم ہیں جو کہ خستہ حال لوگوں کی امداد اور دستگیری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ محتاجوں کے لیے بہت سستی اشیائے خورد و نوش بہم پہنچائی جاتی ہیں اور حکومتی امداد کے ساتھ ساتھ امراء کی خیرات سے بہت سے ادارے چلائے جا رہے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ امریکہ کی ترقی تعلیم و تربیت کے مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے بہتر استعمال سے حیران کن سہولیات کا حصول بہت آسان بنا لیا ہے۔ امریکہ میں ہر طرف عدل و انصاف کا چلن ہے، دراصل یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں میرٹ اور انصاف کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے وہ معاشرے ضرور ترقی کرتے ہیں۔ مہدی علی صدیقی کی داستانِ حیات ''بلاکم و کاست'' بیسویں صدی کی ایک مکمل تاریخ ہے، جس میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کو مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ آپ بیتی اُردو ادب کی آپ بیتیوں میں اپنی مثال آپ ہے۔

''نشانِ جگر سوختہ'' از ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر ۱۱ مارچ، ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک فیض الاسلام ہائی سکول راولپنڈی سے ۱۹۵۱ء میں کیا۔ ایف۔اے اور بی۔اے گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی سے اور ڈپلومہ ان لائبریری سائنس، ایم۔اے (اردو)، پی ایچ۔ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی رسالوں کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ اُردو ادب میں آپ بطور استاد اور افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں آپ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ۱۰ مارچ ۱۹۹۴ء کو ریٹائر ہو گئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی ساٹھ سے زائد مختلف موضوعات پر کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریر کردہ آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' ۲۰۰۵ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنے بچپن کے حالات کو آغاز میں تحریر کیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اردو میں معروف آپ بیتیاں کون کون سی ہیں۔ جن معروف آپ بیتیوں کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے ان میں قرۃ العین کی ''کارِ جہاں دراز ہے''، قدرت اللہ شہاب کی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' میرزا ادیب کی تحریر ''مٹی کا دیا''، احسان دانش نامور شاعر و ادیب کی آپ بیتی ''جہانِ دانش''، ادا جعفری مشہور شاعرہ کی تصنیف ''جو رہی سو بے خبری رہی''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا''، انیس ناگی کی ''ادھوری سرگزشت''، شاعر جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ''یادوں کی برات''، جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند علامہ اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریبان چاک''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، جاوید شاہین کی تصنیف ''میرے ماہ و سال''، ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، حمیدہ اختر کی تحریر ''ہم سفر''، حمایت علی شاعر کی منظوم ''آئینہ در آئینہ'' اور مشتاق احمد یوسفی کی آپ بیتی ''زرگزشت'' اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے آپ بیتی کے دوسرے باب میں جس کا عنوان ''نقش و نگار طاقِ نسیاں'' رکھا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے بچپن کے دور میں ''پونا'' شہر کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مجھے آج کے پونے کا علم نہیں، لیکن چوتھی دہائی کا Exotic پونے عجیب مافوق الفطرت فضا کا حامل تھا۔ جادو، ٹونا عام تھا۔''(۴۴)

مصنف کے بچپن کے دور میں پونا شہر غربت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ توہم پرستی کا دور دورہ تھا۔ سماجی لحاظ سے یہ شہر ہندوستانی اقوام کے لیے بہتر تھا، لیکن جن بھوت اور قدامت پرستی عام تھی۔ بعض لوگ عقیدت کے چکر میں شرک کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔

ہندوستان کے لوگوں کی توہم پرستی کے تذکرہ کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں قیامِ پاکستان سے پہلے کی سیاسی صورت حال کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف آپ بیتی کے تیسرے باب بعنوان ''جی سے بھلایا نہ جائے گا۔'' میں تحریک پاکستان کے حوالے سے اپنی عملی سیاست کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے خود سیاست میں حصہ لیا تھا۔ تحریک آزادیِ وطن کے بارے میں مصنف رقم طراز ہیں:

''۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کے خضر حیات کی حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تو پنجاب کے تمام شہروں میں حکومت کے خلاف جلسے جلوسوں کا آغاز ہو گیا۔ اب پاکستان کی منزل قریب نظر آ رہی تھی لہٰذا عوام کا جوش دیدنی تھا۔''(۴۴)

مصنف زمانہ طالب علمی میں عملی سیاست کے بارے میں تحریر کرتے ہیں وہ ایک دن سکول سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ''خضر حیات مردہ باد''، ''قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد'' اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے فلک شگاف نعرے ہر طرف بلند ہونے لگے۔ وہ بھی جلوس میں شامل ہو کر ''خضر حیات مردہ باد'' کے نعرے لگانے لگے تھے۔ یہ جانے بغیر کے وہ صاحب کون ہیں اور ان کے خلاف نعرے کیوں لگائے جا رہے ہیں۔ جلوس کو پولیس نے چاروں اطراف سے جب گھیرا تو مظاہرین نے بھی جوابی اقدام کیا۔ پھر کچھ دیر بعد لاٹھی چارج شروع ہو گیا پولیس لاٹھیاں برسانے لگی اور مظاہرین پتھر مارنے لگے۔

قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو موثر انداز میں بیان کرنے کے بعد آپ بیتی میں قیام پاکستان کے بعد مصنف نے اہم واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ ان واقعات میں بھارت سے پاکستان کی طرف ہجرت کے دوران قتل و غارت گری کا جو بازار گرم کیا گیا، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان خواتین کی آبروریزی کی گئی، بچوں کو تلواروں پر لٹکایا گیا، بوڑھے والدین کے سامنے ان کی جوان اولاد کے گلے کاٹے گئے۔ غرض مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، پاکستان کی تاریخ آج بھی اس ظلم و ستم کی گواہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر آپ بیتی میں ان واقعات کا چشم دید تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو منڈی میں جلسہ ہوا۔ ترنگا لہرایا گیا اور فضا ''جے ہند'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ تمام پنجاب فسادات کی خونیں گرفت میں تھا، اردگرد کے علاقوں کے لٹے پٹے، تباہ حال، زخمی انبالہ میں جمع ہو رہے تھے۔''(۴۵)

قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی سماجی صورت حال کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر آپ بیتی کے باب چہارم بعنوان ''جب آتش جواں تھا'' کے پہلے ذیلی باب بعنوان ''انجام کا آغاز'' میں ہجرت کے دکھوں کے ساتھ لٹے ہوئے مسلمان مہاجرین کی بے سروسامانی، محکمہ بحالیات میں رشوت کا چلن اور طالع آزما سیاستدانوں کا طرزِ عمل واضح انداز میں دکھانے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ اس بارے میں مصنف رقم طراز ہیں:

> ''آج کا لاہوری کسی طرح سے بھی ان ایام کا اندازہ نہیں لگا سکتا جب اجڑے لاہور میں لٹے پٹے بے خانماں مہاجرین کی آمد ہوئی۔''(۴۶)

آپ بیتی میں مصنف نے ساتویں باب بعنوان ''کٹی پتنگ'' کے ذیلی عنوان ''شکست خواب'' میں جنرل ایوب خان کی آمریت کے دور کے اہم خدوخال کو بیان کیا گیا ہے۔ صدر جنرل ایوب خان نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں کیں تاکہ عوام کے مسائل کم سے کم ہوں اور عام آدمی کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ مصنف آپ بیتی میں صدر جنرل ایوب خان کے اہم اقدامات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ان حالات میں اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان برسرِ اقتدار آیا تو قوم نے نجات دہندہ سمجھتے ہوئے جی جان سے اس کا استقبال کیا کہ اب نہرو کو جواب دینے والا آ گیا ہے۔ لوگوں کو مناسب داموں پر چیزیں ملنے لگیں۔ اشیاء میں ملاوٹ ختم ہو گئی۔''(۴۷)

جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کے آغاز کے عوامل کو لکھنے کے بعد نویں باب ''قریۂ گرد و گرما'' کے عنوان سے مصنف اپنے طریقہ تدریس کے بارے میں روشنی ڈالتے ہیں۔ مصنف اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بحیثیت معلم تحریر کرتے ہیں کہ ایک بہترین معلم کو کیسا ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''تدریس کے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ طلبہ استاد سے تو سیکھتے ہی ہیں، استاد بھی بالواسطہ طور پر، طلبہ سے سیکھتا ہے یا سیکھ سکتا ہے۔''(۴۸)

آپ بیتی کے دسویں باب بعنوان ''To sir with love'' کے ذیلی عنوان ''یونانی المیہ'' میں مصنف نے پاکستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ انتہائی اختصار سے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر ۲۰۰۰ء تک کے سیاسی منظر نامہ کو ایسے ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح مصنف نے ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر پاکستانی سیاسی صورت حال کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''باپ کی پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو جن اعصاب شکن حالات سے دوچار رہی (کہ جان جانے کا خطرہ سر پر لٹکتی تلوار کی مانند) تو اس آگ میں سے اسے سونا بن کر نکلنا چاہیے تھا لیکن وہ بھی محض وزیراعظم ہی نکلی، صرف شعلہ بیانی، آگ اگلتی منی ڈریگن۔''(۴۹)

ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستان کی سیاست کے بارے میں اپنے تاثرات کا برملا اظہار کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف

پاکستان کی سیاسی صورت حال سے متنفر نظر آتے ہیں۔ گو کہ مصنف نظریاتی طور پر جمہوریت کے دل دادہ ہیں مگر وہ اپنے آپ کو کسی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لیے تیار نہیں کر سکے۔ پاکستان کی سیاست میں وہ سیاستدانوں اور آمروں کے کردار کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''مسلم لیگ کی نااہل حکومتوں نے کرپشن، کنبہ پروری، اقرباء نوازی، بیروزگاری، غربت، عدم عدل کی صورت میں قیام پاکستان کے بعد جو کانٹے بوئے تھے آج تک ان کی فصل اپنی بہار دکھا رہی ہے۔''(۵۰)

مسلم لیگ کی نااہل طرز حکمرانی کو ہدف تنقید بنانے کے بعد مصنف آپ بیتی میں ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے سے پیدا ہونے والی صورت حال کو مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں سقوط ڈھاکہ ایک بہت بدنما داغ ہے جس کو کسی طرح دھویا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان دولخت ہوا تو اس صدمے سے تمام قوم دوچار ہوئی۔ مقام افسوس یہ ہے کہ ہم نے بحیثیت ایک پاکستانی قوم اس صدمے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ آج ہمیں پاکستانی ہونے کی بجائے شاید پنجابی، پشتون، سندھی، بلوچی، سرائیکی، کشمیری اور براہوی ہونے پر زیادہ فخر ہے۔ آج کے معاشرے میں بھی ہم فرقہ وارانہ اور لسانی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر رہے ہیں جو کہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''سقوط ڈھاکہ پر بہت لکھا گیا، ہمارے ہاں بھی اور غیر ممالک میں بھی۔ سیاسی صورتحال کے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت نہیں کہ ہم پاک تاریخ کو کتابوں میں نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ہم تو خود تاریخ ہیں اس لیے ہمیں اپنا تجزیہ و تحلیل کرنی چاہیے۔''(۵۱)

پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت کا تفصیلی جائزہ لینے اور سقوط ڈھاکہ کے بعد ملک کی سیاسی صورت حال کو مصنف نے ذوالفقار علی بھٹو اور صدر جنرل ضیاء الحق کے ادوار کے حوالے سے بھی قابل تجزیہ سمجھا ہے۔ آپ بیتی میں ایک ذیلی عنوان ''طوائف اور تماشبین'' کے تحت مصنف رقم طراز ہیں:

> ''غالباً ذوالفقار علی بھٹو جیسا ذہین، معاملہ فہم اور زیرک سیاستدان ہماری ساری سیاسی تاریخ میں نہ ملے گا لیکن اسے اس کی شخصیت کے متضاد رجحانات لے ڈوبے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنی بھاری قیمت اس نے ادا کی وہ بھی ہماری تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے۔''(۵۲)

بھٹو کی سیاست پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کے بعد ''آشوبِ ذات'' کے عنوان سے مصنف نے آخری باب میں سعودی عرب میں عمرہ کی ادائیگی کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب میں پاکستانیوں کی حالت زار، اہل عرب کی سماجی صورت حال کا جائزہ پاکستانیوں کی سعودی عرب میں سماجی حالت، غیر ملکیوں کے بارے میں عربوں کا رویہ، مذہبی ہم آہنگی کا احوال اور سعودی معاشرے کے اہم خدوخال کو تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف سعودی عرب کی سماجی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ہر شخص عربوں کا شاکی، ان سے نالاں بلکہ بعض صورتوں میں تو ان سے متنفر ملا، سب کا اس پر اتفاق تھا کہ سعودی عرب میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں، وہاں کے law کو ''با'' سمجھ لیجیے، شاہی خانوادہ قانون سے ماورا ہے۔''(۵۴)

مصنف نے اہل عرب خصوصاً سعودی عرب کی سیاسی و سماجی صورت حال کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ''نشانِ جگر سوختہ'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے عہد کے تمام اہم سیاسی و سماجی حالات و واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے اہم ملکی حالات کا تجزیہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ فوجی حکومتوں کو ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں تاہم وہ جمہوری قوتوں کے غیر جمہوری اور آمرانہ رویوں پر بھی کھل کر تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

آپ بیتی میں ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت ایک سادہ انسان کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ علمی قابلیت کے باوجود کبھی اعلیٰ حکومتی اعزازات اور عہدوں پر فائز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ چالیس سال تک درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے اور اپنے فرائض منصبی کو مکمل ایمانداری سے سرانجام دیا۔ آپ بیتی کے آخر میں انہوں نے اپنے اہل خانہ اور بچوں کے حوالے سے بہت اہم تفصیلات بیان کی ہیں۔

’’چاہِ یوسف سے صدا‘‘ از یوسف رضا گیلانی

سابق وزیرِاعظم پاکستان سیّد یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی ’’چاہِ یوسف سے صدا‘‘ نگارشات پبلشرز لاہور کے زیرِاہتمام ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ دس ابواب میں منقسم، ۲۷۵ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی سیاسی و سماجی حلقوں میں بہت جلد معروف ہوئی۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد بچپن سے نوعمری تک کے حالات کے ساتھ ساتھ جنرل ضیاء الحق، محمد خان جونیجو، محترمہ بےنظیر بھٹو، میاں محمد نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کے ادوارِ حکومت کا احوال بیان کیا ہے۔ آپ نے مختلف حکومتوں کے دوران بھرپور سیاسی کارکن کے طور پر پاکستان کی عملی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آپ بیتی کے باب اوّل کے آغاز میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کیا ہے۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت سیّد ابوالحسن جمال الدین المعروف موسیٰ پاک شہید سے ملتا ہے۔ مصنف ۹ جون ۱۹۵۲ء کو اپنے نانا مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ کے گھر کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا نے آپ کا نام میراں مصطفیٰ رکھا تھا لیکن بعد میں آپ کی نانی نے آپ کا نام یوسف رکھ دیا۔ آپ کی تعلیم کا آغاز سینٹ میریز کانونٹ سکول سے ہوا اور بعد میں آپ نے لا سال ہائی سکول ملتان سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے ایف۔ایس۔سی ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان سے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔ آپ نے ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم۔اے صحافت اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کی شام کی کلاسز میں داخلہ لیا۔ مصنف نے اپنی تعلیم کو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بطریق احسن مکمل کر کے عملی سیاست میں قدم رکھا۔

مصنف آپ بیتی میں تحریر کرتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے مقرر بھی تھے۔ آپ نے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ سے بالترتیب بی۔اے، ایم۔اے اور لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مصنف باب سوم کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں اور پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان سے اکثریت حاصل کی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا گیا۔ وزارتِ عظمیٰ حاصل کرنے سے پہلے آپ اقوامِ متحدہ میں بطور رکن کی حیثیت سے شامل رہے۔ اس کے بعد وفاقی وزیر امورِ خارجہ بھی رہے۔ ملکی سیاسی معاملات کے ساتھ آپ عالمی سیاسی حالات و واقعات سے بھی مکمل طور پر آگاہ رہتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے نئی سیاسی جماعت قائم کی اور پہلی دفعہ عوام کو قوت کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ ملک میں سیاسی ترقی کے عمل کو تیز کر کے جمہوریت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بھٹو نے اقتدار کے حصول کے بعد

بلوچستان کو صوبے کا درجہ دیا، آزاد کشمیر کی خودمختاری کو تسلیم کیا، شمالی علاقہ جات میں اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اتحاد عالم اسلام کا علم بلند کیا۔ اسلامک ورلڈ بنک کے لیے اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس بلایا، زرعی اصلاحات، غرباء کے لیے پانچ مرلہ سکیم، نیوکلیئر پروگرام کا آغاز، جنگی قیدیوں کی رہائی، بھارت سے پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ واگزار کروانا، اقوام متحدہ میں پرجوش خطاب، پورٹ قاسم، سٹیل مل اور شاہرہ ریشم جیسے منصوبے اور ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری جیسے قابلِ تحسین اقدامات کیے۔ ۱۹۷۷ء میں وزیراعظم کی طرف سے قبل از وقت ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ ان دنوں اپوزیشن جماعتوں نے مل کر پاکستان قومی اتحاد قائم کیا۔ حزب اختلاف نے انتخابات کے نتائج کو مسترد کر کے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیا۔ حکومتی جماعت کے خلاف ملک گیر احتجاجی تحریک کا آغاز ہوا۔ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے لیکن حتمی معاہدے سے پہلے جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو ختم کر کے قومی اسمبلی تحلیل کر دی تھی۔ ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ سابق وزیراعظم کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور ۴؍اپریل ۱۹۷۹ء کو پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کروایا گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے کاروبار حکومت کے لیے پاکستان قومی اتحاد کی سیاسی جماعتوں کو ترجیح دی۔ وفاقی کابینہ میں شمولیت کے لیے مسلم لیگ کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ پاکستان قومی اتحاد کی سیاسی جماعتیں اور جنرل ضیاء الحق ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ عرصہ نہ چل سکے۔ بہت سے وزراء نے اپنی وزارتیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کے محمد خان جونیجو نے سب سے پہلے اپنی وزارت کو خیر باد کہا۔ ۱۹۷۹ء میں جنرل ضیاء الحق نے بلدیاتی الیکشن کا اعلان کیا تو بلدیاتی انتخابات کی وجہ سے سیاسی میدان خوب گرم ہو گیا تھا۔

یوسف رضا گیلانی نے اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۹۷۸ء میں بطور رکن سنٹرل ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ اپنی عملی سیاست کا آغاز کیا۔ آپ ۱۹۸۱ء میں رکن وفاقی کونسل اور ۱۹۸۳ء میں چیئرمین ضلع کونسل ملتان منتخب ہوئے۔ آپ نے بطور چیئرمین ضلع کونسل ملتان ایک سو کلومیٹر سڑکیں، ملتان انڈسٹریل اسٹیٹ کو شیر شاہ اور مظفر آباد ہائی وے سے ملایا، سڑکوں، بجلی اور پلوں کی نئی سکیموں، ملتان سٹیڈیم، زرعی کالج، انجینئرنگ کالج ملتان جیسے منصوبے حکومت سے منظور کروائے۔ ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک میں صدارتی ریفرنڈم کروانے کا اعلان کیا تو مصنف نے ریفرنڈم میں ضیاء الحق کا بھرپور ساتھ دیا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کا اعلان کیا گیا تو مصنف نے لودھراں سے قومی اسمبلی کی نشست پر انتخاب کے لیے حصہ لینے کی حامی بھر لی۔ مصنف نے اپنی انتخابی مہم میں پیشین گوئی کی کہ انتخابات کے بعد ملک کے وزیراعظم محمد خان جونیجو، وزیراعلیٰ پنجاب نواز شریف اور وہ خود وفاقی وزیر ریلوے ہوں گے۔ انتخابات کے بعد آپ کی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ صدر ضیاء الحق نے منتخب اراکین قومی اسمبلی کو وزیراعظم کے چناؤ کے لیے ایوانِ صدر طلب کیا اور تقریر میں

کہا کہ انہوں نے محمد خان جونیجو کا انتخاب وزیراعظم کے طور پر کرلیا ہے۔ اس انتخاب کی بنیادی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ محمد خان جونیجو دیانت دار شخص ہیں۔ مصنف آپ بیتی میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''محمد خان جونیجو مدبر، منتظم، کم گو، خوش پوش اور پراعتماد وزیراعظم تھے۔ انہوں نے اپنی کابینہ کے دو وفاقی وزراء کو بدعنوانی کی بنیادی پر سبکدوش کیا اور ایک گورنر سے محض اس بنیاد پر استعفیٰ طلب کیا کہ ان کا بیٹا منشیات کے مقدمے میں ملوث تھا۔''(۵۴)

محمد خان جونیجو چونکہ غیر جماعتی بنیادوں پر وزیراعظم منتخب ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف اُٹھانے کے بعد ایوانوں سے خطاب میں کہا کہ جمہوریت اور مارشل لاء کبھی اکٹھے نہیں چل سکتے۔ انہوں نے فوراً سیاسی پارٹی کی تنظیم سازی کا فیصلہ کیا۔ صدر ضیاء چاہتے تھے کہ حکومت ایوان میں پارلیمانی کمیٹیوں کو مضبوط بنا کر ایوان کو چلائے اور نئی سیاسی جماعتیں نہ بنائی جائیں۔ مصنف نے اس حوالے سے صدر کا پیغام وزیراعظم تک پہنچا دیا لیکن وزیراعظم محمد خان جونیجو کا کہنا تھا کہ پارلیمانی نظام حکومت میں سیاسی جماعتوں کا شامل ہونا ناگزیر ہے۔ سیاسی جماعتوں کے بغیر جمہوریت کے ثمرات عوام تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ کچھ عرصہ بعد وزیراعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے وزیراعظم ہاؤس میں پارلیمانی پارٹی کا اجلاس طلب کیا، جس میں صدر ضیاء نے کہا کہ وزیراعظم کی خواہش پر انہیں غیر جماعتی ایوان کو جماعتی بنانا پڑ رہا ہے۔

وزیراعظم محمد خان جونیجو اور پیر پگاڑو کی نواز شریف کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی بہت کم تھی، اوپر سے صدر ضیاء کو ان سے یہ شکایت تھی کہ وزیراعلیٰ پنجاب نواز شریف یہی سمجھتے تھے کہ وہ پنجاب میں وزیراعلیٰ اس وجہ سے ہیں کہ ان کو اراکین صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ صدر ضیاء میاں نواز شریف پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے تھے کہ وہ ارکان صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی وجہ سے وزیراعلیٰ پنجاب نہیں ہیں بلکہ وہ وفاقی حکومت کی حمایت کی بدولت وزیراعلیٰ پنجاب کے عہدے پر براجمان ہیں۔

سالانہ بجٹ ۱۹۸۶ء جب قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اراکین اسمبلی نے بجٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وزیراعظم نے بجٹ میں ترامیم کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دنوں بعد قومی اسمبلی میں ترمیمی بجٹ پیش ہو تو وزیراعظم نے بجٹ تقریر میں بیوروکریٹس اور جرنیلوں کے لیے سخت الفاظ میں کہا کہ وہ جرنیلوں اور بیوروکریٹس کو بڑی بڑی گاڑیوں کی بجائے سوزوکی ہزار سی سی، وفاقی وزراء کے لیے تیرہ سو سی سی، صدر اور وزیراعظم کے لیے سولہ سو سی سی گاڑیوں کا انتظام کرنے کا اعلان کیا۔ وزیراعظم کی یہ بات سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ پر گراں گزری۔

سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو جلاوطنی کے بعد واپس پاکستان تشریف لائیں تو وطن پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے امریکہ اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

ان کی آمد سے حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مسئلہ افغانستان پر جب گول میز کانفرنس کا انعقاد اسلام آباد میں کیا گیا تو اس میں بے نظیر بھٹو نے بھی بطور خاص شرکت کی۔ بے نظیر کی کانفرنس میں شرکت حکومت پر گراں گزری اور پھر صدر اور وزیراعظم کے درمیان دوریاں تیزی سے بڑھنے لگیں۔

آپ بیتی میں مصنف تحریر کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دوست کی تجویز پر پاکستان پیپلز پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دراصل مصنف مسلم لیگ کی قیادت سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ ان دنوں پیپلز پارٹی، ایم۔آر۔ڈی کا حصہ تھی۔ اگر بے نظیر بھٹو حکومتی وزیر یوسف رضا گیلانی سے ملاقات کر لیتی تو پیپلز پارٹی کی طرف سے ایم۔آر۔ڈی پر اس کا برا اثر پڑتا۔ بالآخر یوسف رضا گیلانی نے بے نظیر سے ملاقات کرنے سے پہلے استعفیٰ لکھ دیا۔ کراچی میں بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر کے مصنف پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔

صدر جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۸ء میں قومی اسمبلی کو تحلیل کر کے جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا اور غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کروانے کا اعلان کر دیا۔ صدر ضیاء کے حکومت کو برطرف کر دینے کے بعد ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کے دن صدر ضیاء الحق کا طیارہ بہاولپور میں گر کر تباہ ہو گیا۔ طیارے میں موجود تمام لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ چیئرمین سینٹ غلام اسحاق خان قائم مقام صدر بن گئے۔ ۱۹۸۸ء کے جنرل الیکشن عدالتی حکم کے مطابق جماعتی بنیادوں پر کروائے گئے۔

مصنف کی عام انتخابات میں کامیابی کے بعد بے نظیر بھٹو سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ نواز شریف کو الیکشن میں ہرانے پر بے نظیر بھٹو نے آپ کو بہت مبارک دی۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے اراکین قومی اسمبلی سے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی ہے جو تین اراکین قومی اسمبلی کو پیپلز پارٹی میں شامل کروا دے تاکہ حکومت بنائی جا سکے۔ اس وقت تمام لوگ خاموش رہے لیکن مصنف نے ایک وزارت کے بدلے تین ارکان کو اپنے ساتھ ملا لینے کی تجویز دی جسے فوراً قبول کر لیا گیا۔ ان دنوں صدر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ وزیراعظم کو نامزد کر سکتا تھا۔ صدر اسحاق خان نے بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم نامزد کیا، انہوں نے اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا اور دنیا کی پہلی مسلمان خاتون وزیراعظم منتخب ہو گئیں۔

وفاقی کابینہ کی تشکیل سے پہلے وزیراعظم بے نظیر نے مصنف کو اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر نہ بنائے جانے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مصنف کو حکومت کی طرف سے اردن جانے والے وفد میں شامل کر لیا گیا۔ وہاں پر انہیں اردن کے دارالحکومت عمان اور اسلام آباد کو جڑواں شہر قرار دیئے جانے کی ایک تقریب میں شمولیت کے لیے بھجوایا گیا تھا۔ مصنف نے وہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت بی بی زینبؓ کے روضہ مبارک پر حاضری دی۔ اردن کے دورہ کے بعد آپ نے سعودی عرب جا کر عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد پاکستان واپس آئے۔ وطن واپس آئے تو آپ کو بطور وفاقی وزیر برائے سیاحت وزیراعظم کی کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ آپ نے بطور وفاقی وزیر سیاحت جن اہم امور کو انجام دیا ان میں نئی ٹورازم پالیسی کا اجراء، سیاحت

کو صنعت کا درجہ دلوایا گیا، سیاحتی شہروں کو ٹیکس فری زون بنایا، ٹورسٹ انفارمیشن سنٹرز کا قیام، اوپن سکائی پالیسی، سکائنگ ریزورٹ کا قیام، ملتان سے حج فلائٹس کا آغاز، انٹرنیشنل ٹورازم کنونشن کا انعقاد اور شاہی قلعہ میں لائیٹ اینڈ ساؤنڈ شو کا مظاہرہ شامل ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف نے پاکستان کی سیاسی صورت حال کو حقائق کے ساتھ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے لاہور میں انٹرنیشنل ٹورازم کنونشن کا انعقاد کروایا تو افتتاحی تقریب میں وزیر اعلیٰ نواز شریف اور اختتامی تقریب میں وزیر اعظم کو مہمان خصوصی بنایا۔ دونوں رہنماؤں نے تقاریب میں موثر تقاریر کیں۔ وزیر اعظم اس بات پر خوش تھیں کہ پیپلز پارٹی میں کم از کم ایک وزیر ایسا ہے جو ایم۔ آر۔ ڈی سے سیاسی تعلقات کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتا ہے اور ان سے براہِ راست بات کر سکتا ہے۔

وزیر اعظم بے نظیر نے ۱۹۸۹ء میں امریکہ کا کامیاب دورہ کیا۔ انہی دنوں انقلاب ایران کے بانی امام خمینی کا انتقال ہو گیا تو ان کی نماز جنازہ میں شامل ہونے کے لیے وفاقی حکومت کی طرف سے یوسف رضا گیلانی نے نمائندگی کی جبکہ خصوصی طیارے میں صدر غلام اسحاق خان، چوہدری شجاعت حسین، صبغت اللہ مجددی اور قاضی حسین احمد کے علاوہ کئی اور شخصیات بھی موجود تھیں۔ بھارت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جب ۱۹۸۹ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں دوسرے معاہدوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ بھی طے پا گیا تھا۔

وزیر اعظم کے خلاف جب قومی اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی تو یوسف رضا گیلانی کو خصوصی طیارے کے ذریعے ملتان سے اسلام آباد بلوایا گیا۔ مصنف اور دوسرے سیاسی کارکنان نے تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنانے کے لیے عملی مساعی کی تو بالآخر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو ناکام بنا دیا گیا۔ تحریک کو ناکام بنانے والے اراکین کو بعد میں وفاقی وزارتوں سے نوازا گیا تھا۔ ان میں غلام محمد مانیکا کو وفاقی وزیر برائے افرادی قوت و سمندر پار پاکستانی اور مخدوم احمد عالم کو اسی محکمہ کا وزیر مملکت بنایا گیا جبکہ ساتھ دینے والوں میں رئیس شبیر نے کوئی بھی وزارت لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد صدر غلام اسحاق خان نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف اور اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ قائد حزب اختلاف مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم بنا کر عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔

اسلامی جمہوری اتحاد ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات جیت گیا اور میاں محمد نواز شریف پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی نے سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو قائد حزب اختلاف اور فاروق احمد خان لغاری کو ڈپٹی قائد حزب اختلاف منتخب کر لیا۔ مصنف میاں محمد نواز شریف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میاں صاحب طبعاً ایک شریف انسان ہیں۔ کم گو، خوش لباس اور دوستوں کے

دوست ہیں۔ نواز شریف پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں قومی وصوبائی اسمبلی
کی نشستوں سے بیک وقت منتخب ہوئے۔‘‘(۵۵)

۱۹۹۳ء میں صدر غلام اسحاق خان نے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ حکومت کی برطرفی کے بعد میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم بنا دیا گیا اور یوسف رضا گیلانی، فاروق لغاری، آصف زرداری، آفتاب شیر پاؤ اور اعتزاز احسن کو وفاقی کابینہ کا حصہ بنایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد سپریم کورٹ نے میاں محمد نواز شریف کی حکومت دوبارہ بحال کر دی لیکن غلام اسحاق خان اور نواز شریف میں تلخیاں بڑھنے سے بعدازاں دونوں کو استعفے دینے پڑے۔ ملک میں عام انتخابات کروانے کی غرض سے معین قریشی کو وزیراعظم اور چیئرمین سینٹ وسیم سجاد کو قائم مقام صدر بنایا گیا۔ جنھوں نے ۱۹۹۳ء میں عام انتخابات کا انعقاد کروایا۔

پیپلز پارٹی الیکشن میں کامیاب ہو کر حکومت بنانے کی پوزیشن میں آ گئی تھی۔ بے نظیر بھٹو کی خواہش پر یوسف رضا گیلانی کو سپیکر قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے چنا گیا۔ سپیکر کے انتخاب کے لیے مصنف کا مقابلہ گوہر ایوب خان سے تھا۔ قومی اسمبلی میں ووٹنگ کے بعد یوسف رضا گیلانی کو ایک سو چھ جبکہ گوہر ایوب خان کو نوے ووٹ مل سکے۔ اس طرح یوسف رضا گیلانی کو قومی اسمبلی کا سپیکر منتخب کر لیا گیا۔ کچھ روز کے بعد وزیراعظم کے عہدے کے لیے انتخاب ہوا تو بے نظیر بھٹو کو بطور وزیراعظم منتخب کر لیا گیا۔ بعدازاں مختصر وفاقی کابینہ کا انتخاب کر لیا گیا اور صدر مملکت کے عہدے کے لیے فاروق احمد لغاری کو نامزد کیا گیا۔ جو کہ بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے۔

صدر فاروق احمد لغاری نے ۱۹۹٦ء میں حکومت کی بدعنوانی کے متعلق ایک ریفرنس چیئرمین سینٹ اور سپیکر قومی اسمبلی کو بھجوا دیا۔ یوسف رضا گیلانی نے قومی اسمبلی میں حکومت کے خلاف ریفرنس پڑھ کر سنایا اور اس مسئلے پر خصوصی کمیٹی قائم کر دی، جس میں سیاسی جماعتوں کے سربراہان کو شامل کیا گیا تھا۔ قائد حزب اختلاف نے قومی اسمبلی میں احتساب بل پیش کیا، جس میں احتساب کو شفاف بنانے کے لیے کوئی سربراہ جج یا سابق جج کی خدمات لینے اور احتساب سیل کے سربراہ کے لیے قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کے متفق ہونے کی شرط لگائی تھی۔

صدر فاروق احمد لغاری نے بالآخر ۴ نومبر ۱۹۹٦ء کو منتخب حکومت کو برطرف کر دیا تو وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو حراست میں لے لیا گیا۔ باب ہفتم میں مصنف نے وزیراعظم بے نظیر کے دورِ حکومت میں مثبت تبدیلیوں کے بارے میں مفصل انداز میں اپنا تجزیہ یوں پیش کیا ہے:

’’بے نظیر نے اپنے والد کی طرح ہمیشہ اپنی سیاست کو عوامی رکھا اور اسی طاقت کے
بل بوتے پر دو مرتبہ انتخابات جیت کر وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوئیں۔ انہیں پہلی مسلمان

> خاتون وزیراعظم بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے دورِاقتدار میں
> سیاست کو نیا رُخ دیا۔"(۵۶)

بے نظیر نے اپنے ادوارِ حکومت میں جن سیاسی وسماجی عوامل پر خصوصی توجہ دی، ان میں اہم نج کاری اور ڈی ریگولیشن پالیسیاں، اڑتالیس ہزار نئے سکولوں کی تعمیر، خواتین ججوں کا تقرر، خواتین کے لیے الگ تھانے اور بینکوں کا قیام، مزدوروں اور طلبہ یونینز کی بحالی، سزائے موت کے قیدیوں کی سزاؤں کو عمر قید میں تبدیل کیا، میزائیل ٹیکنالوجی کی فراہمی، آزدانہ تجارت کا فروغ، دولت مشترکہ کی دوبارہ رکنیت اور بھارت سے ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ شامل ہیں۔

میاں محمد نواز شریف ۱۹۹۷ء کے جنرل الیکشن میں کامیاب ہو کر دوبارہ وزیراعظم بن گئے تھے۔ وزاتِ عظمٰی کا دوسری دفعہ موقع ملنے پر نواز شریف آئین میں پندرہویں آئینی ترمیم کروا کر "امیرالمومنین" بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے لیکن جنرل پرویز مشرف نے ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو منتخب حکومت کو برطرف کر دیا اور خود چیف ایگزیکٹو بن کر ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت پر مصنف اپنے تجزیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ وہ اپنی حلیف جماعتوں کو ساتھ لے کر نہ چل سکے، پیلی ٹیکسی سکیم کے معاملات، کوآپریٹو سکینڈل، فارن کرنسی اکاؤنٹس کو منجمد کروانا، چھوٹے بھائی کو وزیراعلیٰ پنجاب بنانا، عدم برداشت، آرمی اسٹیبلشمنٹ سے ناروا سلوک اور صرف پنجاب کا نعرہ لگانا ایسے عوامل تھے جن کی وجہ سے انہیں دوسری مرتبہ حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یوسف رضا گیلانی نواز حکومت کے دوسرے دور کے باب میں عمران خان کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> "۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں عمران خان، نواز شریف کے بھاری مینڈیٹ کا فائدہ اُٹھا سکتے تھے کیونکہ انتخابات سے قبل میاں صاحب نے انہیں قومی وصوبائی اسمبلی کی کچھ نشستیں دینے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اگر وہ یہ پیشکش مان لیتے تو جب میاں صاحب کی حکومت کو برطرف کیا گیا اور بے نظیر بھٹو بھی ملک سے باہر تھیں تو وہ ملک میں متبادل قیادت کے طور پر ابھر سکتے تھے اور پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے مگر وہ اس کا فائدہ نہ اُٹھا سکے۔"(۵۷)

کارگل جنگ کے بعد نواز شریف اور آرمی چیف کے درمیان دوریاں پیدا ہو گئیں تب نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف بنا دیا۔ یہ فیصلہ آرمی کے لیے ناقابلِ قبول تھا، انہوں نے فوراً حکومت کو برطرف کر کے اسمبلی معطل کر دی اور نواز شریف پر طیارہ سازش کیس میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد صدر رفیق تارڑ کو ہٹا کر، خود جنرل مشرف صدر پاکستان کی کرسی پر براجمان ہوئے۔ ۲۰۰۱ء میں ملک میں ریفرنڈم کروایا گیا۔ ۲۰۰۲ء میں

بلدیاتی الیکشن غیر جماعتی بنیادوں پر کروائے گئے۔ عام انتخابات کے بعد میر ظفر اللہ جمالی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ سترہویں آئینی ترمیم کر کے ایوان کی طاقت کو کم کر دیا گیا۔

پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے فروری ۲۰۰۱ء میں بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی پر ان کا پرتپاک استقبال کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ دوسری طرف ۱۰ فروری ۲۰۰۱ء کو یوسف رضا گیلانی نے دی نیوز اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی سے ہی سیاسی خلا کو پُر کیا جا سکتا ہے۔ اس انٹرویو کے ردعمل میں یوسف رضا گیلانی کو لاہور کی رہائش گاہ سے پولیس نے گرفتار کر کے چمبہ ہاؤس نیب کے تھانے پہنچا دیا۔ نوے دن کے جسمانی ریمانڈ کے بعد آپ کو اڈیالہ جیل راولپنڈی پہنچا دیا گیا۔ پہلے نیب ریفرنس میں آپ پر عائد الزامات میں ٹیلی فون کا غلط استعمال، گاڑیوں کی خریداری، مرمت اور کیمپ آفس کا غلط استعمال جبکہ دوسرے نیب ریفرنس میں قومی اسمبلی میں ملازمتیں دینے کا الزام شامل تھا۔

نیب آرڈیننس کے تحت احتساب عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ عدالتیں نیب کے قانون کے مطابق ملزمان کے خلاف مقدمات کی سماعت کرتی ہیں۔ نیب اکثر ملزمان کو نوے دن کے لیے جسمانی ریمانڈ پر اپنی حراست میں رکھ کر تفتیش کرتی ہے۔ یوسف رضا گیلانی کے خلاف پہلے ریفرنس کا فیصلہ ۸ جون ۲۰۰۲ء کو سنایا گیا جس میں پانچ سال قید اور دس لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مصنف کی ہائی کورٹ نے ضمانت منظور کر لی۔ ضمانت مل جانے کے بعد بھی آپ حکومتی خواہش کے برعکس سیاسی میدان میں بہت سرگرم دکھائی دیے۔ یوسف رضا گیلانی کو بعد میں احتساب عدالت نمبر ا میں نیب کیس کا فیصلہ سننے کے لیے بلایا گیا۔ احتساب عدالت کے جج ملک منظور حسین نے فیصلہ سناتے ہوئے دس سال قید کے ساتھ دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید پانچ سال قید کی سزا دیئے جانے کے احکامات صادر کیے تھے۔

آپ بیتی کے باب آخر میں یوسف رضا گیلانی نے چند تجاویز اور تجزیات پیش کیے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر موجودہ ملکی سیاسی صورت حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ قائداعظم کی خواہشات کے مطابق پاکستان میں جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا گیا۔ آمریت پسند عناصر نے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر قومی مفادات کو بالائے طاق رکھا۔ محب وطن سیاست دان تو نہ صرف حکومت میں بلکہ حزب اختلاف میں رہ کر بھی ملک وقوم کی بہتر تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ملک میں آزاد عدلیہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ملک میں آبی ذخائر اور ڈیموں کی تعمیر مجموعی ترقی کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے مزید تاخیر کے بغیر نئے ڈیموں کی تعمیر کا آغاز کیا جانا چاہیے۔ پاکستان کے اہم مسائل کے بارے میں یوسف رضا گیلانی بیان کرتے ہیں:

میرا تجزیہ ہے کہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے بعد آئندہ جنگیں پانی کے حصول پر ہوں گی۔

اس کے بعد اگر کوئی سنجیدہ ترین مسئلہ ہے تو وہ آبادی میں اضافے کی رفتار ہے جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔۔۔ ہمارے ملک میں اقتصادی حالات غیر یقینی صورتحال کا شکار ہیں جس سے ہمارا ملک اقتصادی لحاظ سے تنزل پذیر ہے۔"(۵۸)

آپ بیتی میں مصنف کا کہنا ہے کہ ملک کی حقیقی ترقی اور خوش حالی کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہر شعبہ زندگی میں استعمال از حد ضروری ہے۔ زرعی ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان کے ستر فیصد عوام کا پیشہ زراعت ہے۔ زراعت میں جدید ٹیکنالوجی اور کوآپریٹو فارمنگ کی بدولت پاکستان میں زرعی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ پاک فوج دنیا کی بہترین افواج میں شمار کی جاتی ہے لیکن شومئی قسمت کہ کچھ آمروں کے انفرادی کردار نے فوج جیسے نظم و ضبط کے حامل ادارے کو بھی متنازعہ بنانے کی کوششیں کیں ہیں۔ فوج کے ادارے کو مزید مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے آپ بیتی میں مصنف رقم طراز ہیں:

"فوج کو مضبوط اور عالمی معیار کے مطابق بنانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی فراہمی بہترین اقدام ہوگا۔ خصوصاً فضائی اور بحری شعبے میں ہماری افواج کے پاس جدید سہولیات کی کمی ہے جس پر توجہ دینا از حد ضروری ہے۔ بجٹ میں بہت بڑا حصہ اس ادارے کے لیے مختص کیا جاتا ہے مگر اس کا آڈٹ نہ ہونا شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔ اس کا بجٹ باقاعدگی سے قومی اسمبلی میں پیش ہونا چاہیے۔"(۵۹)

مصنف کا کہنا ہے کہ آئین پاکستان میں دو ایوانی مقننہ قومی اسمبلی اور سینٹ کو اس لیے بنایا گیا تھا تاکہ کوئی غیر آئینی ترمیم نہ کی جاسکے اور چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی پیدا نہ ہونے پائے لیکن پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ آئین میں سترہویں ترمیم سیاسی دباؤ کی بنیاد پر منظور کروائی گئی تھی۔ ملک میں انتخابات کا انعقاد اگر آزادانہ اور شفاف ہوگا تو عوام کے مطالبات کو حکومت کے سامنے لانے کے قابل ہوں گے۔ آپ بیتی کے آغاز میں یوسف رضا گیلانی نے "چاہِ یوسف سے صدا" کو تحریر کرنے کے مقصد کے بارے میں لکھا ہے:

"اس کتاب کا اصل مقصد عہد حاضر کی سیاست کے پنہاں گوشوں اور ایوان اقتدار کی راہداریوں کی سرگوشیوں کو خاموش اکثریت کی سماعتوں تک پہنچانا ہے اگرچہ اس میں عوام کے حقوق اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کی گئی میری مقدور بھر جدوجہد اور کاوشوں کی ایک جھلک بھی نظر آئے گی۔"(۶۰)

یوسف رضا گیلانی نے آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی صورت حال کو مثالی انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ بیتی میں خاندانی پس منظر کے بعد تعلیمی مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق، محمد خان جونیجو، محترمہ بے نظیر بھٹو، میاں محمد نواز شریف

کے ادوارِ حکومت اور جنرل مشرف کے عہد حکمرانی کے تناظر میں مصنف نے سیاسی حالات کو تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ یوسف رضا گیلانی نے جیل کی قید میں اپنے مشکل وقت کو آپ بیتی لکھنے میں صرف کیا۔[۶۱] ڈاکٹر پرویز پروازی آپ بیتی ''چاہِ یوسف سے صدا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ خودنوشت ایک نیک طینت نوجوان سیاست دان کی زندگی کی داستان ہے جس کا تعلق ایک مضبوط سیاسی خانوادے سے ہے۔''[۶۲]

دورانِ اسیری مصنف کو مختلف جیلوں میں رکھا جاتا رہا اس لیے انہوں نے جیلوں کے حالات کو بہتر بنانے کی چند قابلِ عمل تجاویز بھی آپ بیتی میں بیان کی ہیں۔

''جالب بیتی'' از حبیب جالب

حبیب جالب ۱۹۲۸ء میں ضلع ہوشیار پور کے گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ تھا، جو کہ اچھا علمی ذوق رکھنے کی بدولت کتاب ''گلہائے عقیدت'' کے مصنف تھے جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے واقعات، اہلِ علم و فضل بزرگ شخصیات کے حالات اور اپنے خاندان کے بارے میں مفید معلومات قلم بند کی ہوئی تھیں۔ مصنف نے دریائے بیاس کے کنارے آباد گاؤں میانی افغاناں میں آنکھ کھولی تو انہیں غربت و افلاس کی جا بجا تصاویر دکھائی دینے لگیں۔ ان کے گاؤں میں زمین کے مالک لوگ بے زمین ہاریوں کو ''کمی'' کہا کرتے تھے اور بے زمین لوگوں سے ان کا سلوک انتہائی تحقیر آمیز ہوتا تھا۔ اگر کوئی راہ چلتے زمینداروں کو سلام کرنا بھول جاتا تھا تو اس کو مارا پیٹا جاتا تھا۔ پولیس کا نظام بھی اس دور میں برائے نام ہوتا تھا کیونکہ گاؤں میں زیادہ تر معاملات کا فیصلہ بڑے زمیندار خود کیا کرتے تھے۔ ان فیصلوں پر پولیس کی مداخلت نہ ہونے کے برابر تھی۔ غربت اور افلاس کی بدولت بچپن میں مصنف خود جنگل سے لکڑیاں اور مکئی کی جڑیں چن کر لایا کرتے تھے، جن کو جلا کر گھر میں کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ ہر سال عید پر صرف بچوں کو ایک سوٹ بنوا کر دیا جاتا تھا اور عیدی کی مد میں ہر بچے کو ایک آنہ ملتا تھا۔

آپ بیتی میں مصنف لکھتے ہیں کہ ان کی والدہ نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے بچپن سے ہی بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ ان خوابوں کا تذکرہ وہ عموماً اپنی سہیلی جو کہ ان کے گاؤں میں بڑے زمیندار کی بیوی اور نامور ادیب اشفاق احمد کی خالہ سے کیا کرتی تھیں۔ ان کے شوہر اس دور میں وائسرائے ہند کے دفتر دہلی میں ملازمت کیا کرتے تھے۔ مصنف کی والدہ کی سہیلی نے آپ کے بڑے بھائی کو میٹرک کے بعد دہلی اپنے پاس بلا لیا اور وہیں ان کو ملازمت اور رہائش کے لیے سرکاری کوارٹر مل گیا۔ آپ کے والد بھی کام کے سلسلے میں دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور مصنف کو بھی دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

مصنف کے بڑے بھائی مشتاق مبارک شعر و شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے۔ دہلی شہر کے اکثر مشاعروں میں مصنف اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے مشکل حالات کے دور کے بعد قیامِ پاکستان اور ہجرت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم منافرت عروج پر تھی۔ ہم لوگ بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ امرتسر سے کئی ریل گاڑیاں گزریں، اور ان پر دونوں طرف سے قیامتیں ٹوٹیں، ہماری ٹرین بھی جب امرتسر پہنچی تو بتیاں بجھا دی گئیں اور پھر بس زندہ رہنا تھا سو ہم ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچ گئے۔''(۶۳)

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کے دوران مصنف کی ٹرین سے اگلی گاڑی امرتسر کے مقام پر مسلمانوں کے خون سے رنگی جا چکی تھی۔ امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر تمام مہاجرین کے خون سے ہولی کھیلی جا چکی تھی۔ بلوائیوں نے ٹرین روک کر قتل عام کیا اور جاتے ہوئے گاڑی کو آگ لگا دی تھی۔ مصنف جب ٹرین کے ذریعے امرتسر اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں موجود گاڑی میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مصنف کے والد دہلی میں ہی رہ گئے کیونکہ ان کی چوڑی بازار میں جوتوں کی دکان تھی۔ کچھ عرصہ بعد حالات بہت زیادہ کشیدہ ہوئے اور ہندو مسلم دشمنی اتنی عروج پر پہنچی کہ وہ اپنی دکان نہ کھول سکے۔ آپ کے والد نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے ایک سال بعد کراچی پہنچے تھے۔ مصنف کچھ عرصہ کراچی میں قیام پذیر رہنے کے بعد حیدرآباد محنت مزدوری کی غرض سے روانہ ہوئے۔ وہاں مصنف بطور شاعر مزدوروں میں کافی مشہور ہوئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں قیام کے بعد آپ لاہور پہنچے اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس دور میں اورینٹل کالج میں سید عبداللہ، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور سیّد وقار عظیم اساتذہ میں سے تھے۔

مصنف اپنی داستانِ حیات میں لکھتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دور میں عوام کے ذہنوں میں خوش گمانی تھی کہ یہ ملک ایک آزاد، خود مختار اور جمہوری ملک بن کر دنیا کے نقشے پر اُبھرے گا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مصنف کے یہ خواب جلد ہی ایک ایک کر کے بکھرنے لگے اور انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اقتدار کی ہوس رکھنے والا مقتدر طبقہ ملکی مسائل کو بہترین انداز میں حل کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح اگر پہلا آئین بنا کر ملک میں نافذ کروا دیتے تو شاید حالات یکسر مختلف ہوتے لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے ایک بہت بڑا سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کو پورا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ مذہبی جماعتوں کی سیاست کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے جمعیت علمائے ہند اور جماعت اسلامی پاکستان کے معرضِ وجود میں لائے جانے کی شدید مخالف تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان جماعتوں کے قائدین نے یہ باور کروانا شروع کر دیا کہ وہ قیامِ پاکستان کے حامی تھے۔ حالانکہ تحریکِ پاکستان کے دوران انہوں نے پاکستان کے قیام کی ہر فورم پر کھل کر

مخالفت کی تھی۔

مصنف آپ بیتی میں تحریر کرتے ہیں کہ اس دور کی ترقی پسند سوچ کی حامل سیاسی تحریکوں نے انہیں عملی سیاست کی طرف مائل کیا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے نیشنل عوامی پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر کے حقیقی جمہوریت، خوش حالی اور سامراجی طاقتوں سے آزادی کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست پر بیوروکریسی نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے تھے۔ ملک کے طول وعرض میں ترقی پسند تحریکوں کی بدولت سیکولر جمہوری سیاست کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اس دور میں مفاد پرست ٹولے کو جمہوریت قطعی طور پر پسند نہیں تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جنرل ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور راولپنڈی سازش کیس میں فیض احمد فیضؔ کو بھی دھر لیا گیا حالانکہ ان کا اس سازش سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مارشل لاء کے خلاف صرف مصنف نے ہی آواز اُٹھائی اور اس کا خمیازہ بھی بھگتنا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین جب ملک میں نافذ کیا گیا تو مصنف کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آپ نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''دستور'' تحریر کی اور اسے جشن مری کے بڑے مشاعرے میں سنایا تو اہل محفل نے خوب داد دی۔ وہاں ایک بزرگ نے آپ سے کہا کہ نظم پڑھنے کا یہ موقع نہیں تھا، تو آپ نے جواباً عرض کیا کہ میں موقع پرست شاعر نہیں ہوں۔ اس نظم کی وجہ سے دس سال تک مصنف کا داخلہ مری کے مشاعروں میں بند کر دیا گیا۔

۱۹۶۴ء کے انتخابات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب انتخابات کروائے گئے تو محترمہ فاطمہ جناح نے بھی الیکشن میں حصہ لیا ور نیشنل عوامی پارٹی جو کہ متحدہ اپوزیشن میں شامل جماعت تھی نے متفقہ طور پر مادرِ ملت کی بھرپور حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ مصنف کا مادرِ ملت کی انتخابی کمپیئن اور حکومت مخالف نظمیں تحریر کر کے جلسوں اور مشاعروں میں پڑھنا حکومت وقت کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ حکومت کی ایماء پر مصنف کی گرفتاری کے لیے پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز مصنف مقامی ہوٹل میں قیام پذیر تھے کہ پولیس نے جعلی پاسپورٹ کے الزام میں گرفتار کر کے جھوٹا میڈیکولیگل کا سرٹیفکیٹ بنوا کر شراب پینے کا بھی الزام لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ مصنف پر کسی آدمی پر چاقو سے وار کر کے زخمی کر دینے کا بھی بعد میں مقدمہ درج کر دیا گیا، یوں مصنف پر تین جھوٹے الزامات لگا دیئے گئے تھے۔ دراصل حکومت مصنف کو محترمہ کے تین بڑے جلسوں میں شرکت سے ہر قیمت پر روکنا چاہتی تھی اس لیے مصنف پر مقدمات درج کروائے گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد میاں محمود علی قصوری، شیخ رفیق احمد اور ان کے ساتھی وکلاء کی بھرپور مساعی کے بعد مصنف کو ہائی کورٹ سے ضمانت پر رہائی مل گئی تھی۔ ادھر انتخابات میں مادرِ ملت کی کامیابی یقینی تھی لیکن دوسری طرف سیاسی حلقوں میں کہا جانے لگا کہ مولانا بھاشانی جو کہ سیاسی اتحاد میں شامل تھے، انہیں ایوب خان نے خرید لیا ہے۔ سیاسی مفادات کے حصول کے لیے حکومتی خرید و فروخت سے جمہوریت کو ایک دفعہ پھر سے دھچکا لگا اور محترمہ فاطمہ جناح کو انتخابات میں شکست

کا سامنا کرنا پڑا۔

مصنف جنرل ایوب خان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کے حصے بخرے کرنے کا آغاز جنرل ایوب خان کے دور سے ہوا تھا۔ اس امر کی بنیاد تو دراصل اس وقت رکھی گئی تھی جب قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوا اور ایک نااہل بیوروکریٹ کو تمام اختیارات منتقل کر دیئے گئے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب بیوروکریسی کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا، امریکہ نواز بیوروکریسی نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے ملکی مفادات کو بالائے طاق رکھا اور ایوب خان حکومت نے خارجہ پالیسی میں امریکہ کو ان داتا بنا دیا تھا۔ مصنف اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے عملی سیاست میں بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ اس عہد کے حکمرانوں کو یہ بات پسند نہ تھی اس لیے مستقل ملازمت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ واحد ایک ذریعہ آمدن تھا کہ پنجاب کے مختلف اضلاع میں حکومتی سرپرستی میں شاعرے منعقد کروائے جاتے جس کا باقاعدہ معاوضہ ادا کیا جاتا تھا، لیکن جب آپ نے اپنی نظم ''دستور'' مشاعروں میں سنانے کا سلسلہ شروع کیا تو حکومت نے آپ کو مشاعروں میں شامل ہونے سے روک دیا اور کئی مرتبہ آپ کو صوبہ بدر بھی کیا گیا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے رائٹرز گلڈ بنائی گئی جس سے بہت سے ادیبوں کو من پسند مراعات کے ساتھ انہیں غیر ملکی دورے کرائے گئے لیکن مصنف کو بار بار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ مصنف کا کہنا ہے رقص گاہ حیات میں دو اہم ادارے ہیں ایک حکومت اور دوسرا عوام۔

حبیب جالب بطور شاعر اپنی قوم کے حقوق کی جنگ لڑنے اور حقیقی جمہوریت کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں کبھی بھی حکومت کو پسند نہیں آیا جبکہ اس کے برعکس عوام میں اسے ہمیشہ عزت اور پذیرائی کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ حبیب جالب کو عوام میں اپنی قدر و منزلت کے بڑھنے پر ہمیشہ فخر رہا۔ حالانکہ وظیفہ خور قسم کے بہت سے ادیبوں کو مسلسل نوازا جاتا رہا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جنرل ایوب خان کا دور سیاسی ابتری کا دور تھا۔ اس نے اپنے اقتدار کے لیے ہر قسم کے سیاسی و غیر سیاسی عوامل کا بھرپور استعمال کیا۔ حفیظ جالندھری سمیت بہت سے شعراء حکومتی مراعات یافتہ تھے۔ تاریخ سے حوالے دے کر مصنف لکھتے ہیں کہ کچھ ایسے شاعر بھی گزرے ہیں جنھوں نے آمریت اور بادشاہت مخالف شاعری کی، ان میں پہلوی دور کے شعراء سے لے کر حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جیسے معروف شعراء شامل ہیں جنھوں نے سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر بھٹو نے ان سے کہا کہ انہیں نیشنل عوامی پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنوا دیں، اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو ایوب حکومت چھوڑ چکے تھے۔ مصنف نے انہیں جواب دیا کہ یہ ایک جمہوری سیاسی جماعت ہے، آپ اس جماعت میں ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے شامل ہوں اور جماعت کے لوگوں کو ملیں ان سے روابط بڑھائیں تاکہ آپ کو کوئی اچھا عہدہ مل سکے۔ مصنف کی بھی خواہش تھی کہ بھٹو ان کی پارٹی کا حصہ بنیں لیکن چند وجوہات کی بناء پر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بعد میں پیپلز پارٹی قائم کی تو انہیں جیل جانا پڑا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے

بہت سے رہنماؤں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ جنرل ایوب خان کی حکومت کے خلاف بہت سی تحریکوں نے زور پکڑا تو بالآخر ایوب خان نے استعفیٰ دے دیا اور خلاف آئین اقتدار سپیکر کے سپرد کرنے کی بجائے فوج کو سونپ دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے عوامی دباؤ میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ان عام انتخابات میں مجیب الرحمٰن کو واضح برتری حاصل تھی لیکن بھٹو وزارتِ عظمیٰ کا فیصلہ قومی اسمبلی کی بجائے باہر کرنا چاہتے تھے اور ان کو در پردہ یحییٰ خان کی بھی حمایت حاصل تھی۔ سیاسی جلسوں میں با قاعدہ نعرے لگوائے جاتے تھے کہ ''اِدھر ہم اُدھر تم'' بالآخر یہی ہوا، پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان کی حکومت مل گئی۔ مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ جمہوری اصولوں کے مطابق پاکستان میں کبھی حقیقی جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں بھی پاکستانی عوام نے بہت سے مصائب کا سامنا کیا لیکن پھر بھی آمریت کے ادوار سے بہت بہتری دیکھنے میں آئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں بیان کرتے ہیں کہ وہ بڑے جدت پسند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ ان کے نظریات اور انداز فکر میں بھی بہت جدت تھی، انہوں نے ایک دفعہ کسی سیاسی جلسے میں شراب نوشی کی عادت کا برملا اظہار کر دیا تھا جس پر شدید عوامی احتجاج دیکھنے میں آیا حالانکہ بھٹو نے شراب نوشی پر پابندی لگا دی تھی لیکن علمائے کرام نے ان کے خلاف سخت ردِ عمل اپنائے رکھا۔ جنرل ضیاء الحق جن کو بھٹو نے ترقی دے کر آرمی چیف بنایا تھا، انہوں نے مارشل لاء لگا کر نوّے دن میں عام انتخابات کروانے کا اعلان کیا لیکن وہ نوّے دن گیارہ سال کے اقتدار میں بدل دیئے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے اس اعلان کے بعد کہا کہ پہلے احتساب کروایا جائے گا پھر انتخابات ہوں گے۔ آمریت کے اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی اور وطن پاک پھر سے آمریت کے دور میں چلا گیا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اس آمرانہ دور میں ان پر شراب پینے کے ساتھ ساتھ جوا کھیلنے کا بھی مقدمہ بنا دیا گیا تھا۔ غرض جنرل ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں مصنف حسب سابق زیادہ تر پریشان حال ہی رہے۔ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں حبیب جالب کو حکومت کی طرف سے جمہوری خدمات کے اعتراف میں پچاس ہزار روپے نقد انعام کا اعلان کیا گیا تھا لیکن مصنف نے رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے ادیبوں کو انعامات دینے کا اعلان کیا گیا، صوبہ پنجاب سے حبیب جالب کا انتخاب کیا گیا، انعامی رقم ایک لاکھ روپے تھی جبکہ ساتھ گولڈ میڈل بھی دیا جانا تھا۔ یہ انعامی رقم اور گولڈ میڈل وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو نے اپنے ہاتھ سے حبیب جالب کو دیا تھا جسے آپ نے قبول کر لیا تھا۔

''جالب بیتی'' میں مصنف نے اپنے دور کی اہم سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجزیات کا تفصیلی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف نے مختلف ممالک میں قیام کے دوران اپنے مشاہدات کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ حبیب جالب کی سرگزشت ایک ادبی شخصیت یا شاعر کی خودنوشت ہی نہیں بلکہ اس میں ان کی پاکستان میں حقیقی

جمہوریت کے خواب کو پورا کرنے کے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی مصائب و آلام سے بھرپور داستان بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ نامساعد حالات میں انہوں نے اپنے نظریات اور اصولوں کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا تھا۔ حبیب جالب اصولوں پر مبنی حقیقی جمہوریت کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کو مصنف کی خودنوشت پڑھتے ہوئے ان کے سیاسی معاملات پر بے لاگ تجزیات جابجا ملتے ہیں۔

''ہاں! میں باغی ہوں'' از جاوید ہاشمی

سابق وزیرِ صحت، مسلم لیگ ن کے قائم مقام صدر، ملتان کے ایک گاؤں مخدوم رشید میں جولائی ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔اے پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ مخدوم جاوید ہاشمی زمانہ طالبعلمی میں جماعت اسلامی کی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم رکن رہے اور ۱۹۷۱ء میں پنجاب یورنیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔

جاوید ہاشمی کی تحریر کردہ آپ بیتی ''ہاں! میں باغی ہوں'' ۲۰۱۳ء میں ساگر پبلشرز لاہور کے زیرِاہتمام شائع کی گئی۔ آپ بیتی ۱۴۳ ابواب میں منقسم ہے اور ۴۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی کے پہلے باب کا عنوان ''مخدوم رشید'' ہے۔ جس میں مصنف نے جن امور پر قلم فرسائی کی ہے ان میں سب سے پہلے مصنف نے اپنے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔ پہلے باب کے جن اہم نکات پر مصنف نے اپنا احوال بیان کیا ہے ان میں ''میری پہلی شعوری خواہش''، ''اللہ کے گھر سے پیغام''، ''جدِاعلیٰ کا مزار''، ''دارالندوہ''، ''میرا پہلا احتجاج''، ''پہلا سرکاری بلاوا''، ''اپنے قفس کی تیلیاں''، ''میرے اساتذہ''، ''سب سے بڑا استاد''، ''میرے والدِمحترم اور تحریک پاکستان'' اور ''رانا عبدالوحید کا خط میرے نام'' شامل ہیں۔ جاوید ہاشمی آپ بیتی میں اپنے گاؤں کی سماجی صورت حال کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''مزارشریف اور چوک بازار کے درمیان ڈیرہ ہے۔ یہ گاؤں کا ایک چھوٹا سا پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔ یہاں سارا دن مباحثہ جاری رہتا۔ مجلس خانے کی محفلوں میں مذہبی رنگ زیادہ ہوتا اور پکا ڈیرہ کی محفلوں پر علمی و سیاسی بحث کا رنگ۔''(۶۴)

اپنے گاؤں کی سماجی صورت حال کے تذکرہ کے بعد جاوید ہاشمی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کالج کے دور سے سیاست کا آغاز کردیا تھا۔ آپ بیتی میں کہتے ہیں کہ انہوں نے ایمرسن کالج ملتان سے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی جلسے، جلوسوں میں شریک ہونا شروع کر دیا تھا۔ مصنف اس دور میں مولانا مودودی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا مودودی کی تصانیف پڑھنے پر ایک دفعہ انہیں گھر سے نکل جانے کا حکم سنایا گیا کیونکہ آپ کے والد سخت گیر مسلم لیگی تھے۔ مصنف ذوالفقار علی بھٹو کی

تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۸ء میں کالج کا طالب علم تھا، آمریت کے خلاف جنگ میں دوسری مرتبہ سلاخوں کے پیچھے گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو تحریک شروع کر چکے تھے۔''(۶۵)

ذوالفقار علی بھٹو اس دور کی سیاسی صورت حال کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے جاگیرداروں اور وڈیروں سے اپنی سیاسی جماعت میں شامل ہونے کی درخواست کی کیونکہ بھٹو اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ مصنف اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''انہوں نے نظریاتی سیاست کی بجائے تاریخ کے پہیے کو الٹا گھمانا اور قوم کو شخصیت کے سحر میں گرفتار کرنا چاہا تو ان کے رویے اپنے سیاسی مخالفوں کے ساتھ ذاتی دشمنیوں میں تبدیل ہو گئے، اور آخر میں تو وہ تنہا رہ گئے اور انہی قوتوں کا سہارا لیا جو ہر تبدیلی کی دشمن ہوتی ہیں۔''(۶۶)

آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی صورت حال کو مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کے دوسرے باب بعنوان ''سیاسی تربیت گاہیں'' میں ذوالفقار علی بھٹو کی عملی سیاست کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات دستور ساز اسمبلی کے لیے ہوئے تھے اور دستور نہ بنانے کی صورت میں تو اسے خود بخود ہی تحلیل ہو جانا چاہیے تھا لیکن اسمبلی کو برخاست نہ کیا گیا۔ اسی دور میں ایک بہت بڑا المیہ پیش آیا کہ ہمارا ایک بازو یعنی مشرقی پاکستان الگ ہو گیا لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی جماعت کے اراکین نے اس موقع پر مٹھائیاں بانٹی تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور اقتدار کے آغاز کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

''۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں وزیراعظم بنے۔ ان سے بارہا مذاکرات ہوئے، وہ اپنے سیاسی مخالفین کو برداشت نہ کرتے تھے لیکن ہماری سخت باتیں بھی سن لیتے۔''(۶۷)

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے اہم سیاسی حالات کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ ان دونوں سالوں میں سیاسی جدوجہد عروج پر تھی کیونکہ اس دوران طلباء یونین کے انتخابات کا انعقاد ہونے جا رہا تھا اور حکومت کی مداخلت توڑ جوڑ کی صورت میں بہت زیادہ تھی۔ یونین کے انتخابات میں بھٹو اپنی کامیابی کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس وقت ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ سمن آباد سے دو یتیم بچیوں کو جب اغوا کر لیا گیا تو طلبا نے بچیوں کی بازیابی کے لیے گورنر ہاؤس پر حملہ کر دیا:

''بھٹو صاحب کے اقتدار میں ہمیں ایک اور آزمائش کا سامنا تھا۔ ہمیں مختلف

مقدموں میں ملوث کیا جاتا رہا۔ اسی دوران سمن آباد سے دو یتیم سید زادیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ہم نے گورنر ہاؤس پر دھاوا بول دیا۔ دروازے توڑ کر اندر داخل ہو گئے تو صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ہمارے گھیرے میں تھے۔"(۶۸)

درج بالا اقتباس میں سیاسی صورت حال کے تذکرہ کے بعد آپ بیتی "ہاں! میں باغی ہوں" کے دوسرے باب کے اہم عوامل جن پر مصنف نے اپنا قلم اُٹھایا، ان میں "پانچ یونیورسٹیاں"، "بھٹو، امید کی کرن"، "سنہرے بنگال کے آخری ایام"، "زندہ لاش"، "پتھر کا شہر۔۔۔ اسلام آباد"، "حکمران بھٹو سے معاملات"، "سمن آباد کی بچیوں کا اغوا"، "پنجاب یونیورسٹی کے انتخابات"، "شملہ معاہدہ کے مذاکرات"، "بنگلہ دیش نامنظور تحریک"، "شاہی قلعہ کی قید"، "پیر روشن ضمیر مولانا مودودی"، "امن کی فاختہ۔۔۔ مولانا ظفر احمد انصاری"، "ینگ پاکستانیز"، "لسانی فسادات"، "تحریک استقلال میں شمولیت"، "قومی اتحاد کا قیام"، "جنرل چشتی کا مشورہ"، "کابینہ میں حزب اختلاف"، "ذوالفقار علی بھٹو۔۔۔ سوئے تختہ دار"، "سائبان نہ رہا" اور "در کعبہ وا ہوتا ہے۔۔" شامل ہیں۔ باب دوم میں مصنف تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کے بعد تحریک نظام مصطفیٰ بھی زور و شور سے چلائی گئی تھی۔ اس تحریک کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کا اقتدار ڈگمگا گیا اور پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

"اقتدار کے ایوانوں میں یہ بحث جاری تھی کہ بھٹو صاحب کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا؟ بین الاقوامی دباؤ بتدریج بڑھنے لگا۔ عظیم اکثریت کی رائے تھی کہ موت کے فیصلے پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔"(۶۹)

درج بالا اقتباس میں بھٹو کی پھانسی کے بارے میں بیان کرنے کے بعد آپ بیتی کے باب سوم "زمینی سیاست وان کی انگار وادی" میں مصنف نے جن امور کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تاثرات کو پیش کیا ہے ان میں "مقامی سیاست"، "بلٹ نہیں بیلٹ"، "سپیکر کا انتخاب"، "آٹھویں ترمیم کی سیاہ رات" اور "ضیاء الحق کی ناراضگی" شامل ہیں۔ باب سوم کے آغاز میں مصنف نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے جنرل ضیاء الحق دور میں وفاقی وزیر بننے کے بعد استعفیٰ دے کر انتخابات کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جاوید ہاشمی ۱۹۷۹ء کے دور میں اپنی سیاسی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جولائی ۱۹۷۹ء کو میں نے وزارت سے استعفیٰ دے کر زمینی سیاست کی انگار وادی میں قدم رکھ دیا۔"(۷۰)

جنرل ضیاء الحق ۱۹۷۳ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم کا بل پاس کروانا چاہتے تھے۔ اس بل میں جنرل ضیاء الحق کو دوسرے اختیارات کے ساتھ ساتھ آئین پاکستان میں خود ترمیم کرنے کا بھی اختیار دیا جانا تھا۔ اس بل کو وزیر قانون اقبال احمد نے قومی

اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم کے لیے متعارف کروایا تھا۔ آٹھویں ترمیم کے اس بل کے خلاف اتنا بھرپور احتجاج کیا گیا تھا کہ حکومت کو مجبوراً یہ قانون واپس لینا پڑا تھا۔ اس قانون کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''یہ ایک خوفناک بل تھا، ہم نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا، حتیٰ کہ حکومت کو یہ مسودہ قانون واپس لینا پڑا اور ضیاء الحق صاحب تمام معاملات مذاکرات کے ذریعے طے کرنے پر آمادہ ہوگئے، ان سے ہمارے طویل مذاکرات ہوئے اور اس دوران نیا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔''(۷۱)

ضیاء الحق دور کی سیاسی صورت حال کو پیش کرنے کے بعد آپ بیتی کے باب چہارم میں مصنف نے جن امور پر روشنی ڈالی ہے ان میں جنرل ضیاء الحق کی فضائی حادثے میں شہادت، مصنف کی مسلم لیگ میں شمولیت اور میاں محمد نواز شریف کا بطور وزیراعظم انتخاب شامل ہیں۔ مصنف نے نومبر ۱۹۸۸ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق فضائی حادثے میں شہید ہو چکے تھے۔ جاوید ہاشمی اس دور کے سیاسی حالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب ضیاء الحق اس دنیا میں نہ رہے، نومبر ۱۹۸۸ء میں، مَیں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت محمد خان جونیجو کی شخصیت کی شریفانہ تاثر اور میاں نواز شریف کی متحرک شخصیت سے اس میں جان پڑ چکی تھی، اگرچہ دونوں شخصیات میں دوریاں موجود تھیں۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۲ء تک میں مسلم لیگ میں تھا۔''(۷۲)

مصنف مسلم لیگ کی سیاسی صورت حال کو بیان کرنے کے بعد بتاتے ہیں ۱۹۹۰ء میں جب میاں محمد نواز شریف نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالا تو جاوید ہاشمی کو بھی وزیر بنا دیا گیا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ نواز شریف نے مسلم لیگ کو ایک فعال سیاسی جماعت بنانے کے لیے بہت محنت سے کام کیا اور انہوں نے بہت جلد مسلم لیگ کو ایک منظم جماعت بنا دیا تھا۔ جنرل اسلم بیگ اور غلام اسحاق خان کو وزیراعظم نواز شریف ناپسند کرتے تھے۔ غلام اسحاق خان اپنے اختیارات کو وسعت دینے کے لیے پارلیمانی نظام میں صدارتی نظام داخل کرنا چاہتے تھے۔ میاں محمد نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت کے اہم سیاسی حالات کو جاوید ہاشمی نے بڑے مفصل انداز میں تحریر کیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''۱۹۹۶ء میں نواز شریف دوبارہ برسرِ اقتدار آئے تو چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت نے اقتدار میں فوج کا حصہ مانگنے کے لیے نیشنل سکیورٹی کونسل کی تشکیل کا مطالبہ کر دیا۔ نواز شریف نے ان سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ ان کے بعد پرویز مشرف چیف آف آرمی سٹاف بنائے گئے۔''(۷۳)

آپ بیتی میں مصنف نواز شریف دور میں ایٹمی دھماکوں کی صورت حال کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ جنرل جہانگیر کرامت بھی نواز شریف کی طرح ایٹمی دھماکے کرنے کے حامی تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نواز شریف پر بیرونی ممالک کا ایٹمی دھماکے نہ کرنے کا شدید دباؤ تھا۔ نواز شریف نے اس شدید بیرونی دباؤ کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے، قومی امنگوں کے عین مطابق ایٹمی دھماکے کرنے کا اعلان کر دیا۔ نواز شریف کے ایٹمی دھماکوں کے بارے میں طرزِ عمل پر مصنف لکھتے ہیں:

> ''۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۴ء تک بارہ سالہ دور ایک نئی مسلم لیگ کا دور ہے۔ میاں نواز شریف نے ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ میں ہر قدم پر ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے دوبارہ اقتدار میں آکر فوج کی بالادستی نہ کرنے کا اعلان کیا اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا نعرہ بلند کیا۔''(۷۴)

آپ بیتی کے باب پنجم میں جن اہم امور کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان میں ''نواز سے میری پہلی ملاقات''، ''اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام''، ''جراَت اور انکساری''، ''ایٹمی دھماکے کا فیصلہ''، ''صنعت کار جاوید ہاشمی یا گڈریا''، ''نیو ورلڈ آرڈر یا نیا سامراج''، ''تلک الایام نداولہا'' اور ''۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء مشکل وقت کے ساتھی'' اور ''آگ کا دریا'' شامل ہیں۔ جاوید ہاشمی نے اپنی آپ بیتی کے پانچویں باب میں ایٹمی دھماکے کرنے یا نہ کرنے کی سیاسی کشمکش کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ایٹمی دھماکہ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے کابینہ کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔۔۔ طویل بحث میں ''داناؤں'' کا پلہ بھاری ہو گیا۔ انہوں نے کہا اگر آپ نے ایٹمی دھماکہ کیا تو چند روز خوشی کے شادیانے بجیں گے، قوم بھنگڑے ڈالے گی۔ جب معاشی پابندیوں کا اطلاق ہوگا، تو عوام بلبلا اُٹھیں گے، ایٹمی دھماکہ کی حمایت کرنے والے دانشور ساتھ چھوڑ جائیں گے اور آپ تنہا کھڑے ہوں گے۔ بے شک ان کے دلائل بہت وزنی تھے۔ میں نے ایٹمی دھماکے کے حق میں طویل گفتگو کی۔''(۷۵)

آپ بیتی کے چھٹے باب بعنوان ''فوجی قیادت کا کردار میری نظر میں'' کے اہم عنوانات جن پر مصنف نے قلم فرسائی کی ہے ان میں ''جنرل ضیاء الحق سے پہلی اور آخری ملاقات''، ''غلط حکمت عملی کے نتائج، پاکستان کی سکڑتی سرحدیں''، ''فوجی حکومتیں اور انتظامیہ بریک ڈاؤن''، ''پرویز مشرف کی حمایت''، ''یحییٰ خان۔۔۔ صدر نکسن کا استاد''، ''آغا شاہی کا دورا امریکہ''، ''تنہا مسافر''، ''گرم پانی کی سیاست''، ''کعبہ میں حلف''، ''فوج کی حکمرانی کیوں؟'' اور ''قومی اور سیاسی اتفاق رائے میں سب سے بڑی رکاوٹ'' شامل ہیں۔ جاوید ہاشمی اس باب میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح افواجِ پاکستان نے بہادری اور شجاعت کی بہترین اور اعلیٰ مثالیں پیش کر کے دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ مصنف

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انتالیس سال پہلے میں نویں جماعت میں تھا ایوب خان نے تاریخی تقریر کی، وزیر آباد کے قریب، ہندوستان کے جہازوں نے ٹرین پر بمباری کی تھی اور بے گناہ لوگ شہید ہو گئے تھے۔اس تقریر نے پوری قوم میں جذبہ حریت بیدار کر دیا۔''(۷۶)

آپ بیتی میں جاوید ہاشمی نے اپنی سیاسی زندگی کے ماہ و سال کی داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ساتویں باب بعنوان ''جدوجہد کے پانچ سال ۲ ۱ر اکتوبر ۱۹۹۹ء سے ۱۲راکتوبر۲۰۰۴ء'' کے اہم عنوانات میں ''۱۲راکتوبر کا چشم دید گواہ''، ''محترمہ کلثوم نواز کی جدوجہد''، ''مسلم لیگ کی بقاء کی جنگ ور اے آر ڈی کا قیام''، ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ''، ''نیب کا آخری ملزم''، ''جیل سے انتخاب''، ''ایل ایف او کے خلاف جدوجہد''، ''آشیاں بجلی کی زد میں''، ''کل جماعتی کانفرنس'' اور ''عبقری کی موت اور اس کے بعد'' اہم ہیں۔جاوید ہاشمی اس باب میں ۱۲راکتوبر ۱۹۹۹ء کی سیاسی صورت حال کے بارے میں اپنے مشاہدات کو تحریر کرتے ہیں کہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا تھا اور ان کی جگہ جنرل ضیاء الدین بٹ کو تعینات کر دیا۔نواز شریف کے ان اقدامات کے خلاف فوج حرکت میں آ گئی انہوں نے وزیر اعظم ہاؤس کو چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا۔وزیر اعظم ہاؤس سے لے کر ایوان صدر تک فوجی ٹرکوں کی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مقدمات درج کر دیئے گئے۔مصنف نواز شریف کی جلاوطنی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''دسمبر میں میاں نواز شریف نے سعودی عرب جلاوطن ہونے سے پہلے مجھے پاکستان مسلم لیگ کا قائم مقام صدر مقرر کر دیا۔''(۷۷)

آپ بیتی کے آٹھویں باب بعنوان ''برصغیر کی تاریخ میں غداری کا پہلا مجرم'' کو مختصر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔اس میں مصنف کو ۲۹راکتوبر ۲۰۰۳ء کو پارلیمنٹ لاجز اسلام آباد سے گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس دور میں حکومت کی طرف سے مصنف کو دسویں مرتبہ گرفتار کیا گیا تھا۔نویں باب میں مصنف نے اپنے خلاف چلائے جانے والے مقدمات کا تفصیلی احوال بیان کیا ہے اور قید کے دوران مصائب و آلام کی داستان بیان کی ہے۔مصنف رقم طراز ہیں:

''مجھ پر ۴۰ سال کی سیاست میں سات سو سے زائد مقدمات قائم ہوئے ہیں، جن کا ذکر گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہو سکتا ہے۔ایوب خان سے لے کر پرویز مشرف تک ہر دور کا معتوب تھا۔بھٹو صاحب کے دور میں مَیں تنہا اذیتیں جھیل رہا تھا۔''(۷۸)

آپ بیتی کے دسویں باب ''تحریری عدالتی بیان'' میں مصنف نے جن عوامل کو تحریر کیا ہے ان میں ''اعترافِ جرم''،

''پہلا خودکش حملہ''، ''غدر کا قانون''، ''صدیوں کا قرض''، ''رات کی تاریکی میں مقدمہ''، ''زندان میں عدالت''، ''روشن مستقبل کا جلترنگ''، ''مسلمانوں کی عظیم طاقت'' اور ''پانچ سو سال کا خزانہ ہماری ذمہ داری'' وغیرہ اہم ہیں۔ آپ بیتی کے دسویں باب میں جاوید ہاشمی اپنے باغی ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر پاکستان کی مٹی سے وفاداری کا نام بغاوت ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جنم جنم کا باغی ہوں، اگرچہ مجھ پر غداری اور جعل سازی کا الزام پہلی بار لگا، مگر جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کا نام دے دیا گیا ہو اور جہاں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو غدار قرار دیا جاتا رہا، وہاں مجھے تسلیم ہے کہ میں بھی غدار ہوں۔''(۷۹)

جاوید ہاشمی نے گیارہویں باب کا عنوان ''بشریٰ کے نام'' تجویز کیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے اپنی بیٹی بشریٰ کے نام بارہ خطوط کو شامل کیا ہے۔ جن میں مختلف عوامل کے بارے میں انہوں نے اپنے تاثرات کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ بیتی کے بارہویں باب میں جاوید ہاشمی کی قومی اسمبلی میں کی جانے والی تقاریر کے اقتباسات کو درج کیا گیا ہے۔ تیرہویں باب میں مصنف نے ضمیمہ کے طور پر اپنے مقدمے کی کہانی اور استغاثہ کی زبانی بیان کیا ہے۔ اپنے خلاف مقدمے کے فیصلے اور ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کے بارے میں تفصیلات تحریر کی ہیں۔

''میری زندگی'' از شکیل بدایونی

شکیل بدایونی کی آپ بیتی ''میری زندگی'' بک ریڈرز دبستان بدایوں کراچی سے ۲۰۱۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس سرگزشت میں مصنف نے اپنی پیدائش ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک کی داستانِ حیات کو قلم بند کیا ہے۔ مصنف نے اس آپ بیتی کو دورانِ علالت تحریر کیا لیکن اسے شائع کروانے کی آپ کو مہلت نہ مل سکی اور آپ اس دارِفانی سے رُخصت ہو گئے۔ آپ کی نواسی آنسہ رضیہ شکیل کی خصوصی کاوش کے بعد اس آپ بیتی کو شائع کر کے منظرِ عام پر لایا گیا۔ مصنف کی پیدائش سن ہجری کے مطابق آپ کا نام غفار احمد رکھا گیا تھا، جس کو بعد میں گھر کے افراد نے تبدیل کر دیا اور آپ کا نام شکیل احمد پکارا جانے لگا۔ آپ کو بچپن سے ہی شاعری سے بہت لگاؤ تھا اس لیے آپ نے شاعری کے آغاز میں اپنا تخلص صبا اور پھر فروغ بھی رکھا تھا۔ آپ کے والد مولوی جمیل احمد قادری سوختہ تھے جو کہ خوجہ سنی مسجد بمبئی میں بیس برس تک خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔

شکیل بدایونی اپنی داستانِ حیات کا آغاز اپنے آبائی شہر بدایوں کی تاریخی اہمیت سے کرتے ہیں۔ بدایوں ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے۔ مسلم دور کی فتوحات سے پہلے یہاں بودھ اور ہندو راجاؤں کی حکمرانی رہی۔ مسلم عہد حکومت میں اس شہر کو اولیائے کرام کا شہر یعنی ''مدینۃ الاولیاء'' کہا جاتا تھا۔ یہاں کے نامور بزرگانِ اسلام میں حضرت سلطان العارفین، حضرت بدرالدین شاہ ولایت، حضرت خواجہ سید احمد، حضرت میراں جی، حضرت پیر مکہ، حضرت امیر ملتان، حضرت سید عرب، حضرت شاہ

فضل رسول، حضرت عبدالقادر، حضرت شاہ عبدالمقتدر قادری، حضرت مولانا شاہ عبدالقدیر قادری، حضرت مولانا عبدالماجد قادری، شاہ مذاق میاں، پیر شہید علی، پیر حضرت فتاح اور ہنسلی پیر شامل ہیں۔

آپ بیتی میں مصنف بدایوں شہر کی سماجی صورت حال کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ بدایوں قدیم زمانے سے ہی رسومات اور روایات کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں شادی خانہ آبادی اور مذہبی تقریبات میں ہندو مسلم رسومات کا امتزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس دور میں حجاموں اور حجامنیوں کا بھی بہت اہم کردار تھا۔ خوشی یا غم کی تقریبات میں ان کو بطور خاص بلوایا جاتا تھا۔ مصنف کے بچپن کے دور میں بدایوں شہر امن و آشتی کا گہوارہ تھا۔ یہاں ہندو مسلم اپنے اپنے تہوار مکمل مذہبی آزادی اور رواداری سے منایا کرتے تھے۔ ان دنوں شہر میں مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصب نام کو نہ تھا۔

مصنف اپنے بچپن کے دور کی سیاسی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان دنوں ''ستیہ گرہ'' اور ''عدم تعاون'' کی تحاریک جاری تھیں۔ انگریز حکومت کے خاتمے اور آزاد وطن کے حصول کے لیے ہندو مسلم سیاسی رہنما عملی مساعی میں مشغول تھے۔ ہندوستان میں بیداری شعور اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے سیاست دان میدان میں اتر رہے تھے۔ ان سیاست دانوں میں پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائداعظم محمد علی جناح پیش پیش تھے۔ اس دور کی سیاسی صورت حال کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی قوم بھی جو مختلف مذہبوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی ہے آپس میں متحد نہیں ہے۔ بے شمار جماعتیں اور بے شمار گروپ اپنے اپنے نظریات کے مطابق بنا رکھے ہیں۔ یہ تحفہ ہے انگریزی حکومت کا جو بھارت میں Divide & Rule کی پالیسی اختیار کر کے کامیابی سے حکومت کر رہی تھی۔''(۸۰)

ہندوستان میں انگریز آغاز ہی سے اپنے سنہرے اصول ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' پر عمل پیرا رہے۔ مصنف ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک دہلی شہر میں قیام پذیر رہے تھے اس لیے انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم سیاسی قائدین نے کانگریس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے دونوں اقوام کو مکمل طور پر سیاسی طور پر اتنا بیدار کر دیا ہے کہ اب آزادی کی منزل زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ مصنف جس دور میں فلم انڈسٹری میں نغمہ نگار کی حیثیت سے شامل ہو کر فلم ''درد'' کے گانے قلم بند کر رہے تھے، ان دنوں ہندوستان کو آزادی مل گئی تھی۔ آزادی کے بعد کے سیاسی و سماجی مسائل کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں:

> ''۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان بھی بن گیا۔۔۔ ملک کی تقسیم ہوتے ہی ملک میں زبردست ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا ہر جگہ اور ہر شہر میں خصوصاً پنجاب اور دہلی میں قتل و غارت گری عام ہو گئی۔''(۸۱)

تقسیمِ ہندوستان کے وقت مصنف کی بطور نغمہ نگار پہلی فلم ''درد'' کے گانے بہت مشہور ہوئے لیکن ہندو مسلم فسادات کی آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہجرت کے دوران ظلم و زیادتی کا بازار گرم کیا گیا، جس میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ مصنف اور ان کے ساتھیوں کو بھی بمبئی چھوڑ کر کچھ عرصہ بھوپال میں گزارنا پڑا۔ مصنف پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے پاکستان ہجرت کی غرض سے بحری جہاز کا ٹکٹ بھی خرید لیا تھا لیکن فلم انڈسٹری کے نامور موسیقار نوشاد کے کہنے پر اپنا ارادہ موقوف کر دیا اور اپنی نئی فلم ''میلہ'' کے گیت لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ اس فلم کے بعد آپ نے فلم ''کاجل''، ''دل لگی''، ''بابل''، ''دلاری''، ''انوکھی ادا''، ''آن''، ''امر''، ''مدرانڈیا''، ''چودھویں کا چاند''، ''گھرانہ''، ''بیس سال بعد''، ''کوہ نور''، ''مغلِ اعظم''، ''پھول اور پتھر''، ''میرے محبوب'' اور ''دو بدن'' کے گیت تحریر کیے جن کی بدولت آپ کو دنیا بھر میں شہرت کے ساتھ ساتھ بمبئی کے مشہور تعلیمی ادارے سینٹ زویر کالج کی طرف سے بہترین فلمی شاعر ۶۱۔۱۹۶۰ء، ۶۳۔۱۹۶۲ء اور ۶۷۔۱۹۶۶ء کے ایوارڈ دیئے جاتے رہے۔ آپ کو پہلا گولڈ میڈل ۱۹۴۸ء میں دیا گیا تھا اس کے علاوہ بہت سے میڈلز، ٹرافیاں، شیلڈز اور سرٹیفکیٹس دیئے جاتے رہے۔ آپ نے ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک تقریباً ایک سو فلموں کے گانے لکھے۔ شکیل بدایونی کا پہلا شعری مجموعہ ''رعنائیاں'' ۱۹۴۴ء میں شائع کیا گیا اس کے بعد دوسرا مجموعہ کلام ''صنم وحرم'' نعتیہ کلام ''نغمہ فردوس''، شعری تصانیف میں ''رنگینیاں''، ''شبستان'' اور ''کلیاتِ شکیل'' شامل ہیں۔

آپ بیتی کے آخر میں مصنف تحریر کرتے ہیں کہ آج کے جدید دور میں بہت سے ممالک بہترین تعلیمی نظام کی بدولت ترقی، کامیابی اور کامرانی حاصل کر چکے ہیں لیکن ہمارے ممالک میں غیر معیاری نظامِ تعلیم، اخلاقیات کا فقدان، رشوت، سفارش اور مذہبی منافرت کے باعث ترقی کی شرح بہت سست روی کا شکار ہے۔ قوم کی حقیقی فلاح اور بہبود کے لیے ان سماجی مسائل سے اب چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔

”عاشقی صبر طلب“ از ڈاکٹر رشید امجد

”تمنا بے تاب“ کے بعد رشید امجد کی دوسری آپ بیتی ”عاشقی صبر طلب“ کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۵ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا۔ سانجھ پبلی کیشنز کے اس پہلے ایڈیشن کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں ”تمنا بے تاب“ جو کہ پہلی بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی بعد میں اس کے دو مزید ایڈیشن ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکے تھے اس کو ”عاشقی صبر طلب“ آپ بیتی کے آغاز میں صفحہ نمبر ۱۲ سے صفحہ نمبر ۳۱۴ تک تحریر کر کے اس آپ بیتی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

رشید امجد کی آپ بیتی ”عاشقی صبر طلب“ میں پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کا مثالی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے ابتداء میں انہوں نے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کے کردار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کے بغیر کوئی ملک اقوام عالم میں ترقی کے خواب کی تعبیر حاصل نہیں کر سکتا۔ پاکستان کا شاید یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بحیثیت ایک ترقی پذیر قوم ہمیں آج اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ کوئی ملک تعلیم کے بغیر اکیسویں صدی کے عصری تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں موجودہ نظام تعلیم کے تناظر میں حکمرانوں اور سیاستدانوں کے کردار کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ”تعلیم پاکستانی حکمرانوں کی ترجیح کبھی بھی نہیں رہی۔ وہی لارڈ میکالے والا نظام تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ ابھی تک چل رہا ہے جس کا بنیادی مقصد حکمرانوں کے لیے وفادار سرکاری ملازم پیدا کرنا ہے۔“(۸۲)

جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے پاکستان کے بہت سے علاقوں میں تعیلم حاصل کرنا ایک خواب رہا ہے کیونکہ وڈیروں کا ماننا تھا کہ اگر ان کے علاقوں کے غریب لوگ چار جماعتیں پڑھ لکھ گئے تو پھر ان کی زمینوں کے لیے کام کرنے والے کہاں سے آئیں گے۔ بعض پاکستان کے قبائل کے سردار تو تعلیم حاصل کرنے کو باقاعدہ جرم قرار دیتے ہیں۔ پاکستان میں ہر نئی آنے والی حکومت اپنے ساتھ ایک نئی تعلیمی پالیسی بھی لے کر آتی ہے اور پرانی تعلیمی پالیسیوں کو غلط قرار دیتی ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ بہتر اقدامات اُٹھائے گئے تھے لیکن وہ بھی صرف جامعات کی حد تک تھے۔ نچلی سطح یعنی پرائمری، مڈل اور ہائی سکولوں کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے جن انقلابی کوششوں کی ضرورت تھی ان کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ مؤثر تعلیم کے لیے منظم نصاب سازی بھی وقت کا اوّلین تقاضا ہے۔ نصاب سازی میں بڑی احتیاط سے مؤثر تبدیلیاں کر کے ہی ہم اکیسویں صدی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کی سماجی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے مصنف نے تعلیم کے شعبہ میں نصاب سازی میں بہتری لانے کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

نصاب سازی کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

''پاکستان میں نصاب سازی بہت ہی مشکل کام ہے، اس میں کئی لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں ایک طبقہ وہ ہے جو فکری سطح پر تبدیلی کا خواہاں نہیں کیونکہ اس طرح شعور میں تبدیلی آ جائے گی۔''(۸۳)

ملک کی تعلیمی پستی اور زوال کی تصویر کشی کے بعد پاکستان کے سماجی مسائل کے حوالے سے مصنف نے اپنے تاثرات کا اظہار بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جہاں پاکستان میں تعلیمی صورت حال انحطاط کا شکار ہے وہاں ہر شعبہ میں رشوت، سفارش، اقربا پروری اور بدانتظامی کی انتہا ہو چکی ہے۔ مصنف آپ بیتی میں پاکستان کی شعبہ جاتی بدانتظامی کے مسئلہ پر رقم طراز ہیں:

''پاکستان کا سب سے بڑا المیہ بدانتظامی ہے۔ گڈ گورنس کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حالی نے کہا تھا کہ برائی اوپر سے نیچے آتی ہے۔ پاکستان میں یہی ہوا ہے۔ اوپر والا طبقہ خود کو کسی بھی قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔''(۸۴)

رشید امجد نے پاکستان کی سیاسی صورت حال کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیاسی صورت حال کے ساتھ ساتھ سماج پر بھی گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے مصنف آپ بیتی میں کبھی سماجی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہیں اور ایک عام آدمی کو پیش آنے والے مصائب کی کہانی بیان کرتے ہیں تو کبھی سیاست کے نشیب و فراز کا کچا چٹھا کھول دیتے ہیں:

''دراصل پاکستانی سیاست پر ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' کی اصطلاح پوری اترتی ہے۔ اس صورت حال سے فوجی افسر اور اعلیٰ بیوروکریسی پورا فائدہ اُٹھاتی ہے۔۔۔ جرنیلوں نے تو اب بزنس شروع کر دیے ہیں۔''(۸۵)

پاکستان کے معاشی وسائل پر چند خاندانوں کی اجارہ داری ہے۔ جس کی وجہ سے آج کے دور میں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ بے رحم امیر طبقہ نچلے طبقات سے زندہ رہنے کے لیے معمولی سے وسائل کا حصہ دینے سے بھی انکاری ہے۔ دنیا کے دوسرے بڑے ممالک میں طبقات موجود ہیں لیکن وہاں اس طرح کی سماجی صورت حال موجود ہے۔ جس سے غریب طبقے میں اپنی زندگی کو گزارنے کی کم از کم سکت تو موجود ہے لیکن ہمارے ہاں اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ ہے۔ آپ بیتی میں مصنف اس مسئلہ کے حل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پاکستان کا بنیادی مسئلہ خراب نظام حکومت ہے اور اس کی تمام تر اور مکمل ذمہ داری حکمران طبقے پر عائد ہوتی ہے جو نااہل کرپٹ سیاسی خانوادوں، جاگیرداروں،

بیوروکریسی، صنعت کاروں اور فوج پر مشتمل ہے۔ فوج سے مراد اوپر کی سطح کے لوگ ہیں۔ یہ ایک پاور گروپ ہے جو صرف چہرے بدلتا ہے، نظام میں تبدیلی نہیں آنے دیتا۔ نظام میں تبدیلی درمیانے درجے کے لوگ لا سکتے ہیں، جن کے اقتدار میں آنے کے مواقع دور دور تک نہیں۔"(۸۶)

آپ بیتی میں رشید امجد بیان کرتے ہیں کہ جب وہ ۲۰۰۲ء میں اپنی پہلی آپ بیتی "تمنا بے تاب" تحریر کر رہے تھے تو وہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت پرامید تھے لیکن ۲۰۱۵ء میں جب اپنی دوسری آپ بیتی "عاشقی صبر طلب" کو مکمل کرتے ہوئے انہیں مایوسیوں اور اداسیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے کیونکہ ان کو پاکستان کے روشن مستقبل کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ عہد حاضر میں دنیا کی مختلف اقوام تعمیر و ترقی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں لیکن لمحہ فکریہ ہے کہ ہم آج بھی بہت سے مسائل کی بنا پر تنزل کا شکار ہیں۔ رشید امجد آپ بیتی میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"پاکستان کو مسائلستان بنانے میں سب سے اہم کردار ہمارے سیاسی نظام کا ہے۔ پانچ چھ سو خاندان، فوج اور بیوروکریسی اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ پہلے باپ الیکشن لڑتا تھا، اب پوتا اس کی جگہ آ گیا ہے۔ اسمبلیوں پر انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ اب مذہبی رہنما بھی حصہ دار بن گئے ہیں۔"(۸۷)

موروثی سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے انہوں نے اسے بہت بڑا سیاسی مسئلہ قرار دیا ہے۔ مصنف کے خیال میں پاکستان کے بہت سے مسائل کی اصل وجہ ملک میں بار بار لگنے والے مارشل لاء بھی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر آمر نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی حکمرانی کو طول دینے کے لیے ایسے اقدامات کیے ہیں جن کے باعث ملکی مفادات کو نقصان پہنچا ہے۔ اس حوالے سے رشید امجد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پاکستان آج جن مسائل سے دوچار ہے ان کی بنیاد ضیاء الحق نے رکھی۔ افغانستان کے بارے میں اس کی غلط پالیسیوں نے آج ہمارے لیے مصیبتیں پیدا کر دی ہیں۔"(۸۸)

آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی صورت حال کو بھی گاہے گاہے بیان کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں مصنف قیام پاکستان کے بعد کی سیاسی کشمکش کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کی پہلی غلطی شاید یہ تھی کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنایا گیا تھا۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ ہم نے بیوروکریٹس کو اپنا حکمران مان لیا اور انہوں نے اس دور میں اقتدار کی بندر بانٹ شروع کر دی تھی۔ مصنف آپ بیتی میں مختصر انداز میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی حکمرانوں میں پہلا دور تو بیوروکریسی اور ان سیاستدانوں کے اشتراک کا ہے۔اس کے بعد ایوب کا دور شروع ہوا۔ایوب روشن خیال شخص تھا۔''(۸۹)

بھٹو دور حکومت کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد رشید امجد کی آپ بیتی میں مربوط انداز میں پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات پر تجزیات کو بیان کیا گیا ہے جو کہ خاصے کی چیز ہیں۔مصنف نے نہ صرف قیام پاکستان سے پہلے کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد کے ملکی مسائل کو بڑی تفصیل سے جامع طور پر آپ بیتی کا حصہ بنا دیا ہے۔رشید امجد آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ''آزادی کے بعد بھی ہمارے خوابوں کو تعبیر نہ ملی۔سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کا دور کسی نہ کسی صورت جاری ہی رہا۔قیامِ پاکستان کے بعد مہاجنوں کا نیا طبقہ وجود میں آ گیا۔پہلے اس کے نام ہندوانہ تھے،اب مسلم ہو گئے۔۔۔ہمیں چاہیے کہ اس کے نظام پر غور کر لیں۔''(۹۰)

رشید امجد نے آپ بیتی میں حقائق کو بڑی غیر جانبداری اور صداقت سے بیان کیا ہے اور مربوط انداز میں پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔پاکستان کی سیاست میں ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ نواز شریف بھی صدر جنرل ضیاء الحق کا پروردہ تھا لیکن ایک دفعہ برطرف ہونے کے بعد جب وہ دوسری دفعہ الیکشن میں کامیاب ہو کر وزیر اعظم کا منصب سنبھالا تو اس نے فوج کو اپنے کنٹرول میں کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔اگر وہ فوج کو کنٹرول میں کرنے کے لیے چند بنیادی غلطیوں کے ساتھ ساتھ جلد بازی سے کام نہ لیتا تو شاید اپنے سیاسی مقاصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔نواز شریف کی منتخب حکومت کے خاتمے کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''مجھے نواز شریف سے کوئی محبت نہیں، بلکہ ایک حوالے سے میں اس کے مخالفین میں شامل ہوں لیکن ۱۲ اکتوبر کا فوجی ایکشن میری تذلیل ہے۔اس نے اس صداقت پر مہر لگا دی کہ پاکستان میں ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔''(۹۱)

آپ بیتی میں ہمارے ملک میں بار بار مارشل لاء کی صورت حال کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے اور ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کے بارے میں لکھتے ہیں جیسے سود خوری، رشوت ستانی، سفارش، جھوٹ، ملاوٹ، تعصب، اقربا پروری اور بددیانتی کا ہمیشہ سے بازار گرم رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب معاشرہ کے افراد میں اس قسم کی برائیاں پائی جائیں گی تو معاشرہ جہنم کدہ بن جاتا ہے۔آپ بیتی میں مصنف ان معاشرتی برائیوں کو ختم یا کم کرنے کے لیے خوف کے تاثر کے برے میں لکھتے ہیں:

''کسی معاشرے میں چار طرح کے خوف ہوتے ہیں۔ اول قانون کا خوف، دوسرے معاشرے کا ڈر یا دباؤ، تیسرے ضمیر کا خوف اور چوتھا خدا کا خوف۔ ہمارے معاشرے سے یہ چاروں خوف ختم ہو چکے ہیں۔ قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔''(۹۲)

درج بالا عبارت میں پاکستان میں موجود سماجی خرابیوں کی صورت حال مثالی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ بیتی میں مصنف پاکستان کے حکمرانوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ہمارے ملک کے اصل حکمران افواجِ پاکستان کے جرنیل ہیں کیونکہ میجر جنرل سکندر مرزا کے دور سے جو فوجی مداخلت شروع ہوئی تھی اس نے آہستہ آہستہ ایک منظم اور مربوط صورت اختیار کر لی ہے اور فوج ایک باقاعدہ سیاسی قوت بن گئی ہے۔ یہ قوت کبھی مارشل لاء کے روپ میں تو کبھی سول حکومت کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنف جنرل پرویز مشرف کی شخصیت اور سوچ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میں نے کبھی کسی جرنیل کی بطورِ حکمران حمایت نہیں کی، بلکہ بساط بھر ہمیشہ مارشل لاء کے خلاف لکھا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنرل پرویز مشرف ایک روشن خیال شخص تھے۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ ان کے سیاسی اور حکومتی نظریات سے قطع نظر وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں روشن خیالی کو فروغ ملے۔''(۹۳)

رشید امجد نے آپ بیتی میں پاکستان کے مسائل سے اپنی قوم کو آگاہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان مسائل کی وجوہات اور اسباب کو بھی تحریر کر دیا ہے کہ کس طرح وطن عزیز سے ان مسائل کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ مصنف اقرباء پروری اور نااہل قیادت کے طرزِ عمل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کسی ایک شخص یا جماعت کے بس میں نہیں کہ اس نظام کو ٹھیک کر دے۔ شخص کوشش کرے گا تو راتوں رات مروا دیا جائے گا۔ جماعت اس لیے نہیں کر سکتی کہ ہر جماعت جاگیرداروں، وڈیروں، صنعت کاروں، ریٹائرڈ جرنیلوں اور ریٹائرڈ بیوروکریسی پر مشتمل ہے۔''(۹۴)

رشید امجد کہتے ہیں کہ پاکستان میں اکثر سیاست دان نظام میں تبدیلی کے نعرے لگواتے نظر آتے ہیں لیکن ان سیاست دانوں کو تبدیلی یا انقلاب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔ ہر قوم کا اپنا ایک نظامِ حیات ہوتا ہے جو اس قوم میں نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ کسی قوم کے طرزِ حیات میں بنیادی تبدیلیاں فوراً نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ آہستہ آہستہ زمانے کے مجموعی طرز کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جن کی بنیاد پر ہم ایک دور کو دوسرے دور سے الگ الگ کر کے ان کی پہچان کر

سکتے ہیں۔ان معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں مصنف نے اپنی آپ بیتی میں پاکستانی اقتصادیات میں دیکھی جانے والی نام نہاد تبدیلی کے بارے میں لکھا ہے:

''مشرف دور کے وزیراعظم شوکت عزیز نے کہا تھا کہ میرے دور میں پاکستان اقتصادی ترقی کے عروج پر ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ موبائل فون کروڑوں میں چلے گئے ہیں۔ یہی احمقانہ بات اس وقت ہوئی ہے کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے موبائل فون کی تعداد ایک کروڑ ہونے پر کیک کاٹا۔''(۹۵)

رشید امجد نے بیان کیا ہے کہ معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے ملک میں خصوصاً جنرل پرویز مشرف کے دور میں روشن خیالی اور ماڈرن ازم کا ایسا بھوت سوار ہوا تھا، جس سے معاشرے کی سماجی صورت حال پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔اس حوالے سے مصنف آپ بیتی میں یوں رقم طراز ہیں:

''خواتین کی ایسی اکثر تنظیمیں بیگمات چلاتی ہیں اور ان کے نزدیک کپڑے اتارنا ہی ماڈرن ازم ہے۔''(۹۶)

نام نہاد ماڈرن ازم کو ہدفِ تنقید بنانے کے بعد رشید امجد آپ بیتی میں مارشل لاء کے بارے لکھتے ہیں کہ مارشل لاء کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پورے سماجی نظام کو اندر اور باہر سے اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ سماج کی حقیقی شکل مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر مارشل لاء بنیادی سیاسی ڈھانچے کو مکمل طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور جمہوری نظام کی جگہ ایسا سیاسی نظام وجود میں لاتا ہے، جس کی بنیادیں نہ زمین پر ہوتی ہیں اور نہ ہی آسمان پر بلکہ وہ خلاء میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے مارشل لاء کے ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

''ضیاء اور مشرف کے مارشل لاؤں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ضیاء دور میں مارشل لاء کا جبر ظاہری سطح پر موجود تھا۔''(۹۷)

رشید امجد مارشل لاء کے مختلف خدشات اور محسوسات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آمریت اس خوف کی مانند ہے جو ظاہری یا باطنی صورت میں قوم کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات کو متاثر کرتی ہے۔ مارشل لاء چاہے ظاہر طور پر کتنا ہی معاشرتی ہم آہنگی اور روشن خیالی پر مبنی ہو دراصل حقیقت میں اگر اس کے تمام عوامل کا گہرا مشاہدہ کیا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ اس میں تو ہر طرف جبر، ظلم اور زیادتی کا ہی بازار گرم کیا گیا تھا:

''۱۹۹۹ء کے مارشل لاء نے خاموش اور غیر محسوس طریقے سے پاکستانی معاشرت کو اندر سے کھوکھلا کیا۔اس دور میں لکھے جانے والے ادب میں یہ کھوکھلا پن اور اس کا

دکھ واضح اور غیر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔"(۹۸)

سیاسی و سماجی عوامل سے بھرپور رشید امجد کی آپ بیتی اپنے عہد کی ایک مکمل تاریخ بیان کرتی ہے۔ معاشرتی رویوں کے بدلتے ہوئے احساسات اور جذبات کی آئینہ دار اس آپ بیتی میں مصنف نے پاکستانی سیاسی تاریخ کے تمام ادوار کو اپنے بھرپور تجزیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملکی سیاست پر ان کی گہری نظر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ رشید امجد کی شخصیت میں ایک سیاسی ناقد کی خصوصیت بھی موجود ہے۔ بحیثیت ایک معلم ان میں ایک گہرا سیاسی شعور بھی موجزن دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ملک میں بار بار مارشل لاء کو جمہوری اقدار کے لیے زہر قاتل قرار دیا ہے اور مارشل لاء کی سیاست کرنے والوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ پاکستان میں جمہوری ادوار کا اگر دورانیہ دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ دو سے چار سال دیکھنے میں آتا ہے جبکہ اس کے برعکس آمریت پر مشتمل حکومتوں کا دورانیہ دس سال تک بھی رہا ہے۔ رشید امجد نے اپنی آپ بیتی میں پاکستان کو درپیش بہت سے مسائل کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس آپ بیتی کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو بے لاگ طریقے سے اور مکمل صداقت سے ہمارے سامنے بیان کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میاں منظور احمد وٹو، جرم سیاست، لاہور: احمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص:۱۸۹

۲۔ ایضاً، ص:۱۵۳

۳۔ ایضاً، ص:۱۵۴

۴۔ ایضاً، ص:۲۳۳

۵۔ رشید امجد، عاشقی صبر طلب، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۷

۶۔ ایضاً، ص:۳۳

۷۔ ایضاً، ص:۳۶

۸۔ ایضاً، ص:۴۳۔۴۴

۹۔ ایضاً، ص:۳۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۳۱۲

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۱۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۷۸

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۵۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۳۰۔۱۳۱

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۲۹۔۲۳۰

۱۹۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریباں چاک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۸

۲۰۔ ایضاً، ص:۴۸

۲۱۔ ایضاً، ص:۴۹

۲۲۔ ایضاً، ص:۷۷

۲۳۔ ایضاً، ص:۸۸

۲۴۔ ایضاً،ص:۱۰۸

۲۵۔ ایضاً،ص:۱۰۸

۲۶۔ ایضاً،ص:۱۱۳

۲۷۔ ایضاً،ص:۱۱۴۔۱۱۵

۲۸۔ ایضاً،ص:۱۳۱

۲۹۔ ایضاً،ص:۱۶۸

۳۰۔ ایضاً،ص:۱۸۰

۳۱۔ ایضاً،ص:۱۸۵

۳۲۔ ایضاً،ص:۱۸۶

۳۳۔ ایضاً،ص:۱۸۹

۳۴۔ ایضاً،ص:۱۹۰

۳۵۔ ایضاً،ص:۱۹۱

۳۶۔ ایضاً،ص:۱۹۲

۳۷۔ ایضاً،ص:۱۹۴

۳۸۔ ایضاً،ص:۱۹۷

۳۹۔ ایضاً،ص:۲۰۱

۴۰۔ ایضاً،ص:۲۸۱۔۲۸۲

۴۱۔ ایضاً،ص:۳۰۸

۴۲۔ صدیقی،مہدی علی، بلاکم وکاست، کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی،۲۰۰۲ء،ص:۳۴

۴۳۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،نشانِ جگر سوختہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص:۳۴

۴۴۔ ایضاً،ص:۵۷

۴۵۔ ایضاً،ص:۵۸

۴۶۔ ایضاً،ص:۶۰

۴۷۔ ایضاً،ص:۱۴۸

۴۸۔ ایضاً،ص:۱۷۵

۴۹۔ ایضاً،ص:۲۰۸
۵۰۔ ایضاً،ص:۲۶۶
۵۱۔ ایضاً،ص:۲۶۷
۵۲۔ ایضاً،ص:۲۶۷
۵۳۔ ایضاً،ص:۳۰۸
۵۴۔ یوسف رضا گیلانی، چاہِ یوسف سے صدا، لاہور: نگارشات پبلشرز،۲۰۰۶ء،ص:۸۳
۵۵۔ ایضاً،ص:۱۳۸
۵۶۔ ایضاً،ص:۱۹۷
۵۷۔ ایضاً،ص:۲۰۷
۵۸۔ ایضاً،ص:۲۶۰-۲۶۱
۵۹۔ ایضاً،ص:۲۶۲
۶۰۔ ایضاً،ص:۹
۶۱۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت سوم، لاہور: نیاز زمانہ پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء،ص:۲۳
۶۲۔ ایضاً،ص:۲۶
۶۳۔ حبیب جالب، جالب بیتی، لاہور: طاہر سنز پبلشرز،۲۰۱۳ء،ص:۳۵
۶۴۔ جاوید ہاشمی، ہاں! میں باغی ہوں، لاہور: ساگر پبلشرز،۲۰۱۳ء،ص:۳۳۔۳۴
۶۵۔ ایضاً،ص:۴۷۔۴۸
۶۶۔ ایضاً،ص:۴۸
۶۷۔ ایضاً،ص:۵۵
۶۸۔ ایضاً،ص:۵۶
۶۹۔ ایضاً،ص:۷۵
۷۰۔ ایضاً،ص:۸۷
۷۱۔ ایضاً،ص:۹۳
۷۲۔ ایضاً،ص:۱۱۷
۷۳۔ ایضاً،ص:۱۱۸

۷۴۔ ایضاً، ص:۱۱۹

۷۵۔ ایضاً، ص:۱۲۸

۷۶۔ ایضاً، ص:۱۳۶۔۱۴۷

۷۷۔ ایضاً، ص:۱۶۷

۷۸۔ ایضاً، ص:۲۰۵

۷۹۔ ایضاً، ص:۲۲۷

۸۰۔ شکیل بدایونی، میری زندگی، کراچی: بک ریڈرز کلب دبستان بدایوں، ۲۰۱۴ء، ص:۲۰

۸۱۔ ایضاً، ص:۲۷

۸۲۔ رشید امجد، عاشقی صبر طلب، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۳۱۷

۸۳۔ ایضاً، ص:۳۲۲

۸۴۔ ایضاً، ص:۳۲۲۔۳۲۳

۸۵۔ ایضاً، ص:۳۲۳

۸۶۔ ایضاً، ص:۵۶۲

۸۷۔ ایضاً، ص:۴۱۰

۸۸۔ ایضاً، ص:۳۲۶

۸۹۔ ایضاً، ص:۳۳۵

۹۰۔ ایضاً، ص:۳۰۵

۹۱۔ ایضاً، ص:۳۰۴

۹۲۔ ایضاً، ص:۳۳۳۔۳۳۵

۹۳۔ ایضاً، ص:۳۳۶۔۳۳۷

۹۴۔ ایضاً، ص:۳۳۶

۹۵۔ ایضاً، ص:۳۴۷

۹۶۔ ایضاً، ص:۳۴۷۔۳۴۸

۹۷۔ ایضاً، ص:۴۷۱

۹۸۔ ایضاً، ص:۴۷۱۔۴۷۲

باب چہارم

خواتین کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال کا عمومی جائزہ

باب چہارم

خواتین کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کا عمومی جائزہ

اُردو ادب میں خودنوشت ہی واحد ایسی صنف ادب ہے جس میں آغاز تا اختتام مصنف ہی قارئین کے لیے مرکز نگاہ ہوتا ہے۔ مصنف کے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ حالات و مشاہدات، زندگی کے یادگار واقعات ہی بطور خاص آپ بیتی کا حصہ بنتے ہیں۔ خودنوشت سے عام تاثر ہمیں یہی ملتا ہے کہ مصنف کی زندگی کے اہم خدوخال قاری کے سامنے آ جاتے ہیں لیکن اس کی اہم خاصیت یعنی سچائی جب تک کسی آپ بیتی میں شامل نہ ہو تب تک ایسا خیال کرنا محض خوش فہمی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مصنف اپنی آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے ذاتی انکشافات بھی کرتا ہے جو کہ خودنوشت کو چار چاند لگانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اُردو ادب میں خواتین آپ بیتی نگاروں کی تعداد محض آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ راقم کے نزدیک اس کی بہت سے وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن ان میں سب سے اہم ہمارے معاشرے میں اخلاقی جرأت کی کمی اور اظہارِ بیان کا فقدان ہی دکھائی دیتا ہے۔ متذکرہ اسباب کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہمارے سماج میں شاید جتنی آزادی مرد کو حاصل ہے وہ خواتین کو تاحال میسر نہیں آ سکی۔ چادر اور چاردیواری کی مجبوریوں میں فکرِ دُنیا کی متلاشی ہونا شاید ایک معیوب سی بات سمجھی جاتی ہے۔ معاشرتی حدود و قیود کی بدولت خواتین کے علاوہ مرد حضرات سے بھی مادر پدر آزاد اور بے باک تحریروں کی توقع خام خیالی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ سماجی، مذہبی اور تہذیبی قدغن کے باوجود چند خواتین اور حضرات نے آزادیِ اظہار کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بہت سے شاندار ادبی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں جو کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ عموماً ان آپ بیتیوں میں چاردیواری کے اندر کی دُنیا کے مشاہدات اور تجزیات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان تحاریر میں بلاشبہ تعلیمِ نسواں اور بے جا معاشرتی پابندیوں سے آزادی کی عملی مسائل کے پہلوؤں کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

خواتین کی آپ بیتیوں کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کثیر تعداد میں تحریر کردہ آپ بیتیاں طے شدہ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں انہوں نے اپنی رقص گاہ حیات میں جن عوامل کو موضوعِ بحث بنایا ہے ان میں اہم خاندانی پس منظر میں ان کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ رہن سہن، خانگی امور کی بجاآوری، مختلف ادوار کے سیاسی و سماجی

حالات و واقعات، غربت و افلاس زدہ طبقات کا احوال، مردوں کے معاشرے سے بغاوت کے عوامل، خواہشات کا حسرتوں کا روپ ڈھالتے رہنا، ناممکن سے ممکن تک کے اسفار، صنفی امتیازات کا اظہار اور بے باک طرزِ فکر کا تفصیلی اظہار جابجا ملتا ہے۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں بلاشبہ بے بسی کی تصاویر کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود ناہمواریوں کی داستانیں بھی قاری کو پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اجیت کور کی تحریر کردہ آپ بیتی ''خانہ بدوش'' میں خواتین کی سماجی مجبوریوں کو ہندوستانی طرزِ معاشرت کے تناظر میں یوں پیش کیا گیا ہے:

''گناہ اوّل۔ عورت ہونا

گناہ دوم۔ اکیلی ہونا

گناہ سوم۔ اکیلی اور روٹی خود کماتی عورت ہونا

گناہ عظیم ترین۔ اپنی روٹی خود کماتی، ذہین، خوددار

اکیلی عورت اس فرشتوں کے ملک ہندوستان میں۔''(۱)

مصنفہ نے اقتباس میں خواتین کی سماجی صورت حال کی مخصوص چند سطور میں عکاسی کی ہے کہ کس طرح برسرِ روزگار خواتین کو معاشرہ عجیب نظروں سے دیکھتا آیا ہے۔ اس طرح کے سماجی رویوں سے خواتین کو آئے روز دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عام طور پر تاثر یہی پیدا کیا جاتا ہے کہ خواتین کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ معاشرے میں مرد کے سہارے کے بغیر لاچار اور بے بس ہیں۔

''رسیدی ٹکٹ'' از امرتا پریتم

امرتا پریتم ۳۱ راگست ۱۹۱۹ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تصانیف میں ناول، کہانیاں، شاعری اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ تقسیم ہند کے موضوع پر ان کے مشہور زمانہ ناول ''پنجر'' پر فلم بھی بنائی جا چکی ہے۔ آپ کی آپ بیتی دو حصوں میں شائع کی گئی ہے۔ حصہ اوّل کو ۱۹۷۶ء میں ''رسیدی ٹکٹ'' کے عنوان سے جبکہ حصہ دوم کو ''لال دھاگے کا رشتہ'' کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔ آپ کے ان دونوں حصوں کو بعد میں یکجا کر کے ''جنم جنم کی داستان'' کے عنوان سے شائع کروایا گیا۔

مصنفہ اپنی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' کے عنوان کے بارے میں تحریر کرتی ہیں کہ ان کی زندگی میں بیتنے والے واقعات، احساسات اور جذبات کو انہوں نے اپنی نظموں، کہانیوں اور ناولوں میں بیان کر دیا ہے، لیکن ان کے علاوہ کچھ سطور ابھی لکھنا باقی تھیں۔ جنہیں انہوں نے بہت اختصار سے کام لے کر اپنی داستانِ حیت کے صفحات میں سمو دیا ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ انہوں

نے اپنی زندگی کے حساب کتاب کے اوراق پر ایک رسیدی ٹکٹ لگا کر اپنی آپ بیتی کو ہر عام و خاص تک پہنچا دیا ہے۔

مصنفہ آپ بیتی میں اپنی پہلی بغاوت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ ان کے بچپن کا وہ دور تھا جب ان کی نانی اماں کا راج گھر کی بجائے باورچی خانے میں چلتا تھا۔ باورچی خانے کی ایک پڑچھتی پر تین عدد گلاس، ایک الگ کونے میں دھرے رہتے تھے۔ ان کا استعمال صرف اس وقت کیا جاتا تھا جب ان کے والد کے مسلمان دوست گھر پر آتے تھے۔ مصنفہ نے ضد پکڑ لی کہ وہ ان گلاسوں کے علاوہ اور کسی برتن میں دودھ اور پانی نہیں پئیں گی۔ جب یہ تمام صورت حال کا آپ کے والد کو علم ہوا تو مصنفہ کی یہ بغاوت کامیاب رہی اور اس دن کے بعد کوئی برتن ہندو رہا اور نہ مسلم۔ حالانکہ ان دنوں ہندو مسلم معاشرے میں یہ عام چلن تھا کہ ہندوؤں کے گھرانوں میں مسلمانوں کے لیے الگ برتن رکھے جاتے تھے اور اکثر مسلم ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے علیحدہ برتنوں کا استعمال کیا کرتے تھے۔

ہندوستانی اقوام کے درمیان فروعی اختلافات کو انگریز حکومت نے اتنی ہوا دی کہ بالآخر رواداری کا آتش فشاں کئی مرتبہ اگل پڑا اور اس کے لاوے کی زد میں جو کوئی بھی آیا اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ آپ بیتی میں مصنفہ بالخصوص اقوام کے درمیان عدم برداشت اور ظلم کے اس روپ کی کئی بار بھیانک ترین صورت کو ہندوستان کی تقسیم ۱۹۴۷ء کے دور میں بیان کرتی ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کانچ کے نازک برتن کی مانند ٹوٹ کر بکھرتی گئی تھیں۔ ہجرت کے دوران مصنفہ نے اپنی آنکھوں سے لاشوں کے انبار، ظلم و ستم کی کئی ایک داستانیں اور بہت سے ایسے لوگ دیکھے جو کسی وجہ سے قتل ہونے سے بچ گئے تھے لیکن ان کا وجود زندہ لاش کی مانند دکھائی دیتا تھا کیونکہ ان کے رشتہ داروں کو لقمہ اجل بنا دیا گیا تھا۔ امرتا پریتم نے اپنے عہد کے سماج میں خواتین کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو مفصل انداز میں اپنی پنجابی نظموں میں سمو کر بیان کر دیا ہے:

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول!
اک روئی سی دھی پنجاب دی، تو لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ درد منداں دیا دردیا! اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں، تے لہو دی بھری چناب(۲)

امرتا پریتم کا کہنا ہے کہ میرے من کی عورت ہمیشہ سے میرے اندر کی دوسری ادیب عورت سے ثانوی حیثیت کی ہی حامل رہی۔ ان کی زندگی میں صرف تین مواقع ایسے آئے تھے جب ان کے اندر کی خالص عورت کو واضح انداز میں دیکھنے کا

انہیں موقع مل سکا تھا۔ پہلا موقع اس وقت آیا جب آپ کی عمر پچیس برس تھی۔ ان دنوں آپ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ مگر اکثر رات کو ایک بچے کا خواب انہیں دکھائی دیتا تھا۔ کئی بار اس گول مٹول بچے کو انہوں نے اس طرح دیکھا کہ وہ پودوں کو پانی دے رہی ہیں اور اچانک ایک گملے سے پھولوں کی بجائے بچے کا چہرہ نظر آنا شروع ہو جاتا تھا۔ دوسرا موقع اس وقت آیا جب مصنفہ کی دیرینہ دوست ساحرلدھیانوی ناسازی طبع کے سبب ان کے پاس آئے اور آپ نے ان کی خوب خدمت اور تیمارداری کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ تیسری دفعہ امرتا پریتم نے اپنے اندر کی خالص عورت کو اس وقت دیکھا ان کا دوست جب امروز سٹوڈیو میں بیٹھا اپنے باریک سے برش سے سرخ رنگ کی ایک بندیا مصنفہ کی پیشانی پر بناتا ہے۔ مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ زندگی کے ان تین مقامات کے علاوہ انہوں نے اپنے اندر کی خالص عورت کو نہیں دیکھا۔

امرتا پریتم نے اپنے عہد کے زوال پذیر سماج اور خصوصاً تقسیم ہند کے دوران پیش آنے والے مسائل کو اپنی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' کا حصہ بنایا ہے۔ مصنفہ کی سرگزشت میں قاری کے لیے تاریخ کی جھلکیاں واضح انداز میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان تمام ماضی کے جھروکوں کو سامنے رکھ کر ہم کئی عوامل کی حقیقت تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' از قرۃ العین حیدر

قرۃ العین کی آپ بیتی ''کارِ جہاں دراز ہے'' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اوّل ۱۹۷۷ء اور جلد دوم ۱۹۷۹ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنفہ نے اپنی گھریلو زندگی، عادات و اطوار، خاندانی حالات و واقعات اور ادبی منظر نامے کو مفصل انداز میں آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ مصنفہ نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی تاریخ، ان کی نقل مکانی اور ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے مراحل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کی جلد اوّل میں آپ نے اپنے خاندان کے پس منظر، والدین کے احباب اور جنگ آزادی کی مکمل داستان کو قلم بند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ آپ بیتی کی جلد دوم میں مصنفہ نے ہندوستان کی تقسیم، پاکستان ہجرت کے معاملات اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۶ء تک کے حالات سے قاری کو روشناس کروانے کی مساعی کی ہے۔ مصنفہ نے اپنی سرگزشت میں تحریر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز استاد کی ملازمت سے کیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد آپ پاکستان تشریف لائیں۔ آپ بیتی میں جہاں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی صورت حال کو تحریر کیا ہے اسی طرح آپ بیتی کی جلد دوم میں لندن کے قیام، ملازمت، موسیقی سیکھنے کے لیے میوزک سکول میں داخلہ اور لندن کی سماجی زندگی کے روز و شب کا احوال بھی آپ بیتی میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی عوامل کو اپنی سرگزشت میں الفاظ کی صورت میں سمو دیا ہے۔ آپ بیتی میں بیسویں صدی کی توہم پرستی اور قدامت پسندی کو بھی بطور خاص موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

''آزادی کی چھاؤں میں'' از بیگم انیس قدوائی

بیگم انیس قدوائی کی سرگزشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' کا دوسرا ایڈیشن نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا سے ۱۹۸۰ء میں چھپا تھا۔ جس میں مصنفہ نے آپ بیتی کے کچھ حصوں کو تو حذف کروا دیا جبکہ اس میں کچھ مزید اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ خودنوشت کے آغاز میں قیامِ پاکستان کے حالات، واقعات اور مشاہدات کو مفصل انداز میں تحریر کیا گیا۔ مصنفہ لکھتی ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے آغاز سے ہی ہندو مسلم فسادات کی خبریں ملنے لگیں تھیں۔ ہندوستان کا آمد و رفت اور مواصلات کا نظام درہم برہم کر دیا گیا تھا۔ ٹیلی فون، ڈاک، ریل گاڑیاں سب کو بند کر دیا گیا تھا۔ بہت سے پلوں کو جان بوجھ کر توڑ دیا گیا تھا۔ سماجی حالات اتنے دگرگوں تھے کہ انسانوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے بھی کم تر کی جا رہی تھی۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ آپ بیتی میں مصنفہ قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''کوئی جگہ محفوظ نہ تھی، کوئی دل مطمئن نہ تھا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ محبت کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ ہر طرف نفرت کا بول بالا تھا۔ ادھر مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ تھا۔''(۳)

ہندوستان کی تقسیم کے بعد قتل و غارت گری کا زور کچھ کم ہوا تو عید الاضحیٰ کا دن آیا جس سے پہلے ہزاروں انسانوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی اور لقمہ اجل بنا دیے گئے تھے۔ مصنفہ کے بقول یہ عید بہت ہی دردناک حشر سامانیوں کے بعد ایک تازہ اور خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ پرانے قلعے میں ریلیف کیمپ بنایا گیا تھا۔ جہاں پر ہزاروں کی تعداد میں زخمی، بیمار، بے سہارا اور یتیم بچے پناہ لیے ہوئے تھے۔ وہاں کے حالات بھی انتہائی مخدوش تھے۔ اس کیمپ میں ستمبر ۱۹۴۷ء تک لاوارث، بے گھر اور زخمیوں کی تعداد ایک لاکھ تک بڑھ چکی تھی جبکہ دوسرے کیمپ میں بھی ساٹھ ہزار کے قریب لوگ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں زندگی کے دن گن رہے تھے۔

نومبر کے مہینے تک کیمپوں کے ہسپتال میں زخمیوں کی تعداد بڑھنے لگی ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو ریل گاڑیوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ٹرین کی چھتوں پر سوار لوگ گر کر شدید مضروب ہوئے تھے اور ان کے جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ پناہ گزین کیمپوں میں بھی حالات انتہائی مخدوش ہوتے جا رہے تھے کیونکہ نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں سخت سردی میں لوگوں کے پاس گرم کپڑے اور کمبل نہیں تھے، جس کی وجہ سے یہاں پر لوگ کھانسی، نزلہ، زکام، بخار اور بہت سی موسمی بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔ بھارت میں مسلم کیمپوں میں حالات بہت زیادہ خراب تھے کیونکہ ہندو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھارت سے جلد از جلد پاکستان ہجرت کر جائیں۔ لیکن یہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلم پناہ گزین ہجرت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

زیادہ تر بیمار، بزرگ یا زخمی تھے۔ ان حالات میں بھارت میں موجود مسلم کیمپوں میں مخیر حضرات نے دل کھول کر چندہ اور ضرورت کی اشیاء تقسیم کیں لیکن وہ امداد اونٹ کے منہ میں زیرا کے مترادف تھی۔ مصنفہ ان مسلم پناہ گزین کیمپوں میں خواتین کی دیکھ بھال کے کام پر معمور تھیں۔ ان دنوں خیموں کے مسلسل قلت، سردی کی شدت میں اضافے اور مختلف بیماریوں کے پھیل جانے کی وجہ سے پناہ گزینوں کی حالت آئے روز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ کیمپ کے ہسپتال میں مریضوں کی مطلوبہ تعداد مکمل ہو گئی اور کئی مریض حسرت و یاس کی تصویر بنے رہے۔

مصنفہ گوڑگاؤں کے مسلم پناہ گزین کیمپ کا حوال تحریر کرتی ہیں کہ الور کے آٹھ ہزار پناہ گزین کسمپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے جنگل میں شکاری تمام جانوروں کو چاروں اطراف سے گھیر کر شکار کر لے۔ وہاں سے چند خوش قسمت مسلمان گھرانے ہی اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب رہے، باقی سب مہاراجوں کے فوجیوں اور بلوائیوں نے ماؤں سے ان کے لختِ جگر کو زبردستی چھین کر کرپانوں اور نیزوں پر لٹکا دیئے تھے۔ والدین کے سامنے بیٹوں کو قتل کر دیا جاتا اور بیٹیوں کی عصمت دری کی جاتی تھی۔ مصنفہ آپ بیتی میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے اٹھائیس برسوں میں جبل پور، علی گڑھ، میرٹھ، احمد آباد اور بنگلہ دیش میں ظلم و بربریت کے کئی خونی کھیل دیکھے تھے۔

بیگم انیس قدوائی کی داستانِ حیات ''آزادی کی چھاؤں میں'' ہندوستان کی تقسیم کے بعد فوری پیدا شدہ مسائل، ہجرت کے دوران دل خراش واقعات، پناہ گزین کیمپوں کے مخدوش حالات کی مکمل کہانی، دل دہلا دینے والی صورت حال اور انسان کے بھیڑیوں والے روپ کے مظاہر اپنی آپ بیتی میں مفصل انداز میں من و عن تحریر کر دیئے ہیں۔

''ہم سفر'' از حمیدہ اختر

اُردو ادب کے معروف ادیب اختر حسین رائے پوری کی شریک حیات حمیدہ اختر کی تحریر کردہ داستان حیات ''ہم سفر'' میں مصنفہ نے اپنی زندگی کے اہم حالات و واقعات کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ آپ بیتی ''ہم سفر'' ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ تحقیق و تجزیہ کی غرض سے راقم کے زیرِ نظر یہ آپ بیتی کا چھٹا ایڈیشن ہے۔ جس کو مکتبہ دانیال کراچی نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا تھا۔ حمیدہ اختر حسین کی یہ سرگزشت ۳۵۶ صفحات اور ۲۴ ر ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے اپنی داستانِ حیات میں اختر حسین رائے پوری کے ساتھ گزری پچاس سالہ رفاقت کو اپنے مخصوص اسلوب بیان میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی وفات کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریک پر مصنفہ نے اپنی خودنوشت تحریر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس میں کامیاب رہیں۔ جب یہ آپ بیتی چھپ کر قارئین تک پہنچی تو خصوصی طور پر ادیب حضرات نے اسے بہت زیادہ سراہا اور یہی وجہ ہے کہ مصنفہ کو خوب پذیرائی بخشی گئی۔ مصنفہ کی چند دوسری تصانیف میں ''نایاب ہیں ہم''، ''پرانی کہانیاں'' اور ''وہ کون تھی'' شامل ہیں۔

حمیدہ اختر کی اپنے شوہر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ پچاس برس سے زائد عرصہ کی رفاقت رہی۔ مصنفہ نے اس دور کی داستان کو دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس طرح اختر حسین رائے پوری سے صہبا لکھنوی نے پر زور فرمائش پر آپ بیتی ''گردِراہ'' تحریر کروائی تھی اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی کے کہنے پر حمیدہ اختر نے اپنی سرگزشت ''ہم سفر'' مکمل کی تھی۔ مصنفہ کے والد ظفر عمر بھی اپنے دور کے معروف ادیب تھے اور انہوں نے اپنی دو تصانیف جن میں ''نیلی چھتری اور لال کھوڑ'' تحریر کی تھیں۔ مصنفہ کے والد ادیب ہونے کی وجہ سے کھلے مزاج کے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنی بیوی سے پردہ نہیں کروایا اور نہ ہی اپنی بیٹیوں کو زبردستی پردہ کروانا چاہا تھا۔ آپ کے والد کے دوست احباب جب گھر پر آپ کے والد سے ملاقات کے لیے آتے تھے تو لڑکیوں کو اجازت تھی کہ وہ مہمانوں کی تواضع کریں۔ اس دور میں حالانکہ دیکھا جائے تو ان کے خاندان کی خواتین میں پردہ کا رواج تھا لیکن مصنفہ کے والدین نے پردے کی روایت کو ترک کیا تو خاندان والوں نے اس بات پر بہت اعتراضات کیے لیکن آپ کے والدین نے ان اعتراضات پر کان نہیں دھرا۔

حمیدہ اختر بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بارے میں تحریر کرتی ہیں کہ اہلِ علم نے مولوی عبدالحق کو ایک مفکر، ناقد، معلم اور ادیب کے روپ میں ہی دیکھا ہے لیکن مصنفہ اور ان کے شوہر اختر حسین رائے پوری نے انہیں سراپا محبت پایا تھا۔ وہ ایسی عظیم شخصیت کے حامل تھے جو کہ اُردو زبان کے عشق میں گرفتار تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اردو زبان کی ترویج کو بنایا ہوا تھا۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے جن مشاہیر زمانہ کا ذکر کیا ہے، ان میں اہم قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، پنڈت

جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محمد اشرف اور ن۔م راشد شامل ہیں۔

آپ بیتی میں مصنفہ اپنے خاوند ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ گزری زندگی کے واقعات کو اس انداز سے تحریر کیا ہے اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ حالات ''گردِراہ'' آپ بیتی کا ہی حصہ ہوں۔ ''ہم سفر'' آپ بیتی کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے روز و شب کے معمولات کو بھی بطور خاص درج کیا گیا ہے جو کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''گردِراہ'' میں تحریر کرنے سے رہ گئے تھے۔ بیگم حمیدہ اختر حسین کی خودنوشت کے بارے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب مروجہ کتابی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مصنفہ نے اپنی روزمرہ کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ اسلوبِ بیان ایسا دلکش ہے کہ پڑھنے والا وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی کتاب نہیں پڑھ رہا، مصنفہ کی زبان سے ان کی باتیں سن رہا ہے۔''(۴)

مصنفہ نے آپ بیتی میں دل کش اسلوب میں اپنی داستان حیات بیان کرتے ہوئے اپنے بچپن، زمانہ طالب علمی کے مشاغل، اختر حسین رائے پوری کے ساتھ شادی کے مراحل، ازدواجی زندگی کے حالات، ادبی ماحول کی لطافتیں، مختلف ممالک کے اسفار کا احوال، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ گزرے خوش گوار لمحات کی یادیں اور نامور شخصیات کے تذکرہ جات کو بطور خاص شامل کیا ہے۔ بلاشبہ یہ خودنوشت اپنے کرداروں اور مختلف ادوار کے لحاظ سے ایک تاریخی مقام کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

''کاغذی ہے پیرہن'' از عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ۲۱/اگست ۱۹۱۵ء میں بدایوں (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے اپنی آپ بیتی ''کاغذی ہے پیرہن'' میں خواتین کے مسائل پر مفصل انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریریں خواتین کے حقوق کا نوحہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کا پہلا مطبوعہ افسانہ ''کافر'' کے عنوان سے ۱۹۳۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد افسانوی مجموعوں میں ''کلیاں''، ''چوٹیں''، ''ایک بات''، ''چھوئی موئی''، ''دو ہاتھ''، ''دوزخ''، ''کنواری''، ''ہم لوگ''، ''زہر''، ''پہلی لڑکی''، ''بڑی شرم کی بات''، ''چھری میں سے'' اور ''چند تصویر بتاں'' شامل ہیں۔ عصمت چغتائی کے ناولوں میں ''ضدی''، ''بہروپ نگر''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ''، ''سودائی''، ''جنگلی کبوتر''، ''دل کی دنیا''، ''عجیب آدمی''، ''ایک قطرۂ خون'' اور ''باندی'' شامل ہیں۔ بچوں کے لیے ناول ''تین اناڑی'' اور ''نقلی راجکمار'' تحریر کیے۔ آپ نے خاکوں پر مشتمل مجموعہ ''دوزخی'' بھی قلم بند کیا۔

عصمت چغتائی نے آپ بیتی میں اپنی ذاتی زندگی کے حالات، دل کے احساسات اور جذبات کے ساتھ ساتھ خواتین کو مشرقی معاشرہ میں درپیش مصائب کو بیان کرتے ہوئے بڑی بے باکی اور ہمت سے کام لیا ہے۔ آپ نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے عہد کے حقائق کو سامنے رکھ کر معاشرے کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی اقدار کو قاری تک پہنچانے کی عملی مساعی کی ہے۔ مصنفہ نے خودنوشت میں اپنے بچپن اور جوانی کے مختلف ادوار کو بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی داستانِ حیات تحریر کرتے ہوئے اپنے مخصوص افسانوی انداز سے ہٹ کر اپنی ذات اور سماجی ماحول کو خاص اہمیت دی ہے۔

عصمت چغتائی کی آپ بیتی اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں مصنفہ نے اپنے بچپن کے بارے میں تفصیلی انداز میں بیان کرتی ہیں۔ اس باب کا آغاز مصنفہ ایک تشدد آمیز واقعہ سے کرتی ہیں۔ اس واقعہ میں ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت زیادہ رو رہی تھیں اور کسی کو ان کے سامنے انتہائی بے دردی سے چھڑی سے مارا پیٹا جا رہا تھا۔ یہ آوازیں مصنفہ کے لاشعور میں اکثر انہیں سنائی بھی دیتی رہتی ہیں۔ اس دور سے انہیں اس بات کا علم روز روشن کی طرح ہو گیا تھا کہ ہمیشہ طاقت ور کمزور کو مارتا ہے اور نیچا دکھانے کی کوشش میں رہتا ہے۔

عصمت چغتائی نے جس عہد میں آنکھ کھولی اس میں وہاں کے سماجی ماحول میں عورت کو ہر لحاظ سے کمزور گردانا جاتا تھا۔ تعلیم نسواں کو معیوب خیال کیا جاتا تھا لیکن مصنفہ کو تعلیم کے حصول کے لیے بہت زیادہ تگ و دو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ آپ کے والد تعلیم نسواں کے حق میں تھے۔ البتہ مصنفہ کی والدہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے عصمت کو والدہ کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن کچھ تگ و دو کے بعد آپ کی والدہ بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے رضامند ہو گئی تھیں۔

مصنفہ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کی بڑی تین بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ آپ کی بہنیں نہایت سلیقہ شعار، سلائی کڑھائی، کھانے پکانے کی ماہر، اردو فارسی اور قرآن مجید کی بنیادی تعلیم کی حامل تھیں جبکہ عصمت چغتائی اپنی بہنوں کے برعکس بچپن سے ہی انتہائی پھسڈی، پھوہڑ اور ضدی واقع ہوئی تھیں۔ دس بہن بھائیوں کے درمیان مصنفہ اپنے بچپن کو محرومیوں، مجبوریوں، ناانصافیوں اور حسرتوں کا دور سمجھتی تھیں اور ان لوگوں کی سوچ پر حیران ہوتی تھیں جو کہ اپنے بچپن کو زندگی کا سب سے اچھا دور سمجھتے ہیں۔ مصنفہ چونکہ اپنے تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اس لیے والدہ کی محبت اور شفقت سے محروم رہیں اور انہیں شاید گھر میں اس طرح کا پیار میسر نہ آ سکا جو کہ عموماً اولاد میں سے چھوٹے بچے کے حصے میں آتا ہے۔ عصمت چغتائی کے بچپن میں ان کی بڑی بہنوں کی شادیاں ہو جانے کے باعث آپ کی پرورش بڑے بھائیوں کے ساتھ ایک ایسے آزاد ماحول میں ہوئی جس سے عموماً لڑکیوں کو دور رکھا جاتا ہے۔ مصنفہ کے بے باک اور نڈر طرزِ عمل کے پیچھے یہی ماحول کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ باغیانہ جذبات نے آپ کے اندر حقوقِ نسواں کے حصول کے لیے بیداری پیدا کر دی تھی۔ آپ کی والدہ کو آپ کی آزاد خیالی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ آپ کی والدہ چاہتی تھیں کہ آپ بھی خواتین کے روایتی طرزِ عمل کے عین مطابق اپنی زندگی بسر کریں لیکن مصنفہ اپنی دھن پر قائم رہیں۔ تعلیم کے حصول کی غرض سے آپ کا خاندان روشن خیال سمجھا جاتا تھا لیکن یہ وسعت خیالی صرف مردوں کی تعلیم تک ہی محدود رہی اور تعلیم نسواں کے حوالے سے روایتی تنگ نظری ہی دکھائی دیتی رہی۔ دراصل مصنفہ کے نزدیک خواتین پر ہونے والے معاشرتی ظلم کی ذمہ دار سب سے زیادہ خود عورت ہی ہے کیونکہ جب تک وہ خود اپنے حق کو سمجھنے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں نہیں اترتی تب تک وہ ہمیشہ کی طرح سماجی جبر کی تصویر ہی بنی دکھائی دیتی رہے گی۔

مصنفہ کا کہنا ہے کہ ان کو مختلف کتب کے مصنفین نے بہت متاثر کیا خصوصاً مغربی اور روسی ادیبوں نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ روسی ادیب چیخوف کو مصنفہ آموختہ کے طور پر بار بار پڑھتی تاکہ دماغی ورزش ہو سکے۔ آپ نے مختلف قسم کے افسانے تحریر کرنے سے پہلے بہت سے مضامین تحریر کیے لیکن جب آپ نے باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو ردِعمل کے طور پر آپ کو انتہائی تحقیر آمیز خطوط ملنے لگے۔ افسانہ ''لحاف'' کے چھپنے کے بعد تو آپ کے خلاف باقاعدہ عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ مصنفہ کے خیال میں انہیں لکھنے میں پڑھنے جیسا مزا آتا تھا۔ آپ نے اپنی زندگی کے کئی دشوار لمحات مختلف قسم کے مضامین اور افسانے لکھنے میں گزار دیئے تھے۔ آپ نے قلم کو بہترین دوست قرار دیتے ہوئے تنہائی کا گہرا ساتھی مانا ہے۔ آپ نے جب باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا تو آپ کے سامنے کوئی خاص مقصد یا نظریہ نہیں تھا لیکن ترقی پسند تحریک میں شمولیت کے بعد آپ کی شخصیت اور فنی اپج میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ آپ نے معاشرے کی فرسودہ اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال کر اپنی سوچ اور مشاہدات کو بروئے کار لا کر سماج سے خود کو منوا لیا تھا۔

آپ بیتی میں عصمت چغتائی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور مذہبی صورت حال کو تفصیلی انداز میں تحریر کرتی ہیں۔ گھریلو ملازمین کے بارے میں لکھتی ہیں کہ نوکروں کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک رخ گھر کے مالک کے سامنے اور دوسرا رخ مالک کی غیر موجودگی میں سامنے آتا ہے۔ ہندوستان میں بلاشبہ سب سے حقیر طبقہ گھریلو ملازمین کا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ طبقہ غربت و افلاس کی چکی میں پستے ہوئے محکوم اور دوسروں کے رحم و کرم پر اپنی زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ خودنوشت میں آگرہ شہر کی معاشرتی زندگی کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ ان دنوں آپ کے ہمسائے ہندو تھے۔ جن کا عام دنوں میں ان سے خوب میل ملاپ رہتا تھا لیکن جیسے ہی تہواروں کے دن قریب آتے جاتے تھے۔ پڑوسیوں سے ملنا ملانا کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو کر رہ جاتا تھا۔ انہیں اپنے بچپن سے ہی اندازہ ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلم ایک دوسرے سے یکسر مختلف اقوام ہیں۔ ہندو مسلم بھائی چارے کے ساتھ ساتھ احتیاط کا احساس بھی ہر لحہ ان کے دامن گیر رہتا تھا۔ ہندو مہمانوں کی آمد پر علیحدہ مخصوص برتنوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا، روشن خیالی کے بلند و بانگ دعووں کے باوجود اس دور میں عجیب قسم کی سماجی گھٹن کا احساس موجود رہتا تھا۔ ہندو مسلم اکثر نجی محافل میں انگریزوں کو مجرم ٹھہرایا جاتا تھا اور ایک دوسرے سے خلوص اور یگانگت کی کہانیوں کا خوب ذکر چلتا رہتا تھا۔ مصنفہ آپ بیتی میں اپنی ایک ہم عمر پڑوسن سوشی کا تذکرہ بطور خاص کرتی ہیں کہ ان کی یہ سہیلی ہر وقت ان کے گھر میں گھسی رہتی تھی لیکن جیسے ہی عید الاضحیٰ کے دن آتے تھے تو سوشی کو اس کے گھر والے تالا لگا کر کمرے میں قید کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اگر سوشی کے گھر میں کوئی تہوار منایا جاتا تھا تو مصنفہ کی آمد و رفت کا سلسلہ روک دیا جاتا تھا۔

آپ بیتی میں خواتین کے سماجی کردار کے بارے میں کئی مقامات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آپ بیتی میں مصنفہ ''آدھی عورت آدھا خواب'' کے عنوان کے حامل باب میں خامہ فرسا ہیں کہ ہر عہد کے مفکرین نے عورت کے کئی روپ دکھا کر ان پر اپنی آراء پیش کی ہیں۔ خواتین کے حوالے سے دی گئیں آراء کو اگر بغور دیکھا جائے تو ہمیں واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ کسی نے عورت کو شیطان کی خالہ کہا ہے، تو کوئی خدا کے بعد عورت کو اعلیٰ مقام و مرتبہ دینے کا قائل ہے۔ کسی مفکر نے وجودِ زن کو تصویرِ کائنات میں خوبصورتی کا سبب سمجھا اور کوئی خواتین کو نیک سیرتی کی عملی مثال قرار دیتا ہے۔ مصنفہ کا اس ضمن میں کہنا ہے کہ مردوں نے عورتوں کو جتنا سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے اتنی تگ و دو خواتین سے مردوں کو سمجھ لینے کے بارے میں شاید ممکن نہیں ہو سکی۔

آپ بیتی میں مصنفہ ہندوستان کی ریاست سوجت کی سماجی صورت حال کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ یہاں رنڈی عورتوں کے لیے کوئی مخصوص محلہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ کم عمر ہندو شادی شدہ لڑکیاں جب بیوہ ہوتی تھیں تو کسی مال دار ہندو سے تعلق بڑھا لیا کرتی تھیں کیونکہ ان دنوں ستی کی رسم کے بعد ہندو ودھوا خواتین کی باقاعدہ شادیوں کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ان

عورتوں کی ناجائز اولادیں یعنی ان کے بچے معاشرے میں ''راج گولے'' کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایسے بچوں کو بڑے ناز ونعم سے پالا جاتا تھا اور تعلیم کے لیے الگ مخصوص سکول قائم کیے جاتے تھے۔ تعلیم کے حصول کے بعد انہیں خاص طور پر ملٹری ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد فوج میں باقاعدہ شامل کیا جاتا تھا۔ فوج کی اس مخصوص پلٹن کو مہاراج کی سال گرہ یا شادی کے موقع پر بلایا جاتا تھا۔ ہندو بال ودھوا کی لڑکیاں بھی محل میں لاڈ پیار سے پرورش پاتی تھیں۔ انہیں مہاراج کی رانیوں کی ''ڈراوڑیاں'' کے مخصوص نام سے پکارا جاتا تھا۔ راج گولوں اور ڈراوڑیوں کی آپس میں شادی کی خاص ممانعت تھی کیونکہ کیا پتہ کون کس کا بھائی ہے اور کس کی بہن ہے۔

عصمت چغتائی نے آپ بیتی میں مشرقی معاشرے میں موجود تضادات، مردوں کے معاشرے میں حقوقِ نسواں کی پامالی اور آزادی اظہار پر بحیثیت عورت قدغن لگا دینے والے سماج کو ہدفِ تنقید بنانے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد سے مختلف مثالیں پیش کر کے ان سے کھلی بغاوت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ سماج کے غربت و افلاس میں گھرے ہوئے طبقات اور خصوصاً خواتین کے استحصال کی کہانی کا برملا اظہار کیا ہے۔

''میرا بچپن'' از عذرا عباس

عذرا عباس کی خودنوشت ''میرا بچپن'' کی اشاعت اوّل ۱۹۹۴ء جبکہ اشاعت دوم ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ ''میرا بچپن'' آپ بیتی کے علاوہ مصنفہ کی دوسری تصانیف میں ''میز پر رکھے ہاتھ''، ''راستے مجھے بلاتے ہیں''، ''حیرت کے اس پار'' اور ''میں اور موسیٰ'' شامل ہیں۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی بچپن کی یادداشتوں کو مفصل انداز میں تحریر کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے بچپن کی یادوں کو ماضی کے دریچوں سے زمانہ حال میں بیان کیا ہے۔ قاری کو آپ بیتی کا مطالعہ کرتے ہوئے، یہی گمان ہوتا ہے گویا تمام واقعات لمحہ موجود میں رونما ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مختصر آپ بیتی میں مصنفہ نے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کی بجائے حال کے صیغہ کو اپنے حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے برتا ہے۔

مصنفہ اپنی یادداشتوں کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ بچپن کی یادیں ایسی ہوتی ہیں جیسے مختلف چیزیں اندھیرے میں پڑی ہوئی ہوں اور کوئی انسان ٹارچ کی مدد سے تاریکی میں اپنی گم ہوئی اشیاء کو تلاش کر رہا ہو۔ اکثر زیادہ تیز روشنی کی بدولت کچھ بھولے بسرے واقعات بہت جلد دماغ میں نمایاں ہونے لگتے ہیں لیکن چند یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کہ مبہم، غیر واضح، دھندلی یا بے ربط دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی غیر مسلسل یادوں کے لیے ذہن پر بہت زیادہ زور دے کر یا اپنے بزرگوں سے ان واقعات کی تصدیق کے بعد ہم کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

عذرا عباس نے آپ بیتی میں اپنے بچپن کے دور کی سماجی اور معاشی صورت حال کو بھی واضح کیا ہے کہ کس طرح

انہوں نے غربت و افلاس کے عالم میں گزربسر کی۔ آپ کے والد کسی دوسرے شہر میں ملازمت کیا کرتے تھے اور والدہ ایک عام گھریلو خاتون تھیں جو کہ گھر کے تمام کام خود کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں ضرورت زندگی کی عام اشیاء بھی عموماً موجود نہیں ہوتی تھیں۔ آپ بیتی میں مصنفہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ تحریر کرتی ہیں کہ ایک دن وہ محلے کے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود کر جب واپس گھر پر آتی ہیں اور کھانا کھانے کا مطالبہ کرتی ہیں تو آپ کی والدہ کسمپرسی کی تصویر دکھائی دیتی ہیں کیونکہ اس دن آپ کے گھر میں کھانا پکانے کے لیے نہ تو لکڑیاں تھیں اور نہ مٹی کا تیل تھا۔ اس بات سے واضح طور پر عیاں ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کے معاشی حالات دگرگوں رہتے تھے۔

آپ بیتی میں مصنفہ اپنے دور کی سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ معاشرتی عوامل کو بھی اجاگر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ حقوق نسواں کی پامالی ان کے دور میں بھی ہوتی رہی ہے اور کس طرح خواتین کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ آپ بیتی میں مصنفہ نے بیان ہمیشہ موجود رہتی تھی، جس کو دیکھ دیکھ کر مصنفہ والد کو یاد کر کے رو لیا کرتی تھیں۔

مصنفہ اپنی والدہ کی خوش گوار یادوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ اکثر عصر کی نماز کے بعد ہرنی کی کہانی سنایا کرتی تھیں، روزانہ موتیے اور بیلے کے پھولوں کے گملوں کو پانی دیتی، شام کو تمام گھریلو امور سے فارغ ہو کر اپنے کانوں میں سفید موتیے کے پھول لگا کر جائے نماز پر بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ بات اگرچہ بالکل الگ تھی کہ مصنفہ کی والدہ کے ساتھ ایک سرد جنگ ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ اس کی بنیادی وجوہات، بیٹیوں کی نسبت بیٹوں سے والہانہ محبت کا اظہار، بیٹوں کو زیادہ کھانا مہیا کرنا، ان کے کپڑے بنواتے رہنا، ان کو زیادہ دعائیں دینا اور ان کا زیادہ خیال رکھنا شامل ہیں۔

عذرا عباس آپ بیتی میں اپنے بے باک اندازِ فکر کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ بچپن کے واقعہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ایک دفعہ عید کا روز تھا، آپ کے تمام بہن بھائی نئے کپڑے پہن کر گھر میں والد کی امامت میں نمازِ عید ادا کر رہے تھے جو کہ عرصۂ دراز سے آپ کے گھر کا دستور چلا آ رہا تھا۔ آپ کے والد کی امامت میں نماز شروع ہوتی ہے، سب افرادِ خانہ نیت باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آتی ہے۔ مصنفہ کے دوستوں میں سے ایک دوست دروازے سے آواز دیتا ہے کہ جلدی آؤ دیر ہو رہی ہے۔ مصنفہ تمام لوگوں کے سجدے میں جانے کا انتظار کرتی ہے اور جیسے ہی سب لوگ سجدے میں جاتے ہیں مصنفہ وہاں سے نماز چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر گھومنے پھرنے نکل جاتی ہیں۔ مصنفہ کی بے باک طبیعت کا دوسرا اہم واقعہ ان کے کالج دور کا ہے۔ ایک روز یوں ہوا کہ ان کی کالج کی نئی پرنسپل تعینات ہونے پر نوٹ نکالا گیا کہ تمام کالج کی طالبات صبح ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے کالج پہنچ جایا کریں۔ ساڑھے آٹھ کے بعد کالج کا مین گیٹ بند کر دیا جائے گا۔ دوسرے روز مصنفہ سمیت بہت سی طالبات کالج دیر سے پہنچیں تو کالج کا مین گیٹ بند ہونے پر باہر جمع ہونے لگیں۔ مصنفہ یہ صورت حال دیکھ کر کالج کی دیوار پھلانگ کر مین گیٹ کھول دیتی ہیں جس پر انہیں کالج کی پرنسپل

کے دفتر بلایا جاتا ہے اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی تنبیہ کی جاتی ہے۔

مفلوک الحال اور خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی سماجی مشکلات کے ساتھ ساتھ مصنفہ آپ بیتی میں اپنے دور کی اہم سماجی قدغن جس میں خصوصی طور پر تعلیم نسواں کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ اس دور میں یہی عام خیال تھا کہ لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے آزاد خیالی کی ڈگر پر چلنا شروع کر دیتی ہیں اور ہر کام میں اپنی من مانیاں کرتی پھرتی ہیں۔ عذرا عباس آپ بیتی میں اپنے دادا کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے بہت مخالف تھے اور اکثر مصنفہ کے والد کو لڑکیوں کی تعلیم سے روکتے تھے۔ عذرا عباس آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

> ''مجھے اکثر دادا کی آواز اپنے باپ سے لڑتی ہوئی سنائی دیتی ہے، ''اس کو مت پڑھواؤ، دیکھو پچھتاؤ گے'' میرا باپ انہیں کیا جواب دیتا ہے، مجھے یاد نہیں۔ لیکن بعد کی میری حرکتوں پر باپ اکثر مجھے یہ کہتا ہوا سنائی دیا، ''میرے باپ نے کہا تھا اس کو پڑھوانا مت۔''(۵)

''میرا بچپن'' آپ بیتی میں مصنفہ کے دادا کے کردار کو بڑے مفصل انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں مصنفہ کے گھر میں ایک بزرگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ ان کا سرخ و سفید چہرہ تھا جو کہ ہر وقت اپنے پوتے اور پوتیوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو ننگے پاؤں پھرنے سے باز رکھتے تھے، نماز کی پابندی کرواتے، سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرواتے اور مصنفہ کی حجامت کرواتے ہوئے سر کو مکمل گنجا کروا دیتے تھے۔ اپنے دادا جان کی چند یادگار یادداشتوں کے بعد انہیں ایک شام کبھی نہیں بھولتی، جس شام آپ کے دادا کی وفات کی خبر آپ کے گھر پہنچی تھی۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ ان دنوں موت کا کوئی بھیانک تاثر تو موجود نہیں تھا لیکن ان کو یہ واضح طور پر پتہ چل چکا تھا کہ اب ان کے دادا جان دوبارہ ان کے گھر میں کبھی نہیں آئیں گے۔

مصنفہ اپنے سکول کے پہلے دن کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کا بڑا بھائی پہلے دن انہیں سکول میں داخل کروانے لے کر گیا تھا۔ مصنفہ کے پاس ایک نئی پنسل اور کاپی تھی۔ استانی نے ان کے بڑے بھائی سے کچھ بات کی تو انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب روزانہ اسی سکول میں پڑھنے کی غرض سے آنا ہے۔ سکول سے واپس جاتے ہوئے سیڑھیاں اترنے کے دوران مصنفہ کو خیال آیا کہ ان کی نئی پنسل استانی کی میز پر ہی رہ گئی تھی۔ مصنفہ بھاگ کر اپنی پنسل لینے کے لیے واپس گئی تو استانی نے ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے انہیں واپس بھگا دیا تھا۔

عذرا عباس کی خود نوشت ''میرا بچپن'' اکہتر صفحات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے اپنے بچپن کی اہم یادداشتوں کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ زیرِ نظر آپ بیتی بلاشبہ اپنے دور کی سماجی صورت حال کو بیان کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آپ

بیتی میں مصنفہ نے بہت سے معاشرتی عوامل کو بہترین انداز میں اجاگر کرنے کی جسارت کی ہے۔ ان میں اہم تعلیم نسواں کی ضرورت، معاشرے کا استحصالی رویہ، خواتین پر سماجی قدغن اور غیر مساویانہ اقدار کے خلاف واضح انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

''بری عورت کی کتھا'' از کشور ناہید

کشور ناہید کی ولادت ۱۹۴۰ء میں بلند شہر، ہندوستان میں ہوئی۔ آپ اُردو ادب کی نامور شاعرہ، ترجمہ نگار، کہانی نویس اور کالم نگار ہیں۔ آپ کی تصانیف نہیں ''باقی ماندہ خواب''، ''عورت زبان خلق سے زبان حال تک''، ''عورت خواب اور خاک کے درمیان''، ''خواتین افسانہ نگار ۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک''، ''زیتون''، ''آجاؤ افریقہ''، ''بری عورت کی کتھا''، ''سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ''، ''بے نام مسافت''، ''لب گویا''، ''خیالی شخص سے مقابلہ''، ''میں پہلے جنم میں رات تھی''، ''سوختہ سامانی دل''، ''کلیاتِ دشت''، ''قیس میں لیلیٰ''، ''لیلیٰ خالد''، ''ورق ورق آئینہ'' اور ''شناسائیاں رسوائیاں'' شامل ہیں۔

کشور ناہید کی داستانِ حیات ''بری عورت کی کتھا'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں ادبی پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے اشاعت پذیر ہوا جبکہ بعدازاں اس آپ بیتی کو ۱۹۹۷ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے بھی شائع کیا۔ مصنفہ کی تحریر کردہ آپ بیتیوں ''بری عورت کی کتھا'' اور ''شناسائیاں رسوائیاں'' میں ان کے بے باک اندازِ بیان کی بدولت خصوصی طور پر خواتین کی اُردو آپ بیتیوں میں انہوں نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے مخصوص پیرایہ اظہار کو اپنی تحریروں میں سموتے ہوئے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو اس طرح الفاظ کا روپ دیا ہے جس کی مثال ہمیں نسوانی آپ بیتیوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مصنفہ آپ بیتی کے آغاز میں اپنے عہد کی سماجی اقدار کا موازنہ ماضی کے سماجی و معاشرتی حالات سے کرتی ہیں۔ ماضی کے حالات و واقعات کے تناظر میں مصنفہ اپنے دور کے سماجی عوامل کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ مصنفہ موجودہ دور کی بدلتی ہوئی سماجی صورت حال کی حقیقت کو بھی تسلیم کرتی ہیں اور حقیقت حال بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ جس وقت مصنفہ آپ بیتی تحریر کر رہی ہیں ان کی بہو شارٹس جبکہ دوسری بہو سکرٹ پہنے ہوئے ہیں جبکہ ان کی والدہ ڈولی میں بیٹھ کر محلے میں اگر کہیں جانا ہوتا تھا تو جاتی تھیں۔ اس دور میں خواتین کے لیے پردے کا خاص طور پر اہتمام کیا اور کروایا جاتا تھا۔ خواتین اپنے دامادوں سے بھی سخت پردہ کرتی تھیں۔ خاتون خانہ کے کہیں آنے جانے کے لیے مخصوص ڈولیوں کا انتظام کیا جاتا تھا اور ڈولیوں میں باقاعدہ پتھر رکھ دیئے جاتے تھے تاکہ ڈولی اُٹھانے والوں کو خاتون کا اصل وزن معلوم نہ ہو سکے۔ علاج معالجے کے لیے جب حکیم کو گھر بلایا جاتا تھا تو مریض خاتون کا ہاتھ آٹے میں لپیٹ دیا جاتا تھا تاکہ حکیم کا ہاتھ صرف نبض پر ہی رکھا جا

سکے۔ اس دور میں گھروں میں پانی بھرنے والے سقے جب پانی بھرنے آتے تھے تو بچیوں سمیت تمام خواتین کا پردہ کروایا جاتا تھا۔ مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ ان کے بچپن میں ان کے شہر میں بہت سے ہندو گھرانوں کی خواتین میں بھی پردہ کرنے کا رواج تھا۔ شہر میں پردے کا یہ عالم تھا کہ عموماً ان کے گھر کی کھڑکی سے بازار میں کئی کئی دن بے پردہ عورتیں خال خال ہی دیکھنے کو ملتی تھیں۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پردے کا رواج کم ہونے لگا، ڈولیوں میں خواتین کے آنے جانے کی بجائے تانگے استعمال کیے جانے لگے۔ تانگوں پر پردہ کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ تانگے میں خواتین کے پردے کے لیے سفید چادر باندھ دی جاتی تھی۔ ان تانگوں پر مسلم خواتین کے ساتھ ساتھ ہندو خواتین بھی سفر کیا کرتی تھیں۔

کشور ناہید نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے کے سماجی حالات کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ ان کی والدہ آپ کے والد کی چوتھی بیوی تھیں، ان دنوں تعلیم نسواں صرف قرآن کی تعلیم تک محدود رکھی جاتی تھی۔ اسی لیے ان کی والدہ کو اپنی تعلیم مکمل نہ کرنے کے سبب اپنی اولاد کو بہتر تعلیم دلوانے کا بہت شوق تھا۔ آپ کی والدہ کے برعکس آپ کے والد نے ہمیشہ لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کی لیکن آپ کی والدہ اس کام کی تکمیل کے لیے ثابت قدم رہی تھیں اور انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ مصنفہ نے ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان میں ایک نئی سیاسی و سماجی لہر پیدا ہوئی، جس کی بدولت ملک کے تمام طبقے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب تمام ہندوستانی اقوام نے انگریزوں سے آزادی کی عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے الگ وطن کے حصول کے لیے جب تگ و دو تیز کر دی تھی تو ایسی خواتین جن کی نبض حکیم کو آٹے میں لپیٹ کر دکھائی جاتی تھی اور ڈولیوں کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا نہیں سکتی تھیں۔ ان خواتین نے اپنے بنیادی انسانی حق ''آزادی'' کو حاصل کرنے کی خاطر نہ صرف خود جلسے، جلوس کیے بلکہ چندہ جمع کرنے میں بھی پیش پیش رہی تھیں:

> ''مسلمانوں نے الگ ملک کے لیے جدوجہد شروع کی۔ وہی عورتیں جو آٹے میں ہاتھ لپیٹ کر حکیم کو دکھاتی تھیں اور ڈولی بنا کہیں نہیں نکلتی تھیں۔ ان عورتوں نے جگہ جگہ جلسے کرنے، چندہ اکٹھا کرنا اور بچوں میں بھی ایک الگ اور آزاد ملک کے لیے جذبہ بیدار کیا۔''(۶)

مصنفہ نے آپ بیتی میں ہندوستانی مسلم خواتین کی آزاد ملک کے حصول کے لیے عملی مساعی کو زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مسلم لیگی خواتین نے مختلف علاقوں میں جا کر آزادی کا شعور بیدار کیا، جس کی بدولت چند سالوں کی مسلسل محنت نے آزاد وطن کے حصول کو ممکن بنایا تھا۔

کشور ناہید اپنے بچپن کے دور کے سماجی حالات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس وقت ہندو، مسلم اقوام کے درمیان تعصب بہت کم تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب مل جل کر رہتے تھے، ذات پات اور اونچ نیچ کا فرق کم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شامل ہوتے تھے:

> ''اس زمانے میں ہندو مسلمانوں میں نہ کوئی تعصب تھا نہ دوری۔ ہم سب لڑکیاں بالیاں جھولے جھولتی۔۔۔۔ ہندو عیسائی اور مسلمان لڑکیاں مل کر کھانا کھاتی تھی۔''(۷)

قیامِ پاکستان سے چند سال قبل ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات یکسر بدلنا شروع ہوئے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی جن کا جینا مرنا کبھی سانجھا ہوا کرتا تھا، وہ ایک دوسرے کے جان کے دشمن بن گئے۔ پھر اس معاشرے میں کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہ رہی۔ خصوصاً بٹوارے کے پہلے اور بعد کے چند ماہ میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی۔ مسلم خواتین پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ ہجرت کے دوران کئی ریل گاڑیوں کو زبردستی روک کر مردوں کے گلے کاٹے جاتے، بچوں کو کرپانوں اور تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا اور خواتین کی چھاتیاں کاٹ دی جاتی تھیں۔ غرض تقسیم ہند کے دوران بہت سی دل خراش کہانیوں نے جنم لیا۔

کشور ناہید نے حقوق نسواں کے لیے اپنے قلم کو اُٹھایا اور خواتین کے لیے دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کر دکھایا کہ مظلوم ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں عورت کو ہی ظالم کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ پاکستان میں بالخصوص ۱۹۷۹ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک کے عرصہ میں خواتین پر ظلم و جبر روا رکھا گیا۔ اس دور میں بہت سے شوہروں نے اپنی بیویوں پر زنا کے الزامات لگا کر انہیں جیلوں میں قید کروا دیا تاکہ وہ بآسانی دوسری شادیاں کر سکیں۔ اسی طرح بہت سے بھائیوں نے جائیدادوں کے لالچ میں آ کر اپنی بہنوں پر الزامات لگائے تاکہ انہیں حق وراثت نہ دینا پڑے۔ بہت سے والدین نے اپنی بیٹیوں پر زنا کے الزامات لگائے تاکہ ان کی بیٹیاں اپنی مرضی کے مطابق کہیں شادی نہ کر سکیں۔ مصنفہ نے اپنی سرگزشت میں سماجی حقائق کو برملا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرقی معاشرے میں مرد پر ہی منحصر ہے کہ وہ عورت کو گھر میں مقام و مرتبہ دینا چاہتا ہے یا نہیں۔ کشور ناہید نے نفسیاتی لحاظ سے مرد حضرات کی فطرت کے کئی پہلو پیش کیے ہیں۔ ایک طرف تو مرد، عورت یعنی ماں کے پاؤں تلے جنت کا اقرار کرتا ہے جبکہ دوسری طرف عورت کو عقل سے خالی ہونے کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔

کشور ناہید نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے مصائب کو تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کو ایک مسلسل جدوجہد سے عبارت کیا ہے۔ تعلیم کے حصول میں دشواریوں کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری پر بھی بہت اعتراضات کیے گئے لیکن آپ نے نہ صرف اپنی تعلیم کو مکمل کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے شاعری کے شوق کو بھی پورا کیا۔ عالم

شباب میں انہیں عشق کرنے کے جرم کی پاداش میں آدھے گھنٹے میں اپنی زندگی کا اہم فیصلہ اور فوری طور پر شادی کرنے کا حکم سنایا گیا۔ اس حکم پر آپ کو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ شادی کے بعد آپ کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی کیونکہ پسند کی شادی ہونے کے سبب آپ کو سسرال میں قبول نہیں کیا گیا تھا۔ آغاز میں انہیں رہائش کے لیے جو جگہ دی گئی تھی اسے بھی بعد میں واپس لے لیا گیا۔ آہستہ آہستہ آپ کے میاں کا طرزِ عمل بھی بد سے بدتر ہوتا گیا اور آئے روز بحث و تکرار میں اضافہ ہونے لگا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد نئی مشکلات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے بچوں کی پرورش کے لیے بہت جتن کیے اور محض چند روپوں کی خاطر ترجمہ نگاری اور پروف ریڈنگ کا کام بھی کیا تاکہ اپنے بچوں کے لیے ضرورت کی اشیاء کا بندوبست کیا جا سکے۔

کشور ناہید نے آپ بیتی میں اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اہل مشرقی بنگال نے پاکستانیوں کی سیاسی بے انصافیوں اور سماجی طور پر ظلم و ستم کو مردانہ وار برداشت کیا۔ حالانکہ پاکستان کا قیام نظریہ کی بنیاد پر تھا اور ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر اُبھرا تھا لیکن اہل اقتدار نے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی حق تلفی کے ساتھ ساتھ ان سے ناروا سلوک بھی جاری رکھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بغاوت اور آزاد ملک کے قیام کا مطالبہ کرنے پر ظلم و جبر کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مصنفہ نے اپنی داستانِ حیات میں دوسری جنگِ عظیم سے لے کر تحریکِ آزادی پاکستان، تقسیم ہندوستان، سانحہ مشرقی پاکستان، فوجی آمریت کے ادوار اور ان ادوار کے تناظر میں پیدا شدہ سیاسی و سماجی صورت حال کو بھی اپنے تجزیات کے ساتھ مفصل انداز میں قلم بند کیا ہے۔ آپ بیتی میں درج مختلف قسم کے سیاسی و سماجی عوامل کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے آپ بیتی میں بہت سے سیاسی و سماجی حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ مصنفہ نے اپنی سرگزشت میں دوٹوک انداز میں مختلف سیاسی و سماجی عوامل کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔

”جو رہی سو بے خبری رہی“ از ادا جعفری

اُردو ادب میں ایک منفرد پہچان کی حامل، معروف شاعرہ آدا جعفری ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کو ہندوستان کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا پیدائشی نام عزیز جہاں رکھا گیا بعد میں آپ آدا جعفری کے نام سے اُردو ادب میں متعارف ہوئیں۔ آپ نے کم عمری سے ہی مشق سخن کا آغاز کیا اور آدا بدایونی کے نام سے فکر سخن میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ مصنفہ اختر شیرانی اور اثر لکھنوی سے بذریعہ خط وکتابت اپنی شاعری پر اصلاح لیا کرتی تھیں۔ آپ کے اہم شعری مجموعوں میں ”شہر درد“، ”میں ساز ڈھونڈتی رہی“ اور ”غزالاں تم تو واقف ہو“ شامل ہیں۔ آپ نے ۱۹۹۵ء میں اپنی داستانِ حیات ”جو رہی سو بے خبری رہی“ کے عنوان سے تحریر کی۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے آدا جعفری کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۱ء میں آپ کو تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔

آپ بیتی ”جو رہی سو بے خبری رہی“ میں مصنفہ نے اپنے خاندانی پس منظر، بچپن کی یادوں، ہندوستان کی سماجی صورت حال، سیاسی حالات و واقعات اور ان کا پس منظر، تقسیم ہند کی پر درد کہانی، ہجرت کے مسائل اور ادبی محافل کی تفصیل کو اپنے منفرد انداز میں تحریر کر دیا ہے۔ آپ بیتی کو ۲۹/ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

آدا جعفری نے قیامِ پاکستان سے قبل اپنے بچپن کے مختلف ادوار کو دلچسپ اور معلوماتی پیرایۂ اظہار میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس دور میں ہندوستان کی سماجی روایات کی پابندی کا اہتمام لازماً کیا جاتا تھا۔ آدا جعفری اپنے خاندان کی مخصوص روایات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس دور میں لڑکیوں کی شادیاں کم عمری میں طے کر دی جاتی تھیں۔ ان دنوں شادیاں مختلف خاندانوں کے درمیان کرنے کا رواج نہیں تھا بلکہ شادی کے لیے لڑکے یا لڑکی کا انتخاب اپنے ہی خاندان سے کیا جاتا تھا اور ان کے خاندان میں ایک رواج یہ تھا کہ لڑکی کی شادی پر داماد کو لڑکی کے گھر پر ہی رہنا پڑتا تھا یعنی گھر داماد بننے کی شرط بھی ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں خواتین پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں، جن پر عمل پیرا ہونا ہر خاتون خانہ کی اوّلین ذمہ داری تھی۔ خواتین پر پردہ کرنے کی سخت پابندی تھی۔ مصنفہ اپنے دور کی طرزِ معاشرت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ مشرقی اقدار میں خواتین کو ہمیشہ ثانوی حیثیت ہی حاصل رہی ہے۔ طاقت ور مردوں کے معاشرے میں عورت کا سماجی طور پر استحصال کیا جاتا رہا ہے۔

مرد اپنے اختیارات کو عورت کی رضامندی کے برعکس زیادہ استعمال میں لاتا رہا ہے جس کی وجہ سے حقوق نسواں پر کاری ضرب ہر دور میں لگائی جاتی رہی ہے۔ کہیں بیٹی، بہو، بہن اور ماں کے روپ میں عورت اپنے حصے کی قربانی دیتی آئی ہے۔ دراصل مصنفہ کی پرورش اس دور میں ہوئی جب خواتین مرد کی محکومیت کا شکار تھیں۔ محکومیت کے اس دور میں چند روایات

ایسی بھی تھیں جن سے خواتین کے بنیادی حقوق تک متاثر ہوتے تھے اور وہ اپنی خواہشات تک کا برملا اظہار کرنے سے قاصر تھیں۔ ہندوستانی جاگیردارانہ سوچ کے پیچھے بہت سے پہلو کارفرما رہے اور یہ سوچ اتنی پروان چڑھی کہ معاشرے میں مردوں نے خواتین کو بھی اپنی جاگیر ہی سمجھنا شروع کر دیا۔

ہندو معاشرت میں تو عورت کا بہت ہی برا حال رہا ہے لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے بھی دیکھا دیکھی خواتین کے حقوق کو سلب کرنے کی روایت کو جاری و ساری رکھا ہے۔ ان روایات کے زیر اثر خواتین کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ مصنفہ اپنے خاندان کی روایات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کے خاندان میں روایت چلی آ رہی تھی کہ لڑکے یا لڑکی کی شادی اپنے خاندان میں ہی ہو سکتی تھی۔ خاندان سے باہر شادی کا سوچنا بھی منع تھا۔ ہندوستان میں ان دنوں جاگیردارانہ سوچ مسلط تھی۔ بہت سے مسلم گھرانے زمین اور جائیداد پر عورت کی وراثت کا حق دینے کے قائل تھے لیکن خواتین کو اپنی پسند کی شادی یا آزاد زندگی گزارنے کی ہرگز اجازت نہیں تھی۔ اس دور میں خواتین پر بہت سی معاشرتی قدغنیں لگائی جاتی تھیں اور عورت کا شادی کے بغیر زندگی گزارنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ اس سماجی ماحول میں مصنفہ نے نہ صرف شاعری کی بلکہ اپنی شاعری کو ہندوستان میں باقاعدہ چھپوایا بھی تھا۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے قریباً ہر گھر میں خواتین پر بہت سی سماجی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ جو خاندان معاشرے میں جتنا عزت دار خیال کیا جاتا تھا۔ گھر میں ان کی خواتین پر اتنی ہی سخت قسم کی پابندیاں رائج ہوتی تھیں۔

مصنفہ آپ بیتی میں تحریر کرتی ہیں کہ میں اس سماج کا باقاعدہ حصہ رہی ہوں جہاں خواتین کو معاشرے کی حقیر چیز سمجھ کر کوئی حیثیت اور مقام نہیں دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی سماجی صورت حال میں ان کا علم احتجاج بلند کرنا کسی کام کا نہ سمجھا جاتا لیکن مصنفہ نے اپنے جذبات اور احساسات کو شاعری کے ذریعے ظالم سماج تک پہنچانے اور خواتین کے مصائب کو تمام دنیا کے سامنے بیان کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مصنفہ کی والدہ بڑی باہمت خاتون تھیں، جن کے نقش قدم پر چل کر آپ نے بھی جرأت اور بہادری کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا حالانکہ آپ کی والدہ اس سماج میں رہ رہی تھیں جہاں پر سماجی روایات سے روگردانی کرنا مردوں کو مہنگا پڑ سکتا تھا وہاں ایک عورت ہو کر خاندانی روایات سے ٹکرا لینا بہت حوصلہ کی بات تھی۔ مصنفہ کی والدہ چونکہ کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں اس لیے اپنے بچوں کی بہترین دیکھ بھال کرنا اور ان کے بہترین مستقبل کے لیے اقدامات کرنا نہایت دشوار کام تھا جس کو آپ کی والدہ نے بطریقِ احسن سرانجام دیا تھا۔

ان دنوں ہندوستانی گھرانوں میں تعلیم نسواں ایک معیوب چیز سمجھی جاتی تھی لیکن آپ کی والدہ نے اپنی بڑی بیٹی کی تعلیم کے لیے باقاعدہ سکول اور کالج میں داخل کروانے کی بجائے فارسی اور انگریزی کے مضامین پڑھانے کے لیے ایک استاد کا بندوبست کیا تاکہ لڑکی کی تعلیم کو جاری رکھا جا سکے۔ اس بات کا علم جب خاندان کے لوگوں کو ہوا تو تعلیم نسواں کے خلاف سخت

ردِعمل دیکھنے میں آیا لیکن آپ کی والدہ نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے فیصلے پر عمل درآمد کروایا جس کی بدولت خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم کے حصول کے دروازے کھلنا شروع ہو گئے تھے۔

آوا جعفری کی آپ بیتی میں سماجی صورت حال کے بارے میں تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اس عہد میں سماجی روایات نے معاشرے کو اپنے پنجوں میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس دور میں سماجی خودساختہ اقدار سے چاہ کر بھی دامن نہیں چھڑایا جا سکتا تھا، لیکن مصنفہ کی والدہ نے عزم و ہمت سے ایسے فیصلے لیے جن سے سماجی روایات کی نفی ہوتی تھی۔ آپ کی والدہ نے خاندانی روایات سے پہلوتہی کرتے ہوئے نہ صرف اپنی لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی غیر خاندان میں کر دی تھی۔

آپ بیتی میں مصنفہ ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا جو کہ اس بات کی واضح دلیل تھا کہ اب ہندوستان میں ایک سیاسی بیداری کی لہر نے سر اُٹھانا شروع کر دیا ہے اور یہاں کی اقوام اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سیاسی طور پر میدانِ عمل میں آ گئی ہیں۔ ۱۹۳۰ء الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے جلسے میں علامہ محمد اقبال نے اپنی تقریر میں پہلی بار مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خودمختار وطن پاکستان کے لیے عملی جدوجہد کا اعلان کیا۔ بعدازاں ۱۹۳۵ء میں کانگریسی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تو مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے مزید محروم کرنے کی ہندوانہ پالیسی کو آگے بڑھایا گیا۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے باقاعدہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کے طور پر یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کی زبان ''ہندی'' ہو گی اور پورے ملک میں ''دیوناگری'' رسم الخط رائج کیا جائے گا۔ گاندھی کا یہ اعلان صریحاً تنگ نظری پر مشتمل تھا۔ کیونکہ اُردو مسلمانوں کی زبان تھی اور اُردو کو پورے ہندوستان میں قرآنی رسم الخط میں تحریر کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف سی پی کی حکومت نے ایک نئی سکیم ''وڈیا مندر اسکیم'' کے تحت مسلمانوں کی نہ صرف زبان بلکہ شناخت کو ہی ختم کرنے کی مزموم حرکت کی۔ ۱۹۴۴ء تک کانگریسی ہندوؤں کی اُردو زبان کے ساتھ دشمنی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہندو مہاسبھا کے صدر سوار کرنے تو اُردو زبان کے خلاف ہفتہ منایا تھا۔ اُردو سے ہندو دشمنی کے جواب کے طور پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام سی پی کے شہر ناگ پور میں آل انڈیا اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا۔ مسلمانوں نے اُردو کانفرنس میں جوق در جوق شرکت کر کے اسے کامیاب بنایا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قراردادِ پاکستان کا منظور ہونا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مسلم لیگ کے ساتھ وابستگی میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری نے مسلمانوں کے سامنے اپنے آزاد ملک کے حصول کی منزل کا تعین کر دیا تھا:

> ''تحریکِ پاکستان کی ممانعت بھی بڑے پیمانے پر ہوئی۔ پورے ملک میں ہنگامے اور
> فسادات شروع ہو گئے تھے لیکن یہ تحریک عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرتی رہی

لوگوں کے جوش اور جذبے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔"(۸)

آپ بیتی میں مصنفہ تحریر کرتی ہیں کہ قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ایک مثبت انقلابی تبدیلی نے جنم لیا۔ ہر خاص و عام کے دل میں مسلم لیگ کے ساتھ جذباتی اور عملی وابستگی کا اظہار ایک فطری امر تھا۔ ان دنوں مسلم قوم کے لیے پاکستان کا قیام مقصد حیات اس طرح بن گیا گویا یہ ان کے لیے دینی فریضہ اور دنیاوی حق کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ بنیادی انسانی حق "آزادی" کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ ۱۹۴۶ء میں بہار اور میرٹھ میں مسلمانوں کو آزادی کے حق کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہانا پڑا۔ آہستہ آہستہ پورے ملک میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی مسلمانوں سے انتقام کی آگ کسی قدر کم نہیں ہو رہی تھی بلکہ ہر آنے والا دن اذیت ناک ثابت ہوتا رہا اور مسلم قوم کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ شہر شہر اور قریہ قریہ خون ریزی اور غارت گری کے ہولناک مظاہرے دیکھے جانے لگے تھے۔ اس صورت حال کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

"قیامِ پاکستان کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر جو نقل مکانی ہوئی وہ اسی خون چکاں، آسیب زدہ اور غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ تھی۔"(۹)

تحریکِ آزادی کی کامیابی اور تقسیم ہندوستان کے عوامل کے تناظر میں مصنفہ قیامِ پاکستان کے بعد کے مسائل کے بارے میں بھی مفصل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو ان کے سامنے دو قومی زبانوں کو سرکاری زبانوں کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا گیا، تو آپ نے واضح انداز میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہی ہو گی۔ اُردو کے تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی۔ مشرقی پاکستان میں تو خصوصی طور پر انیسویں صدی کے آغاز سے ہی اُردو ادب کو خاص پذیرائی حاصل رہی تھی۔ بہت سے بنگال کے شعراء اور نثر نگاروں نے اُردو اور فارسی میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۵۳ء میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دو قومی زبانوں کو رائج کرنے کا فیصلہ ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان کا احساس محرومی آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتا گیا۔ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور اقتدار کی ہوس میں انہوں نے اہل مشرقی پاکستان کا استحصال کیا۔

آپ بیتی میں مصنفہ کا سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب کے بارے میں کہنا ہے کہ جنرل ایوب خان کا ملک میں سیاسی پابندیوں کا عمل مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا پہلا سبب بنا اور پورے ملک میں سیاسی جمود پیدا ہوا اور علاقائی سیاست کو پروان چڑھایا گیا۔ ملک میں وفاق کی سیاست کا عمل یکسر ختم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا جو کہ قیامِ پاکستان کی اساس تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کی

ایک اور اہم وجہ کے بارے میں مصنفہ آپ بیتی میں لکھتی ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندو اساتذہ کی بہت بڑی تعداد تعلیمی اداروں میں پڑھا رہی تھی۔ مختلف تعلیمی کورسز کی کتب بھارت سے چھپی ہوئی تھیں جو کہ نظریہ پاکستان سے متصادم تھیں۔ اس وقت کے اہل اقتدار نے اس بنیادی بات کو سمجھنے اور اس کے تدارک میں بہت تاخیر کر دی جس کی بنا پر تعلیمی اداروں میں بیٹھے ہندو اساتذہ نے طالب علموں کے ذہنوں میں وہ زہر بھر دیا جو علیحدگی کا ایک اہم سبب بنا۔

آدا جعفری کی آپ بیتی بیسویں صدی کی ایک ادبی تاریخ کی حامل کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ ان اہم عوامل کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کرواتی ہے جن کی بنا پر ہم بلاشبہ اس آپ بیتی کو ایک معیاری آپ بیتی کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اس بارے میں غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> "آدا جعفری کی یہ خودنوشت ہمارے نزدیک پاکستان میں لکھی جانے والی خودنوشتوں کا نقطہ کمال ہے۔ یہ ایک بھرپور ادبی شخصیت کی بھرپور سرگزشت ہے۔"(۱۰)

آدا جعفری کی آپ بیتی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں آپ بیتی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ان کا گہرا سیاسی وسماجی شعور بھی ہمیں پڑھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرگزشت میں بے لاگ تجزیات اور تبصرہ جات کے ذریعے قاری کو بھی ایک منفرد انداز سے سوچنے کی ترغیب دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے انیسویں صدی کی اہم ادبی، سیاسی وسماجی تحریکوں، تقسیم ہند کے اسباب، قیامِ پاکستان کے بعد پیدا شدہ مسائل، آمریت کے مختلف ادوار کے تناظر میں ملکی حالات، سیاسی حکمرانوں کا طرزِ عمل، سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب، پاکستان کے سیاسی افق پر غیر ملکی مداخلت کے اثرات اور مصنفہ کے مختلف ممالک کے اسفار کا مفصل احوال تحریر کر دیا ہے۔

”شناسائیاں، رسوائیاں“ از کشور ناہید

اُردو ادب کی نامور شاعرہ، کالم نگار اور ترجمہ نگار کشور ناہید کی تحریر کردہ دوسری آپ بیتی ”شناسائیاں رسوائیاں“ ہے۔ یہ آپ بیتی ۳۵ ابواب میں منقسم، ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ۲۰۰۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ آپ بیتی کے ابواب کے عنوانات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے: دنیا کی وہی رونق۔ صوفی صاحب، مرے دل مرے مسافر۔ فیض صاحب، برگد تلے۔ پرانے چہرے، میں نغمہ گر ہوں۔ نور جہاں، بہت قریب سے دیکھا۔ مختلف ادیبوں کے بارے، دل کی چڑیا۔ شاکر علی، میرے بھی صنم خانے۔ قرۃ العین حیدر، مجھے سب ہے یاد۔ ریڈیو پاکستان لاہور، اپنا اپنا جہنم۔ جمیلہ ہاشمی، آگے سمندر ہے۔ انتظار حسین، پھول کھلنے کے زمانے آئے۔ احمد فراز، چاروں جانب سناٹا ہے۔ حبیب جالب، فنکاروں کی نئی بستی۔ پی ٹی وی، رنجشوں کا رفیق۔ یوسف کامران، مصوری کے شناور۔ پاکستان میں، مصوری۔ ہندوستان میں، مصوری کا ڈونچی۔ علی امام، لاہور کے طباعتی ادارے، عالم گردی، مکان کو گھر بنانے والا۔ افتخار عارف، گنگا کنارے، زم زم شخصیت۔ نیاز احمد، ساقی گری، ساقی فاروقی، کراچی میں دوستوں کی بستیاں، جیئے بھٹو کی بازگشت، تہذیب کا ارتقاء۔ سید سبط حسن، مشاعروں کی طرح داریاں، عورتوں کی مسافت، کلچر کا رزمیہ، اسلام آباد کا منظر نامہ، ستارہ سحری ہمکلام کب سے ہے، صحافت کا شامیانہ، میں اور میری پنجابی، فلمی ستاروں کی دنیا جو ڈوب گئی اور زندگی سے مکالمہ۔ مصنفہ آپ بیتی کے پہلے باب میں اس دور کی سماجی صورت حال، رکھ رکھاؤ اور شاعری میں ان کے استاد صوفی تبسم کے طرزِ عمل کے بارے میں تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ صوفی تبسم کے برے میں مصنفہ آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

> ”مجھے میرے ماں باپ نے لفظ بولنے سکھائے مگر لفظ لکھنے کے شوق کو فراواں اور عزت دی تو وہ پہلے شخص صوفی تبسم تھے۔“(۱۱)

اُردو ادب کے معروف شاعر صوفی تبسم کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ انہوں نے صوفی صاحب سے شاعری کے اصول وضوابط سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے اس کا اظہار اپنی آپ بیتی میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ صوفی صاحب چونکہ ان کے محلے دار تھے۔ اس لیے کشور ناہید ان سے اپنی شاعری پر اصلاح لیا کرتی تھیں۔ مصنفہ صوفی تبسم کے بارے میں مزید بیان کرتی ہیں کہ ان کی بیوی فوت ہو چکی تھیں۔ ان کے گھر میں دو بیوہ بہنوں، ایک بھائی کی اولاد کے ساتھ ساتھ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی رہائش پذیر تھے۔

پہلے باب میں بیان کردہ اپنی یادوں کو سمیٹتے ہوئے لکھتی ہیں کہ زمانہ طالب علمی میں اچانک ان کی پسند کی شادی یوسف کامران کے ساتھ ہو گئی۔ شادی کے بعد ان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مصائب کے دوران صوفی تبسم کے

مشفقانہ رویے کا بھی مصنفہ نے اظہار کیا ہے۔ کشور ناہید اس دور کی سماجی صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''اتوار کی دوپہر کو اکثر ٹب میں بیئر کی بوتلیں لگا دی جاتیں۔ دوست آتے جاتے، بیئر کی بوتل اُٹھاتے، چاہتے تو گلاس میں ورنہ بوتل ہی سے پینا شروع کرتے۔ فلسفہ، ادب، ابن عربی، سوویت روس، کوہ قاف، گویا ہر دفعہ ایک موضوع ہوتا، جس پر سب لوگ بے تکلفی سے بحث کرتے۔''(۱۲)

درج بالا اقتباس میں کشور ناہید نے اپنے دور کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے ادبی محافل میں شراب نوشی کا استعمال اور ضیاء الحق کی آمریت کے دور کا تذکرہ کیا ہے۔ بھٹو کے دور حکومت میں شراب پر پابندی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن جیسے ہی ضیاء الحق کے دور حکومت کا آغاز ہوا شراب کی دکانیں بند اور بہت سے شراب کے لائسنس منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ کشور ناہید نے پاکستان کی سیاسی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ادیب حضرات خصوصاً احمد فراز کے خلاف فوج کی کارروائی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ابھی بھٹو صاحب نے فوج کو کچھ زیادہ اختیارات دینے شروع کیے تھے کہ فراز کو تاؤ آ گیا۔ اس نے فوج کے خلاف نظم لکھ دی۔ معتوب بھی ایسے ہوئے کہ پندرہ دن تک خبر نہ ہوئی کہ کہاں ہے۔''(۱۳)

فوج کے خلاف نظم لکھنے پر احمد فراز زیر عتاب رہے۔ انہی عوامل سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے رخت سفر باندھا اور اپنے بھائی کے پاس لندن میں قیام پذیر ہو گئے۔ مصنفہ احمد فراز کے بارے میں بتاتی ہیں کہ وہ عاشق مزاج قسم کے شاعر تھے اور ہمیشہ دل کی بات کو منہ پر کہہ دیتے تھے، چاہے دوستی کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

آپ بیتی میں مصنفہ نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پاکستان کی سیاسی صورت حال کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کشور ناہید آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

> ''۱۹۶۴ء ایک بڑا موڑ تھا۔ حبیب جالب اور پاکستان کی سیاست کا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے صدارت کا الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔ ایک دم مولوی بھی جاگ گئے اور کمال یہ ہے کہ انھوں نے فاطمہ جناح یعنی ایک خاتون کے صدر بننے کی حمایت کی۔''(۱۴)

قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح عملی سیاست سے دور ہو گئی تھیں اور جنرل ایوب خان کے مدمقابل انتخابات میں حصہ لینے کا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ چونکہ محترمہ فاطمہ جناح بہت متوازن اور انصاف پسند خاتون تھیں اس لیے وہ انتخابات کے جھمیلے سے حتی المقدور دور رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ حزب مخالف کی سیاسی جماعتوں اور مختلف سیاسی رہنماؤں

میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں کھڑے نہ ہونے کے فیصلے سے بہت مایوسی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک عام تاثر یہ پیدا کیا گیا کہ شاید جنرل ایوب خان اور ان کے ساتھیوں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ان کو انتخابات میں حصہ لینے سے روکا ہے لیکن بعد میں مولانا بھاشانی کے کہنے پر محترمہ نے الیکشن میں کھڑے ہونے کی حامی بھر لی تھی۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ سوچی سمجھی حکمت عملی سے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کو ہروا دیا گیا تھا۔ کشور ناہید آپ بیتی میں ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی کردار کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''بھٹو کی ذہانت اور دیانت کی بات آج تک ہوتی ہے۔ وہ شخص جس کے پھانسی چڑھنے پہ لکھنؤ سے لے کر لندن تک لوگ رو رہے تھے۔ اس نے کیا کیا طریقے اختیار کیے تھے۔ عام آدمی کے دل پر راج کرنے کے۔''(۱۵)

آپ بیتی میں مصنفہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکمرانی کی سیاسی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ ان کی ذہانت اور دیانت کا اقرار ہر دور کے سیاست دان کرتے ہیں لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی چند سیاسی حکمت عملیوں کی وجہ سے انہیں نقصان بھی اُٹھانا پڑا تھا۔ مصنفہ آپ بیتی میں جنرل ایوب خان کے خلاف چلنے والی تحریک کی سیاسی صورت حال کو واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اس دوران ایوب خان کے خلاف تحریک چلی۔ پہلی تحریک تو محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی الیکشن لڑنے کے باعث چلی۔ یہ بھی عورتوں، مردوں کی نامساوی حیثیت کے حوالے سے نہیں تھی۔ یہ تو آمریت کے خلاف تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی فاطمہ جناح کی حمایت کر رہی تھی۔۔۔ فاطمہ جناح کو شکست دلوائی گئی۔''(۱۶)

کشور ناہید آپ بیتی کے درج بالا اقتباس میں جنرل ایوب خاں کی حکومت کے آخری دور کے سیاسی منظر نامے کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اصولی طور پر ایک عورت کی حکمرانی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے بالآخر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔

خواتین کے حقوق کے حوالے سے مصنفہ نے لکھا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں خواتین کے لیے بھی ۲۰ نشستیں مخصوص کر دی گئی تھیں اور تمام محکمہ جات کو خواتین کو ملازمتوں میں اور بڑے عہدوں پر لانے کی تاکید کی گئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد کی سیاسی وسماجی صورت حال کے بارے میں مصنفہ رقم طراز ہیں:

> ''خیر سے بھٹو صاحب کی پھانسی اور عورتوں کے بارے میں حدود آرڈیننس آگئے

پیچھے آئے۔ پتہ چلا کہ جیلیں عورتوں سے بھر گئیں کہ کسی نے اپنی ماں کو، کسی نے بیوی کو اور کسی نے بہن کو زنا کے نام پر اندر کرایا۔"(۱۷)

کشور ناہید نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دور کی سیاسی و سماجی صورت حال کو بڑے اختصار سے بیان کیا ہے کہ کس طرح حدود آرڈیننس کے بعد قانون شہادت لاگو کیا گیا اور قصاص اور دیت کے قوانین وضع کیے گئے۔ ان قوانین کے بعد شریعت کا قانون نافذ کیا گیا اور ساتھ ہی جنرل ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ کے ذریعے ان قوانین کو آٹھویں ترمیم کر کے لاگو بھی کروا دیا گیا۔ آپ بیتی میں کشور ناہید اٹھائیسویں باب بعنوان "عورتوں کی مسافت" میں خواتین کی سماجی صورت حال کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ خواتین کی نمائندگی کے مسئلہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"عورتوں کی نمائندگی کا مسئلہ ۱۹۷۳ء میں شروع ہوا تھا۔ جب اقوام متحدہ کا جائزہ شائع ہوا کہ ان کے دفتر میں 0.3 فیصد خواتین کام کرتی تھیں۔ فیصلہ ہوا کہ اس شرح کو معتدبہ حد تک بڑھایا جائے اور دنیا بھر کو ترغیب دی جائے کہ عورتوں کی ملازمت کی شرح اور فیصلہ کن حیثیت میں اضافہ کیا جائے۔"(۱۸)

۱۹۷۵ء میں جب خواتین کے دس سالہ جشن کے منائے جانے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مصنفہ نے اسی سلسلہ میں خواتین کی ایک عالمی کانفرنس کی ایجنڈا میٹنگ منعقدہ ۱۹۷۴ء ایسٹ برلن میں بطور خاص شرکت کی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں ماسکو کانفرنس اور ۱۹۸۵ء میں ہندوبی کانفرنس جس کی سربراہی ویف لاہور سے نگہت سعید خاں نے کی اس میں بھی مصنفہ شامل تھیں۔ یہ تمام کانفرنس خواتین کی آزادی کے حصول کے لیے منعقد کروائی گئی تھیں۔

مصنفہ نے آپ بیتی میں طاقت ور مردوں کے معاشرے میں بے بس، لاچار اور حقوق کی ماری خواتین کی تصویر کشی کی ہے۔ اپنے بارے میں کہتی ہیں کہ انہوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں خواتین کے بارے میں لکھنے کا عملی طور پر آغاز کیا۔ آپ بیتی میں اس بارے میں رقم طراز ہیں:

"این۔جی۔اوز کو مغرب زدہ کہہ کر، اپنی برقعہ زدہ عورتوں کو مساوی تعداد میں باہر نکال رہے تھے۔ حکومتیں بھی خوب چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھیں۔"(۱۹)

مصنفہ چونکہ خاتون ہیں اس لیے ان کا زاویہ نظر مردوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کو ایک خاتون کی نظر سے دیکھ کر ضبط تحریر میں لاتی ہیں۔ آپ بیتی میں انہوں نے خواتین کی مخصوص معاشرتی اور سماجی سوچ کو بیان کیا ہے۔ آپ بیتی میں مصنفہ "امن کی تحریک" کے بارے میں لکھتی ہیں:

"عورت ہی سے منسلک دوسری تحریک جس نے تقویت پکڑی، وہ تھی امن کی تحریک۔

لوگ ایٹم بم بنانے پہ خوش تھے۔عورتیں اور دانشور کہہ رہے تھے کہ جتنے میں ایٹم بم بنتا ہے اتنے میں تو لاکھوں سکول کھولے جا سکتے ہیں۔''(۴۰)

مشرق کے جاگیردارانہ مزاج اور طرزِ حیات میں خواتین کو بھی ہمیشہ سے جاگیر ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔خواتین کو ان کے بہت سے جائز حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک حقوق کی محرومی نے خواتین کو احساسِ کمتری کا شکار ہی بنائے رکھا ہے۔

کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں ایک باب بعنوان ''اسلام آباد کا منظر نامہ'' میں دارالحکومت میں بیتے بارہ سالوں کا احوال مختصر انداز میں بیان کرتی ہیں کہ اسلام آباد کے شہر نے بہت سے سیاسی حکمرانوں کے عروج و زوال دیکھے ہیں، یہاں سیاسی اکابرین سے لے کر بڑے بڑے آمریت پسند جرنیلوں کی داستانیں بھی ملتی ہیں۔اسلام آباد کی سماجی زندگی کی صورت حال کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

''اسلام آباد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جگہ سے ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے سے پاکستان شروع ہوتا ہے۔اسلام آباد میں اب تو دوسرے لوگ بھی آباد ہیں مگر زیادہ تر سرکاری ملازم وہ ہیں جو ایک کوارٹر الاٹ کراتے ہیں۔''(۴۱)

آپ بیتی کے اس باب میں مصنفہ نے اسلام آباد کی سیاسی و سماجی صورت حال کو واضح کرنے کے لیے بہت سی مثالوں کو پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ اسلام آباد میں رشوت کی بجائے اس دور میں تحائف لیے جاتے تھے چاہے وہ کوئی پلاٹ کی صورت میں ہو یا کسی کے بنک اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروانے ہوں۔اسلام آباد کی ادبی، سیاسی اور سماجی صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اسلام آباد میں ایک فرقہ صدارتیہ ہے۔ ایک فرقہ تقریریہ ہے۔ایک فرقہ جلسیہ ہے۔کچھ لوگ جلسے میں آتے ہیں اگر ان کی صدارت ہو، کوئی تخصیص نہیں کہ علمی جلسہ ہے کہ مذہبی۔''(۴۲)

درج بالا اقتباس میں مصنفہ نے اسلام آباد کے موقع پرست لوگوں کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ایسے لوگوں کا تعلق ادب، صحافت، سیاست اور سماج کے مختلف دوسرے عوامل سے ہوتا ہے۔ملکی سیاسی صورت حال کے بدلتے تناظر میں مصنفہ نے خفیہ ایجنسیوں کے طرزِ عمل کو بھی مؤثر انداز میں تحریر کیا ہے۔

آپ بیتی میں جن نامور ادبی، صحافتی، مذہبی، سرکاری وغیر سرکاری، سیاسی اور سماجی شخصیات کا مصنفہ سے میل ملاپ رہا ان کے بارے میں تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔آپ بیتی کے ابواب میں جن شخصیات کے بارے میں لکھا گیا ہے ان میں

صوفی تبسم، فیض احمد فیض، ایم اسلم، امتیاز علی تاج، عطا اللہ شاہ بخاری، نور جہاں، شاکر علی، قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، احمد فراز، حبیب جالب، یوسف کامران، علی امام، افتخار عارف، نیاز احمد، ساقی فاروقی اور سید سبط حسن شامل ہیں۔

آپ بیتی ''شناسائیاں، رسوائیاں'' میں جہاں سیاسی و سماجی صورت حال کا بیان جا بجا ملتا ہے وہاں بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز کا ادبی منظر نامہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ آپ بیتی پاکستان کی سیاست، سماج سے جڑی اقدار اور ادبی ماحول کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہے۔

''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' از فرخندہ بخاری

فرخندہ بخاری کی روداد حیات ''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والی سیاسی و سماجی تناظرات سے بھرپور آپ بیتی ہے۔ اس خودنوشت کو ۳۴ ابواب میں تقسیم اور ۲۷۲ صفحات پر تحریر کیا گیا ہے۔ مصنفہ کے آباؤاجداد کشمیر کے رہنے والے تھے جو کہ سری نگر سے امرتسر پہنچے، کچھ عرصہ وہاں قیام کیا۔ امرتسر میں حالات خراب ہوئے تو اندرون لاہور شہر کی ایک معروف گلی کاغذیاں میں رہائش پذیر ہو گئے۔ آپ کے والد میونسپل کمیٹی میں لیٹی گیشن آفیسر کے عہدے پر تعینات تھے اور آپ کے دادا پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔

مصنفہ کو بچپن میں عملی سیاست سے آشنائی اس طرح ہوئی کہ ان دنوں آپ کی پھوپھیوں اور ان کے بیٹوں نے علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک میں باقاعدہ رکنیت حاصل کی تھی اور تحریک میں فعال کارکنان کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ ان دنوں خاکسار تحریک کے کارکنان کی خاکی وردیاں ہوتی تھیں اور ہاتھ میں بیلچے لیے چاک و چوبند دستے خوش نما معلوم ہوتے تھے۔ تحریکِ آزادی اور اپنے جائز حقوق کے حصول کی خاطر انگریز دور میں آپ کی پھوپھیاں اور ان کے بیٹے حوالات میں قید کاٹ چکے تھے۔

آپ بیتی میں قیام پاکستان کے دور میں ہندو مسلم فسادات اور ہجرت کے مصائب کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان دنوں لاہور چھاؤنی کے علاقے میں دو کیمپ والٹن اور باؤلی بنائے گئے تھے۔ بھارت سے آنے والی ریل گاڑیوں میں مہاجرین کو راستے میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ مصنفہ کی والدہ، خالائیں اور پھوپھیاں جو کہ خاکسار تحریک کی کارکن تھیں۔ والٹن کیمپ میں زخمی مہاجرین کی تیمارداری کرنے کے لیے باقاعدگی سے جایا کرتی تھیں۔ اس کیمپ میں دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کو مہاجرین کی ریل گاڑی میں لایا گیا، جن کی عمریں محض چند دن یا ماہ کی تھیں۔ ان بچوں کو مصنفہ کے خاندان نے لاوارث سمجھ کر اپنے کنبے کا حصہ بنا لیا تھا۔

آپ بیتی میں پاک بھارت جنگ کے بارے میں تحریر ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں

جنگ کا باقاعدہ آغاز لاہور پر بھارتی حملے سے ہوا۔عوام کو اس جنگ سے یہ اُمید تھی کہ شاید اب مسئلہ کشمیر حل ہونے والا ہے۔ جنگ کے بعد اعلان تاشقند نے عوام میں ایک سیاسی طور پر بے چینی پیدا کر دی تھی حالانکہ عوام اٹھارہ سال سے جاری کشمیر کے تنازعے کے مستقل حل کی خواہش مند تھی۔اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں ایک پر جوش تقریر کی اور بعد میں اعلان تاشقند کے اعلان پر انہوں نے حکومت سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ان دنوں ایوب خان کی حکومت کے خلاف سیاسی جماعتیں اتحاد پر رضامند ہونے لگی تھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی اور روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کیا۔۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو زیادہ نشستیں حاصل ہوئیں، پنجاب میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔مجیب الرحمٰن نے چھ نکات پیش کیے۔جبکہ جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں نے اقتدار کے لالچ میں اس سیاسی بحران کو مزید ہوا دی۔۱۹۷۱ء میں جنرل یحییٰ خان نے اس مسئلہ کا سیاسی حل ڈھونڈنے کے بجائے فوجی طاقت کے استعمال کو ترجیح دی اور مشرقی پاکستان پر طاقت کا استعمال کیا۔حالانکہ بنگالیوں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان میں بہت زیادہ قربانیاں دی تھیں۔اہل بنگال نے مسلم لیگ کے قیام، انگریز حکومت کے خلاف سراج الدولہ کی جنگ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے مثال کردار، بنگال کی تقسیم ۱۹۰۵ء کی بھرپور حمایت، ہندوستان میں مسلم لیگ کی پہلی صوبائی حکومت کا بنگال میں قیام اور ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک حب الوطنی کی قیمت ادا کی۔ان سب عوامل کے بعد جب بنگالیوں نے اقتدار میں آنے کے لیے اکثریت حاصل کر لی تو مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان سے کوئی .ان پر حکومت کرے۔جنرل یحییٰ خان نے فوجی قوت سے طلباء، اساتذہ اور عام عوام پر دھاوا بول دیا۔پاکستانی فوج کی طرف سے اس آپریشن نے ہندوستانی سیاسی قیادت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ محض مذہب مسلمانوں کو متحد نہیں رکھ سکتا۔مسلمان حکمرانی کے قابل نہیں ہیں۔نظریہ پاکستان کا کوئی وجود باقی نہیں رہا اور مسلم عسکری طاقت جس کی تاریخ گواہ ہے ختم ہو چکی ہے۔

مصنفہ کا کہنا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان نازک سیاسی حالات میں اقتدار سنبھالا تو سب سے پہلے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی سے مذاکرات کے ذریعے نوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کو آزاد، بھارتی مقبوضہ علاقوں کو واگزار کرانے کے لیے شملہ معاہدہ کر لیا۔قوم کو مایوسی سے نکالنے کے عملی اقدامات کیے، اسلامی سربراہی کانفرنس کا لاہور میں انعقاد، مسلم ممالک کے اتحاد کی بنیاد رکھی گئی، موثر اور متفقہ ۱۹۷۳ء کا آئین بنایا گیا، صنعتی اور زرعی اصلاحات کا آغاز، نظام تعلیم میں اصلاحات اور نیوکلیئر پروگرام کی بنیاد جیسے احسن اقدامات کیے تھے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے پہلے ملک میں سیاسی جماعتوں نے مل کر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پی این اے نامی سیاسی

محاذ قائم کیا۔ اس میں مفتی محمود، مولانا مودودی، مولانا نورانی، نوابزادہ نصر اللہ اور پیر پگاڑا شامل تھے۔ ملک کے طول وعرض میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے ان دنوں خوب مہم چلائی جاتی رہی۔ مصنفہ نے انہی انتخابات میں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا، انتخابات کے دن حق رائے دہی کے لیے جس پولنگ سٹیشن پر گئیں وہاں پر پیپلز پارٹی کی پولنگ ایجنٹ کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دیتی رہی بالآخر اس حلقے سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب قرار پائے تھے۔ سیاسی اتحاد پی این اے نے نتائج دیکھ کر صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان اس لیے کر دیا کہ انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی ہے اور انتخابات دوبارہ فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں کروائے جائیں۔ انتخابات کے بعد سیاسی جماعتوں کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ بالآخر پیپلز پارٹی اور پی این اے کا معاہدہ ہونے والا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء اور نوے دن میں انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔

آپ بیتی میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو عالمی سازش قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ضیاء الحق نے نوے دن کے بعد انتخابات کو اس لیے ٹال دیا تھا کہ اگر دوبارہ ذوالفقار علی بھٹو کو الیکشن کا موقع مل گیا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا۔ امریکہ چونکہ پہلے سے مسلم ممالک کے وسائل کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس تاڑ میں تھا کہ انہیں آپس میں لڑوا کر ان کے وسائل کو حاصل کر سکے۔ امریکہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ تمام مسلم ممالک کے سربراہان کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا ہو۔ سامراجی طاقتوں کا اس دور میں ایک واضح مقصد یہ تھا کہ کسی طرح بھٹو کو ختم کروا دیا جائے تاکہ پاک چین دوستی کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا جائے اور اگر پاکستان ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا تو بھارتی ایٹمی بالادستی کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

لاہور ہائی کورٹ میں جب بھٹو کے مقدمہ کی سماعت روزانہ کی بنیاد پر کی جا رہی تھی تب مصنفہ کو پتہ چلا کہ ان دنوں بیگم نصرت بھٹو گلبرگ میں قیام پذیر ہیں۔ وہاں سے بیگم بھٹو کے ہمراہ انہیں قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے لایا گیا تو عوام نے پیپلز پارٹی اور بھٹو کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج کیا تو نصرت بھٹو کا لاٹھی لگنے سے سر پھٹ گیا تھا۔ اس لاٹھی چارج اور بھٹو کی گرفتاری کے خلاف مصنفہ اور ان کی چند ساتھی خواتین نے مال روڈ کی مقررہ جگہ پر احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ خفیہ پولیس نے احتجاج کرنے والی خواتین کے گھروں کی باقاعدہ نگرانی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان دنوں مقامی سطح پر ''بھٹو بچاؤ کمیٹی'' کا قیام عمل میں لایا گیا، پمفلٹ اور بینرز کو لکھوایا جاتا، جلسے جلوسوں کے اخراجات کو پورے کرنے کے لیے ٹوکن پرچیاں چھپوائی گئیں، پیپلز پارٹی کے عہدے داروں نے احتجاج کے لیے فنڈز دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم مصنفہ نے بھٹو بچاؤ کمیٹی کے فنڈ میں اپنی سونے کی چوڑیاں اور پانچ سو روپے جمع کروا دیے تھے۔

احتجاجی تحریک کی ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے مصنفہ کو جلد گرفتار کر کے کوٹ لکھپت میں قید کر دیا گیا۔ اسیر خواتین

کی جامہ تلاشی کے بعد ڈاکٹری چیک اپ کروایا گیا۔ اتفاق سے اسی جیل میں بھٹو کو بھی پاگلوں کے سیل کے پاس رکھا گیا تھا۔ مخبوط الحواس لوگوں کے سیل کے ساتھ رکھے جانے کی بھٹو نے شکایت بھی کی تھی لیکن آمر انہیں نفسیاتی طور پر بھی ٹارچر کرنا چاہتا تھا۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ جیل میں بھٹو کے ساتھ اور بہت سے حربے بھی آزمائے جاتے رہے کیونکہ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے راولپنڈی کے راجہ بازار میں کھلے عام ہنری کسنجر کی دھمکی بھرا خط لہرایا جس میں بھٹو سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا ارادہ ترک کردو، اگر تم اس کام سے باز نہ آئے تو تمہیں عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔

بھٹو کی اسیری کے دور میں پیپلز پارٹی میں صرف دو طبقوں کے لوگ رہ گئے تھے، ایک مزدور اور دوسرے نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اس دور میں بہت سے موقع پرست سیاست دان اپنا مال واسباب محفوظ کرنے کی فکر میں تھے، صرف غریب عوام اپنے پرخلوص جذبات کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کے ہمنوا تھے۔ ان دنوں صحافیوں اور عام سیاسی کارکنان کو کوڑے مارے جانا معمول کی بات تھی۔ بالآخر ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور ان کے پسماندگان کو ان کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ بھٹو کو پھانسی دیے جانے پر پی این اے میں شامل سیاسی جماعتوں کے بعض اراکین نے مٹھائی بانٹی اور پیپلز پارٹی کے نامور کارکنان کے گھر بھی مٹھائی بھجوائی گئی تھی۔

مصنفہ کے مطابق جنرل ضیاء الحق کو امریکہ نے روسی افواج کے خلاف افغانستان میں جہاد کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ اصل میں امریکہ افغانستان میں جو کھیل کھیلنا چاہتا تھا، وہ کھیل شاید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت انہیں کبھی نہ کھیلنے کی اجازت دیتی، اس لیے امریکہ کو پاکستان میں امریکہ نواز حکومت کی اشد ضرورت تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد مصنفہ کا گھر پیپلز پارٹی کی خواتین کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس سیاسی جدوجہد کے دور میں ان کی ملاقات کنیز یوسف جو کہ کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہ چکی تھیں۔ انہوں نے ایک اجلاس میں کہا کہ پاکستان میں آزادیٔ اظہار پر قدغن لگا دی گئی ہے اس لیے کارکنان کو چاہیے کہ وہ ترکی میں سیمینار منعقد کر کے اپنے سیاسی مطالبات کو دوسرے ملکوں کے لوگوں تک پہنچائیں۔ کنیز یوسف کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ فرخندہ بخاری پیپلز پارٹی کی شیدائی ہے اور بھٹو کے نام پر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہے۔ بالآخر مصنفہ نے ترکی میں سیمینار میں شرکت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تو دو دن میں ان کا پاسپورٹ بنوا دیا گیا۔ کنیز یوسف نے مصنفہ کو اسلام آباد ایئرپورٹ پر تسلی دی کہ استنبول ایئرپورٹ پر ان کا بھائی بریگیڈیئر عثمان خالد ان کو ملے گا۔ ترکی میں چند روز گزارنے کے بعد انہیں لیبیا میں لیکچرز سننے کے لیے بھجوا دیا گیا۔ مصنفہ نے ان لوگوں کی غلط بیانی پر برہمی کا اظہار کیا لیکن اب ان کے پاس لیبیا جانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لیبیا میں قیام کے دوران پاکستانی سیاسی وفد کو لیکچرز دیئے گئے۔ آخری لیکچر لیبیا کے صدر قذافی نے پیپلز ہال میں دیا تھا۔ ان لیکچرز کے چند روز بعد مصنفہ واپس پاکستان پہنچ گئیں۔

مصنفہ کو وطن واپسی پر گھر سے فوجیوں نے یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ معمولی سی انکوائری کے بعد انہیں واپس چھوڑ دیا جائے گا۔ فوجیوں نے مصنفہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھوں کو بھی باندھے رکھا۔ وہاں پر چھ فوجی افسران نے انہیں کہا کہ آپ ہمیں لکھ کر دیں کہ آپ کو بیگم نصرت بھٹو نے لیبیا بھیجا تھا۔ اس کے بدلے میں انہیں ہر طرح کی مالی معاونت فراہم کی جاتی رہے گی۔ مصنفہ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تو ان پر تشدد کیا جاتا رہا لیکن ان کا عزم اور حوصلہ میں کمی نہیں آنے پائی۔ آپ نے دورانِ اسیری بھوک ہڑتال کر دی جس کی وجہ سے نقاہت بڑھنے لگی تو خاکی وردی میں ملبوس ڈاکٹر کو چیک اپ کے لیے بلوایا گیا، جس کے اصرار کرنے پر مصنفہ نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ بالآخر ایک مسافر بردار ہوائی جہاز کو ہائی جیکروں نے اغوا کر لیا اور پیپلز پارٹی کے اسیران کی رہائی کا فوری مطالبہ کر دیا جس پر قیدیوں کو بذریعہ ہوائی جہاز دمشق پہنچایا گیا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد کچھ لوگوں کو لیبیا بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں سے مصنفہ کو بڑی تگ و دو کے بعد انگلینڈ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

فرخندہ بخاری کے خاوند شہرت بخاری ان دنوں اسلامیہ کالج سول لائن سے ریٹائرمنٹ حاصل کر کے انگلستان روانہ ہو گئے تھے۔ آپ کو مشرقی لندن میں ہیکنی کے علاقے میں سیاسی پناہ گزینوں کے طور پر حکومت کی طرف سے ایک مکان دیا گیا تھا۔ مکان چوتھی منزل پر آخری فلیٹ تھا جس کی حالت انتہائی خراب تھی، آہستہ آہستہ اس فلیٹ کو رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مصنفہ کو معلوم ہوا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو لندن آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ لہٰذا انہوں نے لندن پہنچنے پر محترمہ بے نظیر سے ملاقات کی۔ پہلی ملاقات کے بعد باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ بی بی نے انگلستان میں پیپلز پارٹی کی تنظیم سازی پر وقت صرف کیا۔ آپ برطانوی میڈیا کے انٹرویوز میں اپنی تکالیف کو کم اور کارکنان کے مصائب کا زیادہ ذکر کرتی تھیں۔ انہوں نے لندن میں منظم جلسے کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس پر بھرپور عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ فرخندہ بخاری آپ بیتی میں محترمہ بے نظیر کی عملی سیاسی تربیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''محترمہ بے نظیر کی ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی میں سیاسی کام اور تربیت شروع ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب کو اپنی اولاد میں محترمہ بے نظیر کے اندر سیاست کے زیادہ جوہر نظر آئے اسی لیے وہ شملہ کے مذاکرات میں چھوٹی سی بے نظیر کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ دراصل وہ بے نظیر کی تربیت کر رہے تھے۔ اسی معاہدے کے تحت ۹۰ ہزار جنگی قیدی اور بہت سا علاقہ اندرا گاندھی نے واپس کیا تھا۔ وہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔''(۲۳)

شاہ نواز بھٹو کی اچانک موت پر بی بی کو اپنے بھائی کی تدفین کے لیے وطن واپس آنا پڑا تو تدفین کے بعد بی بی کو نظر بند کر دیا گیا۔ وزیراعظم جونیجو کے دور میں پاکستان کے سیاسی حالات میں مثبت تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ بالآخر جونیجو نے مارشل لاء کو باقاعدہ اُٹھانے کا اعلان کر دیا۔ بیرونی دنیا کے دباؤ میں آ کر بی بی کی نظر بندی ختم کر دی گئی اور وہ لندن پہنچ

گئیں۔ واپس آ کر ان کی سیاسی حکمت عملی بدل چکی تھی۔ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ پاکستان کے سیاسی افق پر ظلم و جبر کے بادل جلد چھٹنے والے ہیں۔ بی بی کا لندن سے لاہور ایئرپورٹ پہنچنے پر فقید المثال استقبال کیا گیا اور مینار پاکستان پر انہوں نے ایک کامیاب جلسہ کیا۔ بی بی نے پاکستان آ کر زبردست سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا، اس میں انہیں کامیابی ملی اور بالآخر محترمہ بےنظیر بھٹو پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئیں۔ مصنفہ بھی آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس لوٹ آئیں۔

فرخندہ بخاری نے آپ بیتی میں ''سیاست سے علیحدگی'' کے باب میں تحریر کیا ہے کہ آٹھ سالہ جلاوطنی کے مصائب جھیل کر جب واپس آئیں تو ان کی بڑی عزت افزائی کی گئی۔ مصنفہ کو کئی سیاسی و سماجی تقریبات میں بطور خاص مدعو کیا جاتا رہا، ان کے انٹرویوز کو اخبارات میں نمایاں جگہ دی جاتی رہی لیکن ان کے گھریلو حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ مزید سیاسی معاملات میں خود کو نہ اُلجھائیں۔ بی بی نے گورنر ہاؤس لاہور میں فرخندہ بخاری کو خواتین کی وزارت دینے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن آپ کے شوہر شہرت بخاری اس بات پر رضامند نہ ہو سکے اور انہیں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس دوران بی بی نے پیغام بھجوایا کہ وہ عدالت سے اپنے کیس کا فیصلہ کروائیں۔ مصنفہ نے سلیم سہگل کو وکیل کر کے کیس کی پیروی کی اور جلد عدالت سے باعزت بری ہو گئیں۔

فرخندہ بخاری اپنے بڑے بھائی افتخار الحق کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ ان کے نزدیک ایک بھائی سے زیادہ ایک استاد، دوست اور راہنما تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے بی۔اے آنرز کیا اور ایئرفورس میں بطور سائفر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ طالب علمی کے دوران ہی ان کے خیالات کیمونسٹ پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے معاشرے میں امیر اور غریب کے فرق کو مٹا دینا چاہیے۔ ان دنوں آپ کا زیادہ میل ملاپ تنویر نقوی، وحید قاطمی، شورش کاشمیری، ظہیر کاشمیری اور چند دوسرے ساتھیوں سے رہا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد بھی جب وہ چھٹیوں پر گھر آتے تو ان کے دوست زیادہ تر ارسطو، کارل مارکس، لینن، پشکن اور اشتراکیت کے حوالے سے ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مصنفہ اپنے بھائی اور پھوپھو کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''پھوپھو جی اور بھائی جان افتخار جیسے لوگ اقلیت میں سہی مگر باضمیر انقلابی، معاشرے کی اصلاح کرنے کے لیے ہوتے ضرور ہیں۔ لوگوں میں مقبول ہوں یا نہ ہوں، بڑے مناصب پر فائز ہوں نہ ہوں، اور ہوں بھی کیسے کہ وہ تو اپنے ضمیر کے قیدی ہوتے ہیں ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتے، حق کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔''(۴۴)

کچھ عرصہ بعد فرخندہ بخاری کے بھائی افتخار الحق کو پنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لیا گیا کیونکہ انہوں نے خفیہ طور پر

پمفلٹ چھاپنے کی مشین لگا رکھی تھی۔ وہاں پر فوج کے چھاپے سے پہلے اطلاع دے دی گئی۔ لہٰذا آپ کے تمام ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن مشینیں برآمد کر لی گئی تھیں۔ فوج کی طرف سے مزید تحقیق کرنے پر یہ ثابت ہو گیا کہ پمفلٹ پر لکھائی افتخار الحق کی تھی۔ فوج کے قواعد کے مطابق ان کا کورٹ مارشل کیا گیا اور کئی کیمونسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا جن میں فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، میجر جنرل اکبر خاں، بریگیڈیئر صادق خان، کرنل ضیء، میجر حسن، بیگم اکبر خان اور ان کے کئی ساتھیوں پر بعد میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر سزائے موت سنا دی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد مصنفہ کے گھر والوں کو خبر ملی کہ افتخار الحق کے ساتھیوں نے انہیں جیل کی سلاخیں کاٹ کر آزاد کروا کر روپوش کر دیا تھا۔

آپ بیتی میں مصنفہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے لنکنز ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کر کے بمبئی میں پریکٹس کا آغاز کر دیا۔ ان دنوں اسمبلیوں میں جاگیرداروں، سیٹھ، نواب اور سرداروں کی اکثریت تھی لہٰذا قائداعظم کو وقتی طور پر سیاسی میدان میں انہی قسم کے اراکین اسمبلی کا سہارا مجبوراً لینا پڑا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے حصول کے لیے قائداعظم نے بھرپور مساعی سے کام کیا اور بنگال میں مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بن گئی۔ بعد میں پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات نے اپنے مفادات کی خاطر قائداعظم کی سیاسی حیثیت کو قبول کر لیا۔ مسلم لیگ کی کوششوں سے ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی الگ آزاد ریاست کے حق میں قرارداد کو منظور کر لیا گیا تھا۔ بعد میں وہ فیصلہ کن مرحلہ آیا جب ۱۹۴۶ء کی مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے تمام نشستیں جیت کر سیاسی میدان مار لیا تھا، اس وقت کانگریس اور انگریز حکومت کے لیے کوئی جواز باقی نہ رہا کہ وہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی ایک غیر نمائندہ جماعت کہہ کر نظرانداز کر سکیں۔

قائداعظم نے جاگیرداروں سے بارہا کہا کہ انہیں غریب پروری کرنی چاہیے اور ایک روایتی غریب دشمنی کی روش کو جلد ختم کر دینا چاہیے کہ غریب مزارعوں کے معاشی حالات بہتر ہو سکیں۔ انہوں نے یہ بھی باور کروایا کہ اگر غریبوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا تو وہ بزور اس نظام کو بدل کر رکھ دیں گے اور اگر وہ ظالمانہ جاگیرداری نظام کو ختم نہ کر سکے تو انہیں ایسا پاکستان منظور نہیں ہے۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر مسلم لیگ نے ۱۹۴۴ء میں اپنے انتخابی منشور میں اس بات کا واضح اعلان کر دیا کہ وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس انقلابی منشور کی بدولت نہ صرف نچلے طبقے کے عوام بلکہ کیمونسٹ یا تبدیلی پسندوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مصنفہ اس حوالے سے آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

> ''قائداعظم نے اس نظام زمینداری، وڈیرہ شاہی اور نوکر شاہی کو توڑنے کے لیے
> علامہ اقبال کی استعمال کردہ اصطلاح ''اسلامی سوشلزم'' کے نفاذ کی بات کی اور
> زوردار آواز میں مشرق و مغرب دونوں حصوں میں سرعام کی۔''(۲۵)

آپ بیتی میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ قائداعظم کے اسلامی سوشلزم کے اصول کو ان کی وفات کے بعد حکمرانوں نے

فراموش کیے رکھا۔ ان حکمرانوں میں لیاقت علی خان، فیروز خان نون، حسین شہید سہروردی، ایوب خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف شامل تھے۔ قائداعظم کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے جب نئی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کا منشور مرتب کیا تو چار بنیادی اصولوں میں ایک اصول ''اسلامی سوشلزم'' کو بطور خاص شامل کیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک انقلابی منشور تھا جس میں سر سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات نے ۱۹۷۵ء میں پیپلز پارٹی میں یہ کہہ کر شمولیت اختیار کر لی تھی کہ پیپلز پارٹی کا وہی منشور ہے جو کہ ۱۹۴۴ء میں کبھی مسلم لیگ کا منشور ہوا کرتا تھا۔

مصنفہ کے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو کا قصور یہ تھا کہ وہ سامراجی نظام کے خلاف تھے اور غریب عوام کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک خطے میں توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا کہ پاکستان ایٹمی قوت بن کر اُبھرے۔ دوسرا ان کا مقصد یہ تھا کہ ایٹمی توانائی کے استعمال سے پاکستان میں خوش حالی لائی جائے۔ دراصل اس دور میں سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ دنیا میں ایٹم بم تیار کر لیے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بھارت اور اسرائیل نے ایٹمی طاقت کے حصول کے لیے اپنی کوششوں کو تیز کر دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب اس صورت حال کا اندازہ لگایا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان ایٹمی قوت بن کر دکھائے گا چاہے قوم کو گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑ جائے۔ مغربی ممالک کی ایماء پر ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تاکہ پاکستان اور چین کو خبردار کر سکے۔

بھٹو نے ایٹمی طاقت کے حصول کے لیے ایٹمی سائنس کمیشن کی ازسرِ نو تشکیل کا آغاز کیا، بیرون ملک سے پاکستانی ایٹمی سائنس دانوں کو وطن واپس لایا گیا، ایٹمی سائنس دانوں نے اپنے ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دے کر بے لوث محنت کا آغاز کر دیا، عربوں نے وسائل فراہم کرنا شروع کر دیئے، بے شمار پاکستانی طلباء کو ایٹمی سائنس کی تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک بھجوایا گیا اور بالآخر بھٹو کے جذبے نے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا۔ بھٹو ایٹمی قوت کو حاصل کرنے میں اتنے کامیاب ہونے لگے کہ امریکہ نے اپنے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو دھمکی دینے کے لیے بھیجا کہ اگر آپ ایٹم بم کے حصول سے باز نہ آئے تو آپ کا انجام عبرت ناک ہوگا۔ بھٹو نے اس دھمکی کے جواب میں کہا کہ ایک آزاد ملک کے وزیراعظم سے اس طرح کا انداز تکلم انتہائی غیر شائستہ ہے اسے برداشت نہیں کیا جائے گا۔

آپ بیتی کے آخر میں فرخندہ بخاری موجودہ سماجی صورت حال کا موازنہ اپنے بچپن کے سماج سے کرتی ہیں تو زیادہ رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں بار بار مارشل لاء کی وجہ سے ملک کا سماجی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ آمریت پسندوں نے محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ملکی مفادات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بے حسی، بے روزگاری،

مہنگائی، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان، راہزنی، دہشت گردی، منشیات کا استعمال، روپے کی بے قدری، بوری بند لاشیں، معاشرتی بدامنی، لسانی امتیازات اور علاقائی تعصبات کا ایسا زہر گھول دیا گیا ہے کہ جانے اس کا اثر کب ختم ہوگا۔آپ بیتی کے دیباچہ میں شاہد ندیم فرخندہ بخاری کی سرگزشت کے بارے میں رقم طراز ہیں

> ''فرخندہ کی خودنوشت ''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' ایک غیر معمولی دور کی غیر معمولی کہانی ہے جو بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھاتی ہے اور ۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں اُبھرنے والی جمہوری لہر کے محرکات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔''(۲۶)

حوالہ جات

۱۔ اجیت کور، خانہ بدوش، نئی دلّی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص:۱۰۵

۲۔ امرتا پریتم، رسیدی ٹکٹ، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص:۲۷

۳۔ بیگم انیس قدوائی، آزادی کی چھاؤں میں، نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۸۰ء، ص:۲۶

۴۔ مشفق خواجہ، مشمولہ، ہم سفر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء، ص:۱۵

۵۔ عذرا عباس، میرا بچپن، کراچی: ایجوکیشنل پریس، پاکستان چوک، ۱۹۹۴ء، ص:۱۶

۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص:۲۱

۷۔ ایضاً، ص:۲۱

۸۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳ء، ص:۹۶

۹۔ ایضاً، ص:۱۰۰

۱۰۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی صدی، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۲۸۹

۱۱۔ کشور ناہید، شناسائیاں، رسوائیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۷

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۹۸۔۹۹

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۶۴

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۷۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۷۹

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۸۰

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۸۱

۲۰۔ ایضاً، ص:۱۸۱۔۱۸۲

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۸۸

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۹۳

۲۳۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۱۵۶

۲۴۔ ایضاً، ص:۱۸۰

۲۵۔ ایضاً، ص:۲۰۶

۲۶۔ ایضاً، ص:۷

محاکمہ

محاکمہ

آپ بیتی ایک تخلیقی صنف ادب ہے۔جس کے ذریعے سے آپ بیتی لکھنے والے کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات، مصنف کی مکمل نفسیات، تاریخی، سیاسی و سماجی صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔آپ بیتی اظہار ذات کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ماضی سے وابستہ واقعات، حادثات، مشاہدات، تجربات اور احساسات کو یاد کرتا رہتا ہے۔اس کا حافظہ بہت سے حالات و واقعات کو محفوظ رکھتا ہے۔انہیں تلخ و شیریں یادوں میں سے کچھ ایسی ہوتی ہیں جو اس کے ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ان یادوں کو انسان زندگی کے کسی مرحلے پر بھی فراموش نہیں کر سکتا۔بعض شخصیات اپنی یادوں کو ضبط تحریر میں لا کر آئندہ نسلوں کے لیے یادگار چھوڑ جاتے ہیں جسے ہم آپ بیتی کہتے ہیں۔

قدرت نے انسانی سرشت میں ایک اہم پہلو یعنی انکشاف ذات کے رجحان کو ہمیشہ غالب رکھا ہے اور روز اول سے ہی انسان اپنی شخصیت کے پوشیدہ اوصاف کو اجاگر کرنے کا خواہش مند رہا ہے۔اپنی ذات کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی شخصیت کو اپنی زندگی میں محسوس کرنا اور اسے اپنے ذاتی تجربات میں شریک کرنے کا ذوق ہمیشہ سے اس میں موجود رہا ہے۔اس لیے آپ بیتی لکھنے کا رواج زمانہ قدیم سے لے کر آج تک بھرپور انداز میں جاری و ساری ہے۔

اردو آپ بیتی ایک معروف اور معتبر صنف نثر ہے جو کسی مصنف کے بارے میں معلومات کا اوّلین اور کسی حد تک مستند ترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایک جانب مصنف کی ذات سے جڑے واقعات اور پھر ان واقعات سے پیدا ہونے والا پس منظر بیان ہوتا ہے تو دوسری طرف آپ بیتی مصنف کے عہد کے تمام تر حالات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

دنیا میں قدیم ترین تاریخ کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات اور ذاتی تجربات کو بیان کرنا ہمیشہ ہی سے آپ بیتی نگاروں کی دل چسپی کا باعث رہا ہے۔عالمی سطح پر معروف شخصیات نے اپنی آپ بیتیوں میں دنیا کے سیاسی و سماجی عوامل کا جب تذکرہ کیا تو یہ فن افسانوی حیثیت اختیار کرتا گیا۔اردو ادب میں نامور ادیبوں کے علاوہ سیاست دانوں، صحافیوں اور مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی اپنے ذاتی حالات کو بیان کرنے کے لیے آپ بیتیاں تحریر کی ہیں۔

آپ بیتی لکھنے والا اپنے اوپر بیتنے والے واقعات پیش کرتا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کے تہذیبی شعور کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے، کیونکہ آپ بیتی نگار نہ صرف اپنی داخلی کیفیت کو بیان کرتا ہے بلکہ خارج پر بھی نظر رکھتا ہے۔کسی بھی معروف شخص کا اپنی شخصیت کو تحریری انداز میں اس طرح منظر عام پر لانا کہ وہ اپنی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رکھے بلکہ اپنے محاسن اور معائب کو دوسروں کے سامنے بے دھڑک بیان کر دے آپ بیتی کے ذیل میں آتا ہے۔

تخلیق انسان سے ہی کسی فرد میں اپنے وجود کے احساس کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات نے پیدا ہونا شروع کر دیا تھا۔ اپنی زندگی کے مقاصد کو جان لینے کی خواہش نے ہمیشہ انسان کو تجسس میں ہی ڈالے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے نفسیاتی تجربات اور مشاہدات سے مختلف قسم کی نئی نئی چیزیں سیکھتا اور دوسروں کو سکھاتا رہتا ہے۔

انسان اپنی زندگی کے خوش گوار اور تلخ تجربات سے افراد معاشرہ کو آگاہ کرنے کے لیے بھی عموماً تیار رہتا ہے۔ اس فطرتی امر کے تحت ہر دور میں انسان اپنی ذات کے اظہار کو مختلف نوعیتوں میں دوسرے انسانوں کو دکھاتا رہتا ہے۔ بہت سی اہل فن شخصیات نے اپنے کارہائے نمایاں کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ادبی اصناف کا استعمال کیا ہے۔ اردو کی اہم اصناف جن میں آپ بیتی کے مختلف عناصر کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں تذکرے، مثنویاں، روزنامچے، سفرنامے، خطوط، افسانے، انٹرویو اور رپورتاژ شامل ہیں۔

مغربی ادب میں آپ بیتی کی روایت کا تعلق قدیم عیسائی مذہبی تعلیمات سے ملتا ہے کیونکہ مذہب کی بہت سی کتب میں اہم شخصیات کا احوال موجود ہے۔ مغربی ادب میں عموماً آپ بیتیاں اہم شخصیات کے اعترافات کی شکل میں موجود ہیں۔ مغربی ادب میں سولہویں صدی عیسوی کو آپ بیتی کے آغاز کی صدی قرار دیا جاتا ہے۔

اُردو ادب میں آپ بیتی کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں باقاعدہ شروع ہوا۔ اگرچہ آپ بیتی کے کچھ آثار تذکرہ جات، تاریخ کی کتب، اولیاء وصوفیاء کرام کے ملفوظات، روزنامچوں اور مکتوبات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اُردو ادب میں آپ بیتیاں لکھنے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اردو میں باقاعدہ سب سے پہلی آپ بیتی ''تواریخِ عجیب'' ہے۔ جس کو ''کالا پانی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو کی آغاز کی آپ بیتیوں میں ''حیات نساخ''، ''قید یاغستان''، ''داستانِ غدر''، ''آپ بیتی''، ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی''، ''کارنامہ سروری''، ''میری کہانی میری زبانی''، ''ایک معلم کی کہانی''، ''میرا افسانہ''، ''مابدولت''، ''قید فرنگ'' اور ''سرگزشت'' قابل ذکر ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد کی آپ بیتیوں کو ''اُردو کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال: تحقیق و تجزیہ (۲۰۰۰ء تک)'' کے عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جگن ناتھ آزاد کی ''میرے گزشتہ شب و روز''، ذوالفقار علی بخاری کی ''سرگزشت''، کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد''، جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ''یادوں کی برات''، گوپال متل کی ''لاہور کا جو ذکر کیا''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتی ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، کلیم الدین احمد کی آپ بیتی ''اپنی تلاش میں''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، قدرت اللہ شہاب کی داستان حیات ''شہاب نامہ''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی

جستجو" اور اختر الایمان کی "اس آباد خرابے میں" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

عصر حاضر میں آپ بیتیوں کی ضرورت اور اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ انسان اپنی زندگی کے بہت سے واقعات کو اکثر دہراتا رہتا ہے کبھی دوسروں کو نصیحت کرنے کے لیے اور کبھی کبھی اپنی منزل کو تلاش کرنے کے لیے ماضی کے دھندلکوں کی طرف نظر اُٹھاتا ہے، اس طرح وہ ان غلطیوں اور کوتاہیوں کو دہرانے سے مکمل طور پر گریز کرتا ہے۔ جن کا خمیازہ وہ ایک مرتبہ پہلے بھگت چکا ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی کی اہم اُردو آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ کے اس باب میں اکیسویں صدی کی جن چند اہم آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں میاں منظور احمد وٹو کی "جرمِ سیاست"، ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی "تمنا بے تاب"، جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال کی آپ بیتی "اپنا گریبان چاک"، مہدی علی صدیقی کی "بلاکم وکاست"، ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی "نشانِ جگر سوختہ"، سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی "چاہِ یوسف سے صدا"، حبیب جالب کی داستانِ حیات "جالب بیتی"، جاوید ہاشمی کی آپ بیتی "ہاں! میں باغی ہوں"، شکیل بدایونی کی "میری زندگی" اور ڈاکٹر رشید امجد کی "عاشقی صبر طلب" شامل ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اصناف ادب پر مرد مصنّفین کا غلبہ رہا ہے اس لیے خواتین کو اظہار ذات کے مواقع شاید بہت تاخیر سے ملے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کی تخلیقات کی تعداد خاصی کم ہے۔ جہاں تک خواتین کی آپ بیتیوں کا سوال ہے تو اس کی روایت اُردو ادب میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔ خواتین کی آپ بیتیوں کے مطالعہ سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر اپنی زندگی، گھریلو حالات، اپنے مزاج اور اپنی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن سے ان کا واسطہ رہا تھا۔

اردو ادب میں خواتین کی نمائندہ آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی صورت حال پر تحقیق کی گئی ہے۔ خواتین کی اہم آپ بیتیوں میں امرتا پریتم کی آپ بیتی "رسیدی ٹکٹ"، قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی "کارِ جہاں دراز ہے"، بیگم انیس قدوائی کی آپ بیتی "آزادی کی چھاؤں میں"، حمیدہ اختر حسین کی "ہم سفر"، عصمت چغتائی کی آپ بیتی "کاغذی ہے پیرہن"، عذرا عباس کی آپ بیتی "میرا بچپن"، کشور ناہید کی آپ بیتیاں "بری عورت کی کتھا"، ادا جعفری کی داستانِ حیات "جو رہی سو بے خبری رہی"، کشور ناہید کی آپ بیتی "شناسائیاں رسوائیاں" اور فرخندہ بخاری کی "یہ بازی عشق کی بازی ہے" شامل ہیں۔

سفارشات

آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی صورتِ حال کی کھوج کے دوران چند اہم موضوعات میری نظر سے ایسے گزرے ہیں جن پر تحقیقی نقطہ نگاہ سے قلم اُٹھایا جا سکتا ہے، چند ایک موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ اُردو آپ بیتیوں کے ادبی عناصر۔

۲۔ اُردو آپ بیتیوں میں اسلوب نگاری۔

۳۔ اُردو آپ بیتیوں میں موجود اغلاط کے تصحیح نامے مرتب کرنا۔

۴۔ اُردو آپ بیتیوں میں خاکہ نگاری کی روایت۔

۵۔ اُردو آپ بیتیوں میں شخصی خاکے۔

کتابیات

کتابیات

بنیادی مآخذ

۱۔ آزاد، ابوالکلام، تذکرہ، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۰ء

۲۔ آزاد، ابوالکلام، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، لاہور: مکتبہ خلیل، س ن

۳۔ آزاد، ابوالکلام، خودنوشت، میرپور آزاد کشمیر: ارشد بک سیلرز، ۱۹۹۹ء

۴۔ آزاد، جگن ناتھ، میرے روز و شب، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۵ء

۵۔ احسان دانش، جہانِ دانش، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء

۶۔ احسان دانش، جہانِ دگر، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء

۷۔ احمد امین، ڈاکٹر، سرگزشت حیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۹ء

۸۔ احمد بشیر، دل بھٹکے گا، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۱۹۹۱ء

۹۔ احمد شجاع، حکیم، خون بہا، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۱۰۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گردِ راہ، کراچی: مکتبہ افکار، ۱۹۸۴ء

۱۱۔ اختر الایمان، اس آباد خرابے میں، نئی دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء

۱۲۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، کراچی: دانیال پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء

۱۳۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، میری دُنیا، الہ آباد: کارواں پبلشرز، ۱۹۶۵ء

۱۴۔ افضل حق، میرا افسانہ، لاہور: تاج کمپنی، س ن

۱۵۔ الطاف گوہر، گوہر گزشت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۱۶۔ امرتا پریتم، رسیدی ٹکٹ، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۷ء

۱۷۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۱۸۔ انعام الحق، ایام رفتہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۱۹۔ انیس قدوائی، آزادی کی چھاؤں میں، دہلی: قومی ایکتا ٹرسٹ، ۱۹۷۴ء

۲۰۔ اے پی جے عبدالکلام، پرواز، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء

۲۱۔ بخاری، ذوالفقار علی، سرگزشت، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۲۲۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر، میری داستانِ حیات، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء

۲۳۔ پرویز مشرف، جنرل، سب سے پہلے پاکستان، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۲۰۰۶ء

۲۴۔ تجمل حسین، جو بچے سنگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۲۵۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریبان چاک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۲۶۔ جاوید ہاشمی، تختہ دار کے سائے تلے، لاہور: جہانگیر بکس، ۲۰۰۷ء

۲۷۔ جاوید ہاشمی، ہاں! میں باغی ہوں، لاہور ساگر پبلشرز، ۲۰۱۳ء

۲۸۔ جلیل قدوائی، حیات مستعار، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۷ء

۲۹۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور: مکتبہ شعر و ادب چودھری اکیڈمی سمن آباد، ۱۹۷۵ء

۳۰۔ حبیب جالب، جالب بیتی، لاہور: طاہر سنز پبلشرز، ۲۰۱۳ء

۳۱۔ حسرت موہانی، قید فرنگ، کراچی: شارق پبلی کیشنز، س ن

۳۲۔ حسن نظامی، خواجہ، آپ بیتی، دہلی: دِلّی پرنٹنگ ورکس، طبع دوم، ۱۹۲۲ء

۳۳۔ حمید نسیم، ناممکن کی جستجو، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۸ء

۳۴۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، ہم سفر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء

۳۵۔ خواجہ غلام السیدین، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں، نئی دہلی: سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر، ۱۹۷۴ء

۳۶۔ رحیم گل، داستان چھوڑ آئے، لاہور: علی برادرز، ۱۹۷۷ء

۳۷۔ رشک عبدالقدیر، یادوں کے چراغ، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۹ء

۳۸۔ رشید امجد، تمنا بے تاب، راولپنڈی، حرف اکادمی، ۲۰۰۱ء

۳۹۔ رشید امجد، عاشقی صبر طلب، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

۴۰۔ رضا علی، سر، اعمال نامہ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۵ء

۴۱۔ رفیق چودھری، میری دنیا، کراچی: پنجاب رنگ پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۴۲۔ سبط حسن، شہر نگاراں، لاہور: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۸ء

۴۳۔ سحاب قزلباش، میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء

۴۴۔ سحر، کنور مہندر سنگھ بیدی، یادوں کا جشن، دہلی: جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی، ۱۹۸۶ء

۴۵۔ سردار محمد چودھری، جہانِ حیرت، لاہور: ایلیس پبلشرز، ۲۰۰۳ء

۴۶۔ سرور، آل احمد، خواب باقی ہیں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء

۴۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

۴۸۔ شاد عظیم آبادی، شاد کی کہانی شاد کی زبانی، علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۵۸ء

۴۹۔ شورش کاشمیری، بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل، لاہور: مطبوعات چٹان، ۱۹۹۴ء

۵۰۔ شورش کاشمیری، پس دیوارِ زنداں، لاہور: مطبوعات چٹان، ۱۹۹۴ء

۵۱۔ شوکت تھانوی، مابدولت، لاہور: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۴۹ء

۵۲۔ شہر بانو بیگم، بیتی کہانی (مرتبہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل)، حیدرآباد: ادارہ علمی، ۱۹۹۵ء

۵۳۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۵۴۔ صدیق سالک، کرنل، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور: مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۸۶ء

۵۵۔ صدیقی، رشید احمد، ڈاکٹر، آشفتہ بیانی میری، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء

۵۶۔ صدیقی، محمد اکرم، قید یاغستان، لاہور: محمد عزیز الرحمان، ۱۹۷۰ء

۵۷۔ صدیقی، مہدی علی، بلا کم و کاست، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء

۵۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، یادِ عہد رفتہ، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۸ء

۵۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، رو میں ہے رخش عمر، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

۶۰۔ عبدالغفور نساخ، خودنوشت حیات نساخ، کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۸۶ء

۶۱۔ عبدالمجید سالک، سرگزشت، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۳ء

۶۲۔ عذرا عباس، میرا بچپن، کراچی: جدید کلاسک پبلشرز، ۱۹۹۴ء

۶۳۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، نئی دہلی: پبلی کیشنز، ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، ۱۹۹۴ء

۶۴۔ غلام سرور، کرنل، آئینہ ایام، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۱ء

۶۵۔ فرحت اللہ بیگ، میری داستان، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء

۶۶۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۶۷۔ فیض احمد فیض، مہ و سال آشنائی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۰ء

۶۸۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۶۹۔ قریشی، سمیع اللہ، ڈاکٹر، ایک دور کی کہانی، کراچی: پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹرپرائزز، ۲۰۰۶ء

۷۰۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، لاہور: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۷ء
۷۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء
۷۲۔ کشور ناہید، شناسائیاں، رسوائیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۷۳۔ کلیم الدین احمد، اپنی تلاش میں، گیا: کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۵ء
۷۴۔ محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
۷۵۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء
۷۶۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۵ء
۷۷۔ مولانا عبدالماجد، دریابادی، آپ بیتی، لکھنؤ: مکتبہ فردوس، ۱۹۷۸ء
۷۸۔ میاں منظور احمد وٹو، جرم سیاست، لاہور: احمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء
۷۹۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۶ء
۸۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء
۸۱۔ ہوش بلگرامی، مشاہدات، حیدر آباد: انتخاب پریس، ۱۹۵۵ء
۸۲۔ یوسف حسین خاں، یادوں کی دنیا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء
۸۳۔ یوسف رضا گیلانی، چاہِ یوسف سے صدا، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۶ء
۸۴۔ یوسفی، مشتاق احمد، زرگزشت، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۳ء

ثانوی مآخذ

۱۔ اجیت کور، خانہ بدوش، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱ء
۲۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت سوم، لاہور: نیاز زمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
۳۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادی احوال و آثار، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۳ء
۴۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، کراچی: شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء
۵۔ روسو، ژاں ژاک، اعترافات، مترجم: امجد علی بھٹی، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء
۶۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، اُردو میں سوانح نگاری، کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء
۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اُردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۸۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۷ء

۹۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء

۱۰۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۱۱۔ قدرت اللہ شہزاد، آپ بیتی کے توانا لہجے، بہاولپور: ستلج پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۱۲۔ محمد اسماعیل صدیقی، بریگیڈیئر، کرنل محمد خان، فن اور شخصیت، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

۱۳۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء

۱۴۔ نظیر صدیقی، جان پہچان، لاہور: کاروانِ ادب، ۱۹۹۱ء

۱۵۔ وہاج الدین، ڈاکٹر، اردو خودنوشت، فن و تجزیہ، نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۹ء

۱۶۔ ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

رسائل و جرائد

۱۔ آج، سہ ماہی کراچی: شمارہ نمبر ۵۲، فروری ۲۰۰۵ء

۲۔ افکار، ماہنامہ، شمارہ نمبر ۱۹۴، کراچی: مئی ۱۹۸۶ء

۳۔ الزبیر، بہاولپور، شمارہ نمبر ۷ آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء

۴۔ پرواز، برطانیہ، ۱۱ فروری، ۲۰۰۸ء

۵۔ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۱۲۹، ۲۰۰۲ء

۶۔ راوی، جلد ۸۹، واحد شمارہ، ۲۰۰۲ء

۷۔ علامت، لاہور، جلد ۹، جولائی ۱۹۹۸ء

۸۔ نقوش، لاہور، جلد اوّل، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء

Websites

1- https://Rekhta.org/ebooks/urdu
2- Stallionsarticle.blogspot.com
3- www.deeneislam.com
4- www.history.pk.com
5- wikipedia.org/wiki/Hussain-ahmad-madni
6- www.Islamibookslibrary.wordpress.com
7- wikipedia.org/wiki/Shaheed-e-Ganj-Mosque
8- www.Indianfreedomfighters.com
9- wikipedia.org/wiki/Abul-Kalam_Azad
10- wikipedia.org/wiki/molana-hasrat-mohani
11- https://ChaudhryAfzalhaq.com/literaryworks
12- wikipedia.org/wiki/Rawalpindi-conspiracy
13- www.urdumania.net/martials-in-Pakistan
14- wikipedia.org/wiki/coups-in-Pakistan-1977
15- wikipedia.org/wiki/Faiz-ahmad-Faiz
16- wikipedia.org/wiki/Yousaf-Raza-Gillani
17- wikipedia.org/wiki/Javed-hashmi